چراغِ راہ

خواجہ عبدالحکیم انصاری رحمتہ اللہ علیہ

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا تو چراغ راہ کے جل گئے

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماعات پر پڑھے گئے خطبات کا مجموعہ

خواجہ عبدالحکیم انصاری رحمۃ اللہ علیہ
(بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ)

ناشر
مکتبہ توحیدیہ، مرکز تعمیرِ ملت، وحید کالونی کوٹ شاہاں، گوجرانوالہ
0344-9000042
0324-6075313

نام کتاب	:	چراغ راہ
مصنف	:	خواجہ عبدالحکیم انصاری رحمۃ اللہ علیہ
صفحات	:	256
قیمت	:	300
تعداد	:	500

ملنے کا پتہ

مکتبہ توحیدیہ، مرکز تعمیرِ ملت، وحید کالونی کوٹ شاہاں، گوجرانوالہ

0344-9000042
0324-6075313
www.tauheediyah.com

فہرست مضامین

پیش لفظ

انسان اپنی آفرینش سے ہی خالق حقیقی کی تلاش میں ہے۔ یہ جستجو اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ازل سے لاکھوں فلسفی، سائنس دان، حکیم، راہب اسی ابدی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں۔ اسی جستجو نے مختلف مذاہب کا روپ دھارا اور خدا تک پہنچنے کے راستے متعین کیے۔ لیکن انسانیت کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تقریباً سب مذاہب اور مسالک میں خدا رسی کے لیے ترک دنیا اور ترک لذائذ کو لازمی قرار دیا گیا۔ چنانچہ معدودے چند لوگوں کو بلا کی جفاکشی اور طویل صعوبتوں کے بعد خدا کا عرفان حاصل ہوتا رہا اور وہ بھی جزوی طور پر۔

جب انسانیت سن بلوغ کو پہنچی اور خاتم الانبیاء سرور کائنات جناب رسول اکرم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے دنیا و دین کو ایک دوسرے میں یوں سمویا کہ ایک کے بغیر دوسرے کی تحصیل نہ صرف غیر مستحسن قرار پائی بلکہ مشکل بھی ہوگئی۔ حضور ﷺ نے زندگی کے لیے ایسے اصول وضع کیے اور خدا شناسی کے ایسے طریقے بتائے جو وقتی ہیں نہ مقامی، وہ زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہیں۔

ان میں ایک طرف معاشرے کو غیر صحت مند رجحانات اور تخریب پسند قوتوں سے پاک کرنے اور اس میں صحت، توانائی، توازن اور پاکیزگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے تو دوسری طرف خدا تک رسائی میں آسانی بھی۔ لیکن امتداد زمانہ سے حضور ﷺ کی یہ زندگی بخش تعلیم ماند پڑتی گئی اور مسلمان صراط مستقیم سے ہٹ کر ایسے مشاغل میں الجھ گئے جس سے وہ توحید سے بھی دور ہو گئے اور دنیاوی جاہ و حشمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ حالات کی مقتضیات کے مطابق وقتاً فوقتاً اولیاء اللہ، اصفیا اور علمائے دین نے توحید کی شمع روشن کی اور لوگوں کو عظمت و عزت اور خدا رسی کا راستہ دکھایا، لیکن بعد میں ان مقتدر ہستیوں کی تعلیم بھی عجمی تصورات اور غیر اسلامی اعتقادات کی نذر ہو گئی۔ توحید جو زندگی کا ایک بنیادی زندہ اور حرکاتی اصول ہے مدرسوں میں فقط مسئلہ علم کلام ہو کر رہ گیا اور خانقاہوں میں ویدانت اور سوفسطائی نظریات سے ملوث۔

روحانیت کے متعدد سلسلے جن کا مقصد وحید ہی توحید کی شمع روشن رکھنا اور خدا تک پہنچنے کے راستہ کو ہر آلائش سے پاک و صاف کرنا تھا خود شرک کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ اب تقریباً سبھی سلسلوں میں توحید پر زور ہے نہ سیرت و کردار کی تعمیر پر۔ تقریباً سبھی میں اپنے پیروں کی پرستش کی جاتی

ہے ۔انہیں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں ۔انہیں کا تصور قائم کرنے کی تلقین کی جاتی ہے ۔موت اور حیات، بیماری اور صحت، افلاس اور رزق، ذلت اور عزت، ناکامی اور کامیابی سب انہیں کے اختیار میں سمجھی جاتی ہے ۔تعمیر کردار، اخلاق کی درستی، فکر و نظر کی پاکیزگی، باہمی معاملات کی صحت کی طرف نہ توجہ دی جاتی ہے، نہ انہیں سلوک کے مراحل طے کرنے میں کوئی خاص وقعت حاصل ہے ۔زیادہ زور وظائف اور اوراد پر ہوتا ہے یا پھر پیر کی خدمت اور اس کا تصور باندھنے پر ۔وہ تعلیم اور اخلاق حسنہ جو ان عالی سلسلوں کے جلیل القدر ربانیوں کا طرۂ امتیاز تھا، اب تقریباً ناپید ہے ۔ کچھ اولیاء اللہ اب بھی صحیح سلامت روایات پر قائم ہیں لیکن وہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل ہیں ۔وہ اپنی روحانی رفعت و ترقی میں مگن ہیں ۔ملت پر جو کچھ آج کل بیت رہی ہے اس سے وہ قطعی بے نیاز ہیں ۔لیکن بقول علامہ اقبالؒ

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لا ہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مسلمان ساری دنیا میں عالم سکرات میں ہیں ۔کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے ۔کسی عالم دین اور کسی معروف روحانی پیشوا کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ قوم کے درد کا مداوا کرے ۔اس میں نئی زندگی کی روح پھونکے، اس کا دل پھر سے توحید کی لو سے روشن کرے ۔اسے خالق حقیقی تک پہنچنے کا راستہ بتلائے یا اسے دنیا میں رہنے کا قرینہ ہی سکھائے ۔

''ملت کو آج ایسے بزرگوں کی ہرگز ضرورت نہیں جو تعویذ گنڈوں اور دم درود سے کچھ مریضوں کو تندرست کر دیں یا چند غریب ان کی دعا سے امیر کبیر بن جائیں یا کچھ مقدمے جیت جائیں ٗ یا چند بے اولادوں کے اولاد پیدا ہو جائے، یا کچھ کفار و مشرکین مسلمان ہو کر ملت کی تعداد میں بے کار لوگوں کا اضافہ کریں ۔آج کل تو ضرورت ایسے اولیاء کی ہے جو فاسق و فاجر مسلمان کو سچا مسلمان اور سچے مسلمان کو پکا مومن اور موحد بنا سکیں ٗ جو اپنی تعلیم و توجہ سے مسلمانوں میں ایسی فراست و بصیرت پیدا کر سکیں کہ وہ تمام تفرقے اور اختلافات مٹا کر ایک جان اور ایک قالب کی طرح مربوط و متحد ہو جائیں ٗ حق و باطل میں تمیز پیدا کر سکیں ٗ سستی اور کاہلی چھوڑ کر کام کرنا اور کام کرتے رہنا سیکھیں ٗ اللہ اور رسول ﷺ کی سچی محبت کا جنون ان کے لیے سرمایہ دانش ہو ۔وہ بقائے ملت کے لیے جان و مال قربان کرنا اپنی زندگی کا مقصد جانیں اور ہر طرف سے اپنا منہ موڑ کر صرف

اللہ کی طرف کرلیں۔''

محولہ بالا ارشاد زیرِ نظر خطبات کے مصنف خواجہ عبدالحکیم انصاری دام برکاتہم کا ہے جنہوں نے توفیق ایزدی سے تصوف کو ہر عجمی آلائش اور آلودگی سے پاک وصاف کر کے اسے شرع محمدی ﷺ کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک نئے سلسلہ تصوف ''توحیدیہ'' کی بنا کی ہے۔ یہ سلسلہ توحیدیہ کیا ہے؟ ''فقط اللہ تعالیٰ کا ہو کے رہنا''۔ اس کا مقصد خالص دین کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے یہ نہ تو دنیا سے فرار سکھلاتا ہے نہ اس سے محبت' اس میں دین و دنیا دونوں کی درستی کا اہتمام ہے۔ اس میں نہ صرف روحانی صحت' پاکیزگی اور توانائی پر زور ہے بلکہ جسمانی اور ذہنی صحت' پاکیزگی اور توانائی پر بھی۔ اس میں دین کی تحصیل و تکمیل دنیا کی تحصیل و تکمیل سے الگ نہیں۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے اسلامی عبادات پر صحیح عمل سے خدا کا عرفان عطا کرتا ہے۔ یہ سلسلہ اپنے ماحول اور گردو پیش کو پاک و منزہ اور صحت مند رکھنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ شخصیت کی تعمیر' باہمی معاملات کی درستی اور معاشرے کی ترقی اس کے حلقہ عمل میں اولیت رکھتے ہیں اور ایسی ہی طریقت کی آج دنیائے اسلام کو ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن بہ اعماق حیات

سلسلہ توحیدیہ میں نہ پیر کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے نہ اسے اچھائی یا برائی کا مختار ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں نہ ریاضتیں ہیں' نہ چلہ کشی' نہ لذائذ دنیا سے نفرت' اکل حلال اور سیرت و کردار کی تعمیر پر البتہ بہت زور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ سے محبت پیدا کرنے کے لیے چند واجبات پر عمل بھی۔ اس مقصد کے لیے روزانہ چند منٹ وقف کرنے پڑتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ پرانے وقتوں میں سلوک کی جن منازل کو طے کرنے میں سالہا سال کی مشقت اور ریاضت کرنی پڑتی تھی وہی منازل اس سلسلہ میں تھوڑی سی یکسوئی اور محنت سے چند مہینوں میں طے ہو جاتی ہیں۔

جناب خواجہ عبدالحکیم انصاری دامت برکاتہم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان سیئات یعنی برے اعمال سے نفرت کرنے لگتا ہے اور حسنات یعنی نیک اعمال کی طرف از خود راغب ہو جاتا ہے۔ جوں جوں نیکی کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے روحانی یسر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ دل میں کشادگی اور طبیعت میں لطافت پیدا ہوتی جاتی ہے' نماز میں مزہ آنے لگتا ہے' غصہ

نفرت اور سیئات پر مکمل قابو ہو جاتا ہے اور دل میں اللہ کی محبت کی جوت جلنے لگتی ہے ۔ آہستہ آہستہ وہ ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے ۔ اس کی زندگی، قربانی اور موت صرف اسی کی خاطر ہو کر رہ جاتی ہے ۔

''چراغِ راہ'' حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو وہ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماعات میں ارشاد فرماتے رہے ہیں ۔ مختلف مقامات پر دیئے گئے ان خطبات میں تسلسل کا خاص التزام رکھا گیا ہے جو سالکان راہِ طریقت کے لیے بیش بہا خزانہ بھی ہے اور ملت کے لیے درس حیات بھی ۔ اس کے سرسری مطالعہ سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تصوف و معرفت کے بارے میں حضرت قبلہ انصاریؒ کے افکار کیا ہیں اور وہ کس قسم کے معاشرے کو وجود میں لانے کی سعی کر رہے ہیں ۔ ان کی تعلیمات کا نچوڑ تو ان کی معرکہ آرا تصنیف ''تعمیر ملت'' میں ملتا ہے لیکن زیر نظر مجموعہ خطبات میں حضرت ممدوح نے راہ سلوک میں پیش آنے والے نشیب و فراز کو جس حکیمانہ انداز میں پیش فرمایا ہے اس کی مثال کم ملتی ہے ۔ جہاں سالک قرب و عرفان خداوندی حاصل کرنے کے لیے اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کر کے اپنا گوہر مقصود پا سکتا ہے وہاں ایک عام قاری بھی اپنی دنیا و دین سنوارنے کے لیے یقیناً اتنی بصیرت حاصل کر سکتا ہے جو ایک سچے مسلمان کے لیے نجات کا باعث ہو ۔ خطبات کا اسلوب سادہ اور عبارت بہت سلیس ہے ۔ مصنف کے ہر لفظ سے سوز دروں، امعان نظر، وسعت فکر اور پختگی جھلکتی ہے ان کے لہجہ میں خلوص و محبت کی خوشبو ہے بقول حافظؒ

زانفاس خوشش بوئے کسے می آید

قاری اس سوز اور درد کو خود محسوس کرے گا جس سوز اور درد نے جناب انصاری صاحب قبلہ کو ''سلسلہ توحیدیہ'' قائم کرنے پر مجبور کیا ہے اور نیا سلسلہ قائم کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ۔

''تانہ بخشد خدائے بخشندہ''

خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ ''سلسلہ عالیہ توحیدیہ'' کو تکوین دین اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنائے ۔ آمین

خادم الفقراء
محمد قاسم توحیدی
لاہور، یکم فروری 1971ء

خطبہ......1

13-4-1962

کو چوتھے سالانہ اجتماع پر بمقام نوشہرہ ورکاں ضلع گوجرانوالہ میں خطاب فرمایا۔

نحمدہ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ..........السلام علیکم

اللہ کا بڑا کرم اور احسان ہے کہ آج ہم اپنے حلقہ کے چوتھے سالانہ اجتماع میں ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے میں تمام شرکت کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو دور دراز مقامات سے تکلیف اٹھا کر محض اللہ کے واسطے یہاں تشریف لائے ہیں اور اس کے بعد خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں عطا فرمائے اور جو لوگ شرکت نہیں کر سکے ان کو بھی اپنے فضل و کرم اور نوازش سے محروم نہ رکھے۔ آمین

تمام جماعتیں جو کوئی بڑا کام کرنا چاہتی ہیں ایسے سالانہ اجتماعات ضرور منعقد کیا کرتی ہیں۔ لیکن فائدہ صرف انہی جماعتوں کو پہنچتا ہے جن کے ارکان ایسے اجتماعات میں منظور ہونے والی تجاویز پر جوش' استقلال اور خلوص سے عمل کرتے ہیں۔ میں بھی آپ لوگوں سے یہی امید رکھتا ہوں کہ آپ لوگ اس اجتماع میں تماشہ دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ دینی اور دنیوی فوائد حاصل کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ دینی اور دنیوی فوائد حاصل کرنے اور اعلیٰ درجے کا مومن اور بزرگ بننے کے لیے جتنی باتیں ضروری ہیں وہ میں پہلے ہی ''تعمیر ملت'' اور ''طریقت توحیدیہ'' میں واضح طور پر لکھ چکا ہوں اور اس کے علاوہ سینکڑوں مرتبہ تقریروں اور نجی تحریروں میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ آج میں جو کچھ بیان کروں گا اس میں بھی زیادہ تر وہی باتیں ہوں گی۔

اس تکرار سے آپ کو اکتانا اور بددل نہیں ہونا چاہیے اور یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ جن باتوں کو خاص طور سے توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے ان کو جتنی مرتبہ بھی بیان کیا جائے کم ہے۔ خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور جتنے اوامر و نواہی اور دوسری ضروری باتیں ہیں ان کو سینکڑوں مرتبہ دہرایا ہے۔ مثلاً نماز پڑھنے کا حکم تقریباً سات سو مرتبہ دیا گیا اور اتنی ہی مرتبہ قدرت کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آج میں کچھ نئی باتیں بھی بیان کروں گا جو شاید آپ کی دلچسپی کا موجب ہوں۔ یہ میری زندگی اور سلوک و تصوف میں اپنے

ذاتی تجربوں کا کچھ بیان ہے اور میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ آپ کو میرے تجربوں سے فائدہ ہو اور آپ یہ سمجھ سکیں کہ غلط قسم کا تصوف کون سا اور صحیح قسم کا تصوف کون سا ہے۔

سچے مرشد کی تلاش:

مجھے مطلق یاد نہیں کہ مجھے تصوف اور فقیری کا ذوق کب سے پیدا ہوا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جب سے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا اپنے آپ کو فقر و تصوف کے جال میں پھنسا ہو پایا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میرے دادا حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ نہ صرف اپنے وقت کے ایک جید عالم بلکہ ایک بہت بلند پایہ ولی اللہ بھی تھے۔ میں نے انہی کی آغوش محبت میں آنکھ کھولی اور دس برس کی عمر تک انہی کے سایہ شفقت میں پروان چڑھا۔ دادا صاحب کے پاس ہر قسم کے بزرگ آتے تھے اور دس پانچ تو ہر وقت موجود ہی رہتے تھے۔ ان میں مولوی بھی ہوتے تھے اور صوفی بھی۔ اول درجے کے متشرع بزرگوں سے لے کر رسول شاہیوں قلندروں بلکہ ملنگوں تک ہر قسم کے لوگوں کو میں نے دیکھا اور ان سے نادانستہ طور پر طرح طرح کا تاثر حاصل کیا۔ میں دس برس کا تھا کہ دادا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سے بیس برس کی عمر تک برابر اس کوشش میں رہا کہ کسی بزرگ سے بیعت ہو کر باقاعدہ سلوک طے کروں اور اس غرض سے سینکڑوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہاں کسی اچھے بزرگ کی خبر سنی وہیں پہنچا لیکن کہیں بھی طبیعت نہ جمی۔

دادا صاحب کے فیض تربیت اور تعلیم سے طبیعت میں توحید کا رنگ بہت گہرا ہو گیا تھا اور ایک ایسے بزرگ کی جستجو تھی جو شریعت کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال بھی ہو۔ تنگ خیالی سے مجھے بچپن ہی سے کوفت ہوتی تھی۔ میں صرف کشف و کرامات کو بزرگی کا ثبوت نہ جانتا تھا۔ مجھے تو ایسے بزرگ کی تلاش تھی جو صاحب علم' صاحب عرفان اور صاحب تحقیق ہو۔ کشف و کرامات دکھانے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن عارف محقق کہاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ دس سال اسی بے چینی اور تگ و دو میں گزر گئے۔

فقیروں کے رنگ:

ان دس سالوں میں سینکڑوں فقیروں سے ملنا ہوا۔ عجب عجب رنگ کے لوگ دیکھے۔ زیادہ تر تو

ایسے لوگ ملے جو بالکل جھوٹے اور جعلساز تھے۔ فقیری کی الف بے تے بھی ان کو نہ آتی تھی۔ صرف لباس فقیرانہ تھا اور کچھ شعبدے اور چٹکلے جانتے تھے۔ کوئی روپیہ کو مٹھی میں بھینچ کر دودھ نکال دیتا تھا۔ کوئی پانی دم کر کے اس کو میٹھا کر دیتا تھا۔ کوئی سونا اور چاندی بنا کر دکھا دیتا تھا۔ کوئی زیور اور نوٹ دگنے کر دیتا تھا۔ دنیا تھی کہ ان کے شعبدوں کو کرامات سمجھ کر اس طرح ٹوٹی پڑتی تھی جیسے شہد پر مکھیاں۔ لیکن میں نے جب ان کو قریب سے دیکھا اور رازہائے اندرون پردہ معلوم کیے تو یہ ظاہر ہوا کہ وہ سب جھوٹے' دغاباز' انتہائی گندے اور بے ایمان بلکہ بدمعاش تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور گروہ سے سابقہ پڑا یہ لوگ عملیات اور تعویذ گنڈوں کے بل بوتے پر فقیری کرتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے تابع کوئی موکل یا ہمزاد تھا۔ ان کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ لوگوں کو کہیں سے کوئی چیز منگا دیتے تھے یا ان کے گھر کی کوئی بات بتا دیتے تھے۔ ان میں ایسے بدمعاش بھی تھے جو اپنے موکل یا جن کو حکم دیتے کہ فلاں عورت کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ پھر خود عامل بن کر وہاں پہنچتے اور اس خبیث کو اتار کر خوب روپیہ بٹورتے۔ ان میں کوئی ایسا بھی تھا جو اپنے موکل کے ذریعے بیماروں کا مرض معلوم کر کے بیان کر دیتا اور پھر گنڈے تعویذ سے اس مرض کا علاج کرتا اور سینکڑوں روپے فیس لیتا۔ دہلی میں ایک ایسے ہی عامل کو میں نے دیکھا جس نے اس کام سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کمایا اور سینکڑوں ایکڑ زمین خریدی۔ تعویذ گنڈے کرنے والوں میں خال خال ایسے لوگ بھی دیکھے جو نہایت نیک اور عبادت گزار تھے اور ان کے عملیات سے خلق خدا بہت فائدہ اٹھاتی تھی۔ لیکن تصوف اور سلوک سے یہ لوگ بھی بالکل نابلد اور محض ناآشنا تھے۔ مگر لوگ ان کو ولی اللہ سمجھ کر ان سے مرید ہوتے اور خوب نذرانے دیتے تھے۔

ایک اور گروہ دیکھا یہ لوگ آبادی سے باہر تکیوں اور خانقاہوں میں رہتے تھے۔ شرع سے بالکل بے نیاز اور شرعی عبادات سے بالکل ناآشنا۔ دن رات چرس کے دم لگاتے' بھنگ کے پیالے چڑھاتے اور ہر وقت ہوحق مچاتے تھے۔

یہ لوگ بدن پر بھبوت ملتے' ہاتھوں میں لمبے لمبے چمٹے اور سر پر بڑے بڑے بال رکھتے تھے اور اپنے آپ کو ملنگ اور قلندر کہتے تھے۔ میں ان لوگوں میں بھنگ اور چرس کے سوا اور کوئی بدچلنی یا

بدکاری نہیں دیکھی اور اگر ہو تو خدا ہی جانتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض میں بے پناہ روحانی قوت تھی ایک ہی نظر میں انسان کا قلب جاری کر دیتے تھے۔ یہ بیماروں کا علاج بھی کرتے اور ایک چٹکی راکھ یا ایک گھونٹ پانی سے بڑی بڑی پرانی بیماریاں منٹوں، سیکنڈوں میں دور ہو جاتی تھیں۔ ان میں کشف بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ماضی کا حال ایسے بیان کرتے جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ مستقبل کی بابت پیشین گوئیاں بھی کرتے جو اکثر ٹھیک ہوتی تھیں۔ ان کی طرف میرے دل نے بہت رجوع کیا لیکن دادا صاحب کی دی ہوئی تعلیم آڑے آئی اور میں نے باوجود ان کرامات کے ان سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ایسے لوگ بھی دیکھے جو بڑے پاک باز عابد و زاہد اور مرتاض تھے۔ یہ دنیا سے الگ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے اور دن رات اللہ اللہ کرتے تھے۔ یہ واقعی بزرگ تھے۔ کشف و کرامات ان کے لیے بہت معمولی بات تھی۔ میرے دل میں اب بھی ان کی عزت و محبت اور بڑی قدر و منزلت ہے لیکن ان میں بھی ایک نقص تھا۔ یعنی ان کی زندگی رہبانیت کی زندگی تھی اور رہبانیت خلاف اسلام ہے۔ اس لیے میں نے ان سے ملنا اور ان کے پاس جانا بھی چھوڑ دیا۔

ان کے علاوہ ایک اور جماعت سے شرف نیازمندی حاصل ہوا۔ یہ علمائے دین کی جماعت تھی۔ یہ بھی صوفیوں کی طرح عوام کو بیعت کرتے اور ہزارہا مریدوں کو ہدایت فرماتے تھے۔ لیکن ان میں سے خال خال ہی ایسے تھے جو تصوف والی روحانیت کے حامل ہوں زیادہ تعداد ایسے بزرگوں کی تھی جو صرف تقویٰ و عبادت کے لیے بیعت کرتے تھے۔ یعنی صرف صاحب قال تھے صاحب حال نہ تھے۔ بہرحال اس جماعت کے پاس بھی میرے درد دل کا مداوا نہ تھا۔ تاہم میں ان کے کام کو عوام کے لیے مذہبی نقطۂ نظر سے بہت اہم اور لازمی سمجھتا ہوں۔

ایک ایسی جماعت بھی دیکھی جو سرتاپا تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے افراد ہر لحاظ سے صوفی اور بزرگ نظر آتے تھے۔ میرا اشارہ ان پیروں اور بزرگوں کی طرف ہے جو بڑی بڑی درگاہوں اور آستانوں کے سجادہ نشین تھے۔ ان میں کثیر تعداد ایسے پیروں کی تھی جو صرف ظاہری رکھ رکھاؤ اور آستانی شان و شوکت کی وجہ سے مرجع خلائق تھے ورنہ حقیقتاً روحانی طاقت اور

معرفت وحقیقت کے لحاظ سے صفر ہی تھے۔ہاں جہاں تک کتابی مسائل تصوف کا تعلق ہے خاصہ اچھا علم رکھتے تھے۔پھر بھی اس جماعت میں کئی بزرگ ایسے ملے جو تصوف کے ظاہری علم کے ساتھ ساتھ باطنی دولت سے بھی مالا مال تھے اور انہی میں سے بعض بعض کو علم معرفت بھی خوب حاصل تھا۔ان بزرگوں میں کسی نہ کسی سے میں ضرور بیعت ہو جاتا۔لیکن ایک بات مانع ہوئی اور وہ تھی ان کی درباداری، دنیوی شان وشوکت اور کروفر' فقیرانہ سادگی ایک جگہ بھی نظر نہ آئی۔ہر ایک آستانہ کے ساتھ صاحب آستانہ کے آباؤاجداد کی ایک دو قبریں ضرور تھیں جن کا احترام اس قدر کیا جاتا تھا جو کعبہ کے احترام سے بھی بڑھ جاتا تھا اور پوجا کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔بہت سے آستانوں کے صاحبان سجادہ ان قبروں سے بھی زیادہ پوجے جاتے تھے۔یہاں تک کہ ان کو باقاعدہ سجدے کیے جاتے تھے اور یہ سب باتیں اس تعلیم کے خلاف تھیں جو مجھے ملی تھی۔

مختصر یہ کہ دس برس اسی تلاش وطلب میں گزر گئے۔لیکن اس زمانہ میں جو علم اور تجربہ فقیری کی بابت ہوا وہ بہت ہی بیش قیمت تھا۔بزرگوں اور فقیروں کی ملاقات کے علاوہ اسی زمانہ میں تصوف کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔

دادا صاحب مرحوم ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی چھوڑ گئے تھے جس میں کم وبیش دو ہزار کتابیں سیر وسلوک اور تصوف پر تھیں۔ان میں سے کئی سو کتابیں پڑھ ڈالیں۔اگر چہ بہت سی کتابیں مطلق سمجھ میں نہ آئیں تاہم کچھ نہ کچھ حاصل ہو ہی گیا۔آخر کار اس تلاش وطلب کا نتیجہ نکلا اور بہت اچھا نکلا۔سچ ہے دیر آید درست آید۔

پہلی ملاقات اور بیعت:

مطلب یہ کہ اچانک اور اتفاقاً حضرت مولانا کریم الدین احمدؒ سے ملاقات ہوگئی۔

پہلے ہی دن حضرت مولاناؒ کی خدمت میں چھ گھنٹے حاضر رہا اور بیعت ہو کر ہی اٹھا۔حضرت صاحب نے فرمایا بھی کہ دو چار ماہ ہماری صحبت میں رہو اور ٹھوک بجا کر پرکھ لو۔پھر بیعت ہونا۔مگر میں نے عرض کیا خدا جانے پھر وقت اور موقع ملے نہ ملے۔جو کچھ مجھے دیکھنا تھا دیکھ لیا۔مہربانی فرمائیں اور مجھے بیعت کر لیں۔

مولانا نے دریافت فرمایا:

''کس غرض سے بیعت ہونا چاہتے ہو؟''

میں نے عرض کیا:

تین مقاصد ہیں۔اول: روحانی طاقت' دوسرے: تزکیہ اخلاق' تیسرے: دیدار باری تعالیٰ۔

مولانا نے فرمایا:

''پہلی دو چیزیں تو تم کو میرے ذریعہ سے مل جائیں گے لیکن تیسری چیز یعنی دیدار باری تعالیٰ میرے بس کی بات نہیں۔اس کے بدلے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ معرفت باری تعالیٰ کسی نہ کسی قدر حاصل ہو جائے گی۔''

میں نے عرض کی کہ ''دیدار خدا ممکن بھی ہے؟''مولانا نے فرمایا: ''ممکن کیوں نہیں۔رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوا۔حضور ﷺ کے صحابہ کبار کو میسر آیا۔حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ''میں دل کی آنکھ سے اللہ کو دیکھتا ہوں''پھر حضور ﷺ کی امت اس سے کس طرح محروم رہ سکتی ہے۔اکابر اولیاء جتنے بھی گزرے ہیں، سبھی جیتے جی اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہوئے۔لیکن اللہ کا دیدار ان ظاہری آنکھوں سے نہیں ہوتا بلکہ ایک باطنی آنکھ پیدا ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنی طاقت کے مطابق یقیناً دیکھتی ہے اور اسی کے بعد ہی ایمان کا وہ درجہ نصیب ہوتا ہے جس میں کبھی کمی اور شک پیدا نہیں ہو سکتا۔''

اس پر میں نے پوچھا کہ آپ اتنا بتا دیں کہ ''یہ دولت میری قسمت میں ہے بھی یا نہیں''مولانا نے تھوڑی دیر سکوت فرمانے کے بعد کہا: ''ہاں تمہارے دل میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے کہ جب تک تم زندگی میں خدا کو نہ دیکھ لو گے مرو گے نہیں۔''

میں نے عرض کی: ''اتنا اور بتا دیں کہ کس عمر میں یہ دولت حاصل ہو گی؟''مولانا نے فرمایا: ''ساٹھویں سال میں''میں نے پوچھا: ''آپ اس وقت حیات ہوں گے؟''جواب دیا: ''واہ میری تو قبر کا نشان بھی اس وقت نہ ہو گا''میں نے کہا: ''پھر یہ چیز کس کے توسل سے ملے گی؟''جواب دیا کہ ''میاں صاحبزادے ایک گندم کا دانہ یا ایک قطرہ پانی جو تمہارے حلق سے نیچے اترتا ہے اس

پر تمہارا نام لکھا ہوتا ہے اور اللہ کے حکم اور قضاو قدر کے انتظام سے تم تک پہنچایا جاتا ہے۔ تو کیا یہ روحانی دولت اس قدر سستی اور بے حیثیت چیز ہے کہ یونہی بغیر اللہ کی مرضی کے جس کا دل چاہے وہ حاصل کر لے۔''

یہ بھی اللہ کے حکم اور فضل ہی سے ملتی ہے اور جس کو وہ نوازنا چاہے اس کے لیے ہزار وسیلے بھی پیدا کر دیتا ہے۔ تم کو بھی کوئی ایسا بزرگ مل جائے گا جس کی تعلیم اور صحبت سے تمہارے اندر وہ صلاحیتیں پیدا ہو جائیں گی جو جیتے جی اللہ کا دیدار حاصل کرنے کے لیے لازمی ہوتی ہیں۔'' اس پر میں نے بڑی بے صبری اور عاجزی سے دریافت کیا کہ ''وہ باتیں کون کون سی ہیں جن سے یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ بیان فرمادیں تاکہ میں ابھی سے وہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کروں۔''

مولانا: صرف دو باتیں، پہلی بات تو تزکیہ اخلاق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر اللہ کے ہو جاؤ۔ جیسا کہ سورہ مزمل میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً (المزمل: ۸)

میں: قبلہ اس سے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ذرا تفصیل سے ارشاد فرمائیں تزکیہ اخلاق سے کیا مراد ہے؟

مولانا: مفصل تو بہت وقت طلب ہے مختصر یوں سمجھئے کہ دنیا میں دو چیزیں ہیں۔ خیر و شر، نیکی بدی، برائی بھلائی یا گناہ و ثواب۔ ان میں سے آپ جہاں تک ہو سکے برائی کو کم کریں اور بھلائی یا نیکی پر عمل زیادہ کرتے جائیں۔ جیسے جیسے برائی کم اور نیکی زیادہ ہوتی جائے گی آپ کا ذہن اور آپ کی روح لطیف اور پاکیزہ ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب کبیرہ گناہوں سے آپ بالکل محفوظ ہو جائیں گے تو آپ کے قلب میں پہلا درجہ اس صلاحیت کا پیدا ہوگا جو اللہ کی صفاتی تجلیات کے مشاہدہ کے لیے ضروری ہے اور جب آپ یہاں تک صفائی قلب کر لیں گے کہ برائی کا خیال بھی ذہن میں نہ آئے گا تو آپ کے قلب میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ اللہ کی ذات کو اپنی صلاحیت کی مقدار کے لحاظ سے کم یا زیادہ مشاہدہ کر سکیں۔

میں:مگر قبلہ یہ تو بہت مشکل کام ہے۔

مولانا: ہاں! ہے تو مشکل مگر برخوردارمن خدا کا دیدار بھی تو معمولی چیز نہیں۔دنیا کے کسی معمولی حاکم یا گورنر وغیرہ کے حضور میں جانا ہوتو اس کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔تو خدا تک پہنچنے اور اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے تو اگر جان بھی دینی پڑے تو کچھ بڑی بات نہیں۔

میں:تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

مولانا: سچی طلب اور تڑپ اور ان تھک محنت سے کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔

میں:قبلہ مجھے تو صاف الفاظ میں یہ بتادیں کہ تزکیہ اخلاق کے لیے کیا کیا کرنا چاہیے۔

مولانا:اچھا سنیے! پہلی بات تو یہ ہے کہ پانچ وقت نماز کے پابند رہو۔

دوسری بات یہ کہ ذکر جتنا بھی زیادہ ہوسکے کرو۔ذکر سے مراد یہ ہے کہ زبان سے اللہ اللہ کہو اور دل میں اس کی یاد مستقل طور پر قائم کرلو۔

تیسری بات یہ کہ دنیا کے تمام حقوق خوشی سے پوری طرح ادا کرو۔کراہت اور مجبوری سمجھ کر نہیں بلکہ خوشی سے ادا کرو۔انہی میں تمہارے منصبی فرائض بھی شامل ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ طبیعت میں عاجزی اور فروتنی پیدا کرو۔اپنے آپ کو کسی سے افضل اور کسی دوسرے کو اپنے سے کم تر یا ذلیل نہ سمجھو۔

پانچویں بات خلق خدا سے محبت کرو اور کسی کو اپنی کسی حرکت سے رنج نہ پہنچاؤ۔

میں:بجافرمایا جزاک اللہ اب کچھ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ وہ کس طرح کیا جاتا ہے۔

مولانا: اس کو تصوف کی اصطلاح میں ترک ما سویٰ اللہ کہتے ہیں۔اس کا مطلب بہت سے بزرگوں نے یہ لیا کہ دنیا اور دنیا والوں سے بالکل قطع تعلق کرکے جنگل اور پہاڑوں میں جا بیٹھو اور ہر وقت اللہ کے ساتھ مشغول رہو۔چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بڑے بڑے مراتب پائے۔ لیکن باوجود ازیں وہ غلطی پر تھے۔کیوں کہ ایک مسلمان کو فہم قرآن کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے ہر حکم وہدایت کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں سمجھے۔

اب ہم حضور اکرم ﷺ کی زندگی پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ حضور ﷺ نے تو یہ کبھی بھی نہیں کیا کہ دنیا سے بالکل بے تعلق ہو کر راہبانہ زندگی بسر کی ہو بلکہ حضور ﷺ نے تو ہمیشہ ایک متاہل زندگی بسر کی اور اس کے ساتھ عوام کی ہدایت و خدمت میں بھی ہمیشہ مصروف رہے۔ حضور ﷺ نے ملازمت بھی کی، تجارت بھی کی، مزدوری بھی اور بادشاہت بھی کی۔ حضور ﷺ ایک بہترین شوہر، بہترین باپ اور بہترین دوست تھے۔ حضور ﷺ اعلیٰ درجے کے قانون ساز، حاکم و ناظم اور جج بھی تھے۔ یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ ایک اول درجے کے سپاہی اور بے مثال جرنیل بھی تھے اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کا دلی تعلق سوائے خدا کے اور کسی چیز کے ساتھ نہ تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ایک سیکنڈ کے لیے بھی خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ اسی کا نام ہے ترکِ ماسویٰ اللہ۔

میں: سبحان اللہ! مگر قبلہ یہ تو بہت ہی مشکل بات ہے۔

مولانا: پھر وہی، برخوردار جتنا عظیم و عالی شان مقصد ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ مشکلات اس کے حصول میں پیش آتی ہیں۔ اگر خس و خاشاک اور کنکر پتھر اکھٹے کرنے ہوں تو گھر سے باہر نکلو اور فوراً گٹھڑی باندھ کر لے آؤ۔ لیکن اگر کان میں سے سونا حاصل کرنا ہو تو معلوم ہے کس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اگر مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے تو اس راہ میں قدم ہی نہ رکھو۔ کس نے آپ سے کہا ہے کہ بیٹھے بٹھائے آرام و آسائش کی زندگی چھوڑ کر اس بکھیڑے میں پڑو اور اپنی جان کو روگ لگاؤ۔

میں: بالکل بجا فرمایا۔ اچھا تو اب مجھے بیعت کر لیں۔

مولانا: ان تمام باتوں کو جان لینے کے بعد بھی آپ بیعت ہونا چاہتے ہیں۔

میں: جی ہاں!

مولانا: اچھا! ایک بات اور بتایئے کہ آپ محض روحانی ترقی کے لیے بیعت ہو رہے ہیں۔ دنیوی ترقی کا تو کوئی خیال مدِنظر نہیں۔

میں: جی نہیں۔

مولانا: دل کو خوب ٹٹول لو۔ کبھی یہ خیال ہو کہ ہمارے مرشد بہت بڑے بزرگ ہیں۔ کرامات کے زور سے لکھ پتی بنادیں گے۔ سونا بنانا بتادیں گے یا دست غیب سکھادیں گے۔ اگر اس قسم کا ذرا سا بھی کوئی خیال ہے تو خوب کان کھول کر سن لو کہ مجھے ان چیزوں میں سے کسی پر بھی قدرت حاصل نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر دنیوی فوائد کا ذرا سا خیال بھی دل میں ہے اور زبان سے آپ اس کا انکار کر رہے ہیں تو آپ جھوٹے ہیں، منافق ہیں اور ایسے آدمی کو روحانیت تو کیا نصیب ہو گی آخر میں سخت گھاٹا اور نقصان ہی رہے گا۔ اب فرمایئے کیا ارادہ ہے؟

میں: بیعت فرمالیجیے۔

مولانا: بہت اچھا۔

اس کے بعد مولانا نے اپنی جیب سے کچھ پیسے دے کر مٹھائی منگوائی اور مجھے بیعت کرلیا۔ مولانا سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ تھے۔ بہت مختصر سا ذکر وغیرہ کرنے کو بتایا۔ وہی جو میں آپ حضرات کو بتایا کرتا ہوں یعنی چوبیس گھنٹے پاس انفاس اور کسی ایک نماز کے بعد نفی اثبات۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولانا نے مجھ کو پانچ ہزار مرتبہ نفی اثبات کا ذکر بتایا تھا اور میں آپ کو ایک تسبیح سے لے کر زیادہ سے زیادہ پانچ تسبیح تک بتاتا ہوں۔ تعجب یہ ہے کہ خاندان نقشبندیہ میں ذکر بالجہر منع ہے لیکن مولانا نے مجھے ذکر بالجہر ہی بتایا تھا۔ اس کے علاوہ تزکیہ اخلاق کی ہدایت کی تھی۔

بیعت ہونے کے بعد میں نے بڑی جانفشانی اور جوش وخروش سے تین برس متواتر اپنے اوراد جاری رکھے اور ان تین برسوں میں اللہ کے فضل وکرم سے تین لطیفے: قلب روح اور سر روشن ہو گئے اور ان کے دوائر کی سیر بھی میسر آ گئی۔ اس پر مولانا نے مجھے مبارکباد دی اور تحریری اجازت بیعت کرنے کی عطا فرمائی۔ اس وقت میری عمر بمشکل ۲۳ برس کی ہو گی۔ بدیں وجہ مولانا نے اجازت نامہ میں یہ لکھ دیا کہ اگرچہ بیعت کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن جب تک چالیس سال کی عمر نہ ہو جائے کسی کو بیعت نہ کرنا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ اب تم نوافل تہجد پر بہت زور دو اور جس قدر زیادہ ممکن ہو تلاوت اور تفکر یعنی مراقبے میں وقت گزارا کرو۔ اس صحبت کے بعد حضرت مولانا سے بہت دفعہ ملاقات ہوئی یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مرشد کی تعلیم:

اب مجھ کو یہ بتانا چاہیے کہ مولانا کی تعلیم کیا تھی۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتا دینا بہت ضروری ہے کہ جب دس سال تک میں بڑے بڑے بزرگوں سے ملتا رہا اور ان میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو مولانا کریم الدین احمدؒ میں وہ کون سی خوبی تھی کہ پہلی ہی ملاقات اور پہلی ہی نشست میں ان سے بیعت ہو گیا۔ تو وجہ اس کی یہ ہوئی کہ میں نے اپنے دادا حضرتؒ سے جو خوبیاں اور نشانیاں ایک اچھے بزرگ کی سنیں اور کتب تصوف میں پڑھی تھیں، حضرت مولانا میں وہ سب کی سب موجود تھیں۔

اول تو یہ کہ وہ شریعت کے بہت سخت پابند بلکہ مجسم شریعت تھے۔

دوسرے یہ کہ وہ نہ صرف ایک جید عالم دین تھے بلکہ دنیوی علوم حاضرہ میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔

تیسرے یہ کہ ان کا اخلاق بہت ہی اچھا تھا غریب اور امیر، بادشاہ اور فقیر سب کو ایک نظر سے دیکھتے اور اس قدر نرمی، پیار، تواضع اور خلوص سے ملتے جس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔

چوتھے یہ کہ آپ نہایت سادہ مزاج تھے اور بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ دہلی سے کوئی پچیس تیس میل جنوب میں ''دھوج'' نامی ایک قصبے کے باہر ایک کچا احاطہ تھا جس میں تین چار چھپر پڑے ہوئے تھے۔ یہی مولانا کا کاشانہ تھا۔ دو چار میو خدمت کیا کرتے تھے اور روٹی پکا دیتے اور دوسری خدمات انجام دیتے تھے۔ مولانا صرف ایک جوڑا کپڑا کھدر کا رکھتے تھے، جس کو وہ ہر جمعہ کے دن نماز سے پہلے خود دھو کر پہن لیتے تھے۔ ہر چھ ماہ بعد ایک نیا جوڑا بناتے اور پرانا جوڑا کسی غریب کو دے دیا کرتے۔

مولانا کے بال بچے بڑی عمر کے تھے اور سب اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے۔ مولانا پر کسی کا بوجھ نہ تھا وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ مہینے میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے لیے دہلی تشریف لاتے اور بعض اوقات پندرہ بیس دن تک قیام فرماتے۔

آپ ہمیشہ چاندنی چوک کے کسی بہترین ہوٹل میں ٹھہرتے اور دو تین کمرے کرایہ پر لے

لیتے۔یہاں ہروقت مریدوں کا تانتا لگا رہتا اور مولانا خود سب کو کھانا کھلاتے۔میں نے مولانا کو کبھی کسی دعوت پر جاتے نہیں دیکھا۔

مولانا مشہور بالکل نہ تھے بلکہ ایک گمنام بزرگ اور ہر لحاظ سے کامل فقیر تھے۔مولانا کسی گدی یا خانقاہ کے سجادہ نشین نہ تھے۔وہ قبروں بلکہ بڑے بڑے مزاروں پر جانے کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔بزرگوں کا بڑا احترام کرتے لیکن خدا کے سوا مشکل کشا کسی کو نہ مانتے تھے۔غرض یہ کہ وہ ایک بہت پکے موحد تھے۔موحد میں نے غلط کہا'موحد نہیں بلکہ پکے توحیدی تھے۔

آپ کو موحد اور توحیدی کا فرق معلوم ہے؟موحد آج کل کے تصوف کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو وحدت الوجود یعنی''ہمہ اوست'' کا قائل ہو۔یعنی یہ سمجھتا ہو کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہے اور جتنی چیزیں نظر آتی ہیں یہ بھی خدا ہی کی تجلیات ہیں۔یہ عقیدہ چونکہ تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔اس لیے میں''توحیدی'' کا لفظ استعمال کرتا ہوں روحانی طاقت اور کشف وکرامات کے لحاظ سے بھی مولانا عدیم المثال نہیں تو فقید المثال ضرور تھے۔مجھے جو مولانا کی بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ ان کی سادگی اور جدید علوم سے واقفیت تامہ تھی۔وہ بڑے بڑے الجھے ہوئے مسائل حیات اور مسائل الٰہیات کو ایسے دلکش اور معمولی بات چیت کے انداز میں بیان فرماتے تھے کہ بڑے بڑے فلاسفروں اور ڈاکٹروں سے لے کر معمولی تعلیم یافتہ آدمی بھی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔مولانا صرف شراب طہوریٰ پلانے والے ساقی ہی نہ تھے بلکہ تشنگان علم وادب کی پیاس بجھانے والے دریا بھی تھے۔موجودہ زمانے کے مسائل حیات پر مولانا کی نظر بہت گہری تھی۔وہ صرف اللہ اللہ ہی نہیں سکھاتے تھے بلکہ یہ بھی بتاتے تھے کہ دنیا میں آرام وسکون اور عزت وترقی کی زندگی بسر کرنے کا راز کیا ہے۔علامہ اقبال کے بڑے مداح تھے۔مولانا سے ایک دو مرتبہ قوم کے زوال اور موجودہ زبوں حالی پر گفتگو ہوئی تو مولانا نے کئی گھنٹے اس قدر سیر حاصل بحث اس موضوع پر کی کہ سننے والے جن میں سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ اور کئی پی ایچ ڈی تھے عش عش کر اٹھے۔

مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ سب کا سب بیان کرنا تو ان صفحات میں ممکن نہیں۔ہاں تصوف کے

نقطۂ نظر سے جو کچھ فرمایا اس میں سے جو کچھ اس وقت یاد آ رہا ہے اس کے بیان کرنے میں مضائقہ نہیں۔ بلکہ کچھ مفید ہی معلوم ہوتا ہے۔

تصوف کی دو اقسام:

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ صوفیوں اور فقیروں کی قسمیں تو ہزاروں ہیں لیکن تصوف کی قسمیں صرف دو ہیں۔ ایک صحوی دوسری سکری۔

صحوی تصوف کے معنی ہیں تصوف بیدار' سکری تصوف کے معنی ہیں تصوف خفتہ۔ جب تک کسی قوم کے صوفیوں میں تصوف بیدار کارفرما ہوتا ہے وہ قوم برابر ترقی کرتی رہتی ہے اس قوم میں زندگی' خوشی' خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم کے صوفی یعنی روحانی علماء زندگی کے تمام رازہائے سربستہ اور انسانی فطرت سے خوب واقف ہوتے ہیں اور یہی تعلیم وہ اپنے مریدوں اور اپنی قوم کو دیتے ہیں۔ تصوف بیدار صوفی میں دانشمندی' فراست اور روانشوری پیدا کرتا ہے۔ ایسے صوفی بین الاقوامی مسائل اور اپنے معاشرے اور قوم کی خوبیوں اور رخامیوں سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ وہ آئندہ صدیوں تک آنے والے واقعات اور انقلابات کو اس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں جیسے روز روشن میں یہ سب ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوں۔ یہ لوگ آئندہ پیش آنے والے واقعات کو کشف سے کم لیکن اپنے علم و فراست سے زیادہ معلوم کرتے ہیں اور اپنی قوم کے لیے اپنے علم و فراست کی روشنی میں ایک ایسا لائحۂ عمل اور دستور پیش کرتے ہیں کہ اگر قوم اس پر کاربند رہے تو دوسری قوموں سے کبھی شکست نہیں کھا سکتی۔ اس کو ہرگز زوال نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہتی ہے۔

اسلام کے پہلے تیس سالہ دور میں ترقی کا موجب رسول اکرم ﷺ کا پیش کردہ دستور العمل ہی تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے مکتبی تعلیم بالکل نہیں پائی تھی۔ باوجود ازیں آپ انسان کے معیشتی اور معاشرتی مسائل کو جتنی اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے کیا کوئی بڑے سے بڑا فلاسفر یا عالم اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ان مسائل کو رسول خدا a سے زیادہ اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ حقیقت ذات وصفات باری تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ

ساتھ حقیقت الاشیاء اور حقیقت فطرت انسانی کا اتنا وسیع عرفان رکھتے تھے، جو دنیا میں کسی اور انسان کو نہ کبھی حاصل ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ کو تائید الٰہی بھی حاصل تھی ۔یعنی وحی بھی ہوتی تھی ۔پھر حضور ﷺ سے اچھا دستورالعمل انسان کے لیے کون پیش کرسکتا تھا یا کرسکتا ہے ۔دنیا کی جتنی قومیں اس وقت ترقی کے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں سب کے معاشرتی اور معیشتی قوانین وقواعد پر غور سے نظر کرو تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ ان سب نے اسلام ہی کے قوانین وقواعد کو اپنا رکھا ہے ۔لیکن افسوس اور رونا اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے صرف تیس چالیس برس حضور ﷺ کی تعلیم پر عمل کیا اس کے بعد تاریخ شاہد ہے کہ جیسے جیسے مسلمان حضور اکرم ﷺ کے بنائے ہوئے دستورالعمل سے ہٹتے گئے ان پر زوال آتا گیا۔ یہاں تک کہ آج ہم جیسے کچھ مسلمان ہیں اور اسلام کی تعلیم پر جیسا کچھ عمل کررہے ہیں اور دنیا میں ہماری جو کچھ حیثیت دوسری اقوام کے مقابلہ میں ہے وہ ظاہر وباہر ہے ۔

مولاناؒ فرماتے کرتے تھے کہ رسول خدا ﷺ دنیا کے نہ صرف سب سے بڑے صوفی بلکہ تمام گزشتہ اور آئندہ صوفیوں کے سردار تھے ۔اگر کوئی شخص حضور ﷺ کو صوفی نہیں سمجھتا تو سمجھ لو کہ وہ جاہل ہے تصوف کو نہیں جانتا ۔

صوفی ہونے کے لیے جتنی شرطیں ضروری ہیں ۔رسول اکرم ﷺ میں وہ سب بدرجہ اتم موجود تھیں ۔صوفی موٹے جھوٹے بلکہ اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے حضور ﷺ بھی کملی پوش تھے ۔اللہ نے بڑے لاڈ سے سورہ مزمل میں حضور ﷺ کو کملی والا کہہ کر مخاطب کیا ہے، صفائے قلب، تزکیہ اخلاق، خوش خلقی، عاجزی، انکساری، مساوات سب صوفیوں کی صفات ہیں اور یہ سب رسول خدا ﷺ میں بدرجہ کمال موجود تھیں ۔روحانی طاقت وکشف وکرامات یعنی معجزات میں حضور ﷺ فرد تھے اور ہمیشہ فرد ہی رہیں گے ۔آخری زمانہ میں حضور ﷺ کے پاس مال غنیمت سے اتنی دولت آتی تھی کہ حضور ﷺ کے برابر عرب میں کوئی مالدار ہی نہ تھا۔خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ والضحیٰ میں فرمایا ہے:

وَوَجَدَكَ عَآئِلاً فَاَغْنٰى (الضحیٰ: 8)

یعنی ’’کیا ہم نے نہیں پایا تم کو تنگ دست اور نہیں کر دیا تم کو مالدار۔‘‘

لیکن باوجود اس افراط دولت کے حضور ﷺ کا یہ حال تھا کہ جتنا مال اور سونا چاندی کسی دن حضور ﷺ کو ملتا وہ سب کا سب شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے غریبوں اور حاجت مندوں کو دے ڈالتے اور خود اکثر فاقے سے رہتے۔ کیا یہ صوفیوں کی سنت اور عادت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جب سارا عرب مسلمان ہو گیا تو حضور ﷺ تمام ملک کے بادشاہ یا حاکم مطلق تھے۔ حضور ﷺ کے حکم کے خلاف کوئی نظر بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنی اس حیثیت سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ حضور ﷺ بادشاہ ہو کر بھی فقیر ہی رہے۔ نہ صرف اپنا بلکہ غریب سے غریب لوگوں کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ معمولی لباس زیب تن فرماتے، چٹائی پر سوتے، کمبل اوڑھتے اور ہر وقت خدمت خلق میں مصروف رہتے۔ کیا یہ سب باتیں صوفیوں اور تصوف کی شرائط اور لوازمات میں سے نہیں ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ حضور aصوفی نہ تھے۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ حضور ﷺ کا تصوف، تصوف بیدار تھا اور یہ اسی کی برکت ہے کہ آج اس سطح زمین پر ساٹھ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ لیکن اگر یہ مسلمان دوسری اقوام عالم کے مقابلہ میں کمزور ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہزار بارہ سو سال سے مسلمان صوفیوں نے تصوف بیدار کو چھوڑ کر تصوف خفتہ کو اپنا لیا ہے۔

تصوف خفتہ کی بابت مولانا فرماتے تھے کہ ’’یہ انسانیت کی افیم ہے۔ خفتہ تصوف والے صوفی فرشتہ تو بن سکتے ہیں لیکن انسان نہیں رہتے۔ میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ قبلہ یہ خفتہ تصوف کیا ہے اور خفتہ تصوف والے صوفی کون ہیں۔ فرمایا کہ آج کل تو ہزار سچے صوفیوں میں سے ۹۹۹ خفیہ صوفی ہی ہیں۔ ان کو نہ خدا کا پتہ ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کی صفات کیسے کام کرتی ہیں۔ نہ اشیاء کی معرفت حاصل ہے۔ نہ انسانی فطرت کی خبر ہے۔ یہ زندگی کے راز سے بے خبر ہیں۔ نہ دور حاضر کے مسائل سے واقف ہیں۔ ہر وقت روحانی کیف و استغراق میں مدہوش و مبتلا۔ ’’لا اور پلا، لا اور پلا‘‘ کی تکرار میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کو اپنا ہی پتہ نہیں، دوسروں کی کیا اصلاح کریں گے اور قوم کو سیدھا راستہ کیا بتائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض بعض میں بہت بڑی روحانی طاقت وقدرت ہوتی ہے۔وہ مردے زندہ کر سکتے ہیں۔پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔لیکن یہ سب بے کار ہے۔ جتنے پیغمبر دنیا میں آئے سب کے سب اپنی قوم کی ہدایت اور خدمت کے لیے آئے تھے۔ان پیغمبروں کو اللہ نے ہر قسم کی صلاحیتیں اور بے پناہ طاقتیں دی تھیں لیکن سبھی نے ان طاقتوں اور صلاحیتوں کو اپنی قوم کی اصلاح اور بہبود کے لیے صرف کیا۔کسی ایک نے بھی خود کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس صوفی یا بزرگ میں اس قسم کی طاقتیں ہوں اور وہ ان کو اجتماعی طور پر قومی اصلاح وفلاح کے لیے صرف نہ کرے خود ہی مزے لوٹتا رہے وہ حضور اکرم a کا سچا پیروکار نہیں ہے اور یہ لوگ انفرادی طور پر جو کچھ فائدہ دعا یا کرامات کے زور سے پہنچاتے بھی ہیں وہ کوئی خاص قابل قدر چیز نہیں ہے بلکہ اس سے قوم کو الٹا نقصان پہنچتا ہے۔لوگ اللہ کو چھوڑ کر خود انہی کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ان کے مرنے کے بعد ان کی قبریں پوجتے ہیں اور قوم اسلام سے ہٹتے ہٹتے مشرک ہو جاتی ہے۔اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہوگا۔

الغرض! یہ تھی حضرت مولانا کریم الدین احمدؒ کی تعلیم جو وہ مجھے اور دوسرے مریدوں کو دیا کرتے تھے۔اس تعلیم کا بہت مختصر سا لب لباب میں نے آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے اور محض اس لیے کیا ہے کہ تا کہ آپ کی سمجھ میں آ جائے اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ تصوف میں میرا رنگ اور میرے عقائد کیا ہیں اور میں آپ لوگوں کو کیا سکھانا اور کیا بتانا چاہتا ہوں۔اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ میں تم سب کو بیدار بلکہ زندہ صوفی بنانا چاہتا ہوں۔جو لوگ میری اس تعلیم پر عمل کریں گے دین و دنیا میں سرخرو ہوں گے اور جو اس سے برگشتہ ہو کر صرف شراب طہوریٰ کے نشہ میں بے خودی اور سرمستی کے مزے لوٹتے رہیں گے وہ آخر کار خراب وخوار ہوں گے اور پچھتائیں گے۔یہ شرابی تصوف قوم کے لیے موت کا پیغام ہے۔یہ آدمی کو سست' کاہل' بے کار اور نکما بناتا ہے۔غور کرو کہ ایسے صوفی اور ایک چرسی یا بھنگڑی میں کیا فرق ہے۔

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ تمہاری محنتوں کا صلہ اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائے اور روحانی ترقی قوت

تمہارے قلوب میں پیدا ہو جائے تو اس کے نشہ سے مغلوب مت ہو۔ بلکہ کام میں لگ جاؤ اور پہلے کی نسبت اور زیادہ شوق اور جوش سے عمل کرو، عمل کرو اور عمل کرتے رہو۔ روحانی نشہ میں بے کار مت پڑے رہو۔ اپنی اصلاح کرو۔ دنیوی ترقی کے لیے راہیں نکالو اور ان پر عمل کرو۔ خلق خدا کی خدمت کرو۔ اور سب کے ساتھ محبت سے پیش آ ؤ۔ کتنی ہی تکلیفیں اور مصیبتیں پڑیں مایوس اور اداس مت ہو۔ ہمت نہ ہارو، ہمیشہ خوش رہا کرو۔ دل میں خدا کو بسائے رکھو۔ ہاتھ پاؤں کو خدمت خلق میں لگائے رکھو۔ اسی میں کامیابی ہے۔ یہی دائمی مسرت اور حقیقی زندگی کا راز ہے۔ مرتے دم تک کام کرتے رہو اور خدا کی یاد میں مر جاؤ۔ تمہیں کیا خبر یہ کتنا بڑا کام ہے مرنے کے بعد اس کا کیا انعام ملے گا۔ جنتیں تو ایک گھٹیا سودا ہے۔ ایسی زندگی کا صلہ تو خود خدا ہے۔ باقی باتیں مفصل طور پر ''تعمیر ملت'' اور ''طریقت توحیدیہ'' میں موجود ہیں۔ ان کو اتنا پڑھو کہ زبانی یاد ہو جائیں اور ان پر عمل کرو۔

آؤ اب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے۔ ہم کو مرتے دم تک صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ اپنی اور اپنے حبیب ﷺ کی اور اپنی مخلوق کی محبت عطا فرمائے۔ ہمیں بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ دے اور ہمارا خاتمہ اسلام پر کرے۔ آمین یا رب العالمین۔

خادم الخدام
عبدالحکیم انصاری
نوشہرہ درکاں
13 / اپریل 1962ء

خطبہ......2

19-4-1963

کوپانچویں سالانہ اجتماع پر بمقام لاہور ارشاد فرمایا

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ..........السلام علیکم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر کس زبان اور کس منہ سے ادا کیا جائے جس نے اپنی عنایات بے پایاں سے ہم کو پھر ایک جگہ اکٹھے ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ ہمارا پانچواں سالانہ اجتماع ہے۔اس سے پہلے چار اجتماعات نوشہرہ ورکاں میں ہوئے تھے۔اس سال خرابی صحت کی وجہ سے یہ ارادہ تھا کہ اجتماع اگلے سال پر ملتوی کر دیا جائے لیکن تمام اہل سلسلہ خصوصاً میاں محمد علی،میاں جمیل گل اور خان محمد قاسم صاحب کے پیار بھرے اصرار نے مجبور کر دیا اور یہ انہی کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج ہم سب یہاں موجود ہیں۔اس لیے میں ان تینوں صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور باقی اہل حلقہ کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ وہ دور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں اٹھا کر اللہ اور اس کے راستہ کی باتیں کرنے اور سننے کے لیے یہاں تشریف لائے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کی مساعی جمیلہ کو بہرہ ور کرے اور ان سب کو دین اور دنیا میں ہر طرح سے کامیاب فرمائے۔آمین

پچھلے سال کے اجتماع میں تین تجاویز خاص طور پر منظور کی گئی تھیں۔ایک یہ کہ حلقہ کے ارکان کی تعداد بڑھانے کے لیے ہر شخص (جو اہل ہو) کم از کم ایک نئے آدمی کی اصلاح کر کے حلقے میں شامل ہونے کے قابل بنائے۔

دوسری یہ کہ حلقہ کا ہر ایک آدمی نیا ہو یا پرانا روحانی قوت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق کی مزید اصلاح کرے اور اس ضمن میں ان باتوں پر خاص زور دیا گیا تھا کہ آپ لوگ خلق خدا کی محبت اور خدمت کے جذبہ کو اور زیادہ ترقی دیں۔ہمیشہ حق پر چلنے کی کوشش کریں اور قوت برداشت کو اور زیادہ بڑھائیں۔

تیسری تجویز یہ تھی کہ توحیدیہ سوسائٹی کے لیے جو فنڈ جمع کیا جا رہا ہے اس کو قائم رکھا جائے اور

دو سال میں ہر وہ شخص جو اس کا ممبر بنا ہے کم از کم پانچ سو روپیہ کے حصے اور خریدے۔لیکن مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان تجاویز پر سلسلہ کے بہت کم لوگوں نے عمل کیا ہے۔زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے یا تو بالکل ہی عمل نہیں کیا یا تھوڑا بہت کیا ہے وہ بھی بہت بے دلی کے ساتھ۔حالانکہ پچھلے سال کے خطبہ میں میں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ایسے اجتماعات کا فائدہ صرف انہی لوگوں اور انہی جماعتوں کو ہوتا ہے جو ان اجتماعات میں منظور ہونے والی تجاویز پر کما حقہ عمل کرتے ہیں۔

آج میں آپ لوگوں سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یا تو سلسلہ کے دستور العمل اور اجتماعات میں منظور ہونے والی تجاویز پر پوری طرح عمل کیا کریں یا پھر مجھے صاف صاف بتا دیں کہ آپ عمل نہیں کر سکتے تا کہ میں ان اجتماعات کو بند کر دوں۔یاد رکھیے کہ میں باتیں بنانا پسند نہیں کرتا بلکہ عمل چاہتا ہوں۔غالباً آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں سوسائٹی بنانے کے حق میں نہ تھا لیکن حلقہ کے چند عزیز دوستوں نے مجھ سے پوچھے بغیر سوسائٹی کے قواعد وغیرہ مرتب کر لیے اور غالباً دو چار احباب سے کچھ روپیہ بھی وصول کر لیا۔اس کے بعد مجھ سے اجازت مانگی۔

میری یہ عادت ہے کہ میں کبھی بھی کسی کی اپج اور امنگوں کو کچلنا نہیں چاہتا۔اسی لیے نئی تجاویز اور نئے منصوبوں پر عمل کرنے کی ہمیشہ اجازت دے دیتا ہوں خواہ وہ منصوبے اور تجاویز کامیاب ہوں یا ناکامیاب' ناکامیابی سے میں کبھی نہیں ڈرا۔اگر ہم ناکامیوں کے ڈر سے کوئی نیا کام ہی نہ کریں تو گویا ہم کبھی کچھ کریں گے ہی نہیں۔ہمارا کوئی قدم بھی آگے نہ بڑھے گا اور ہم پتھر کی طرح ایک ہی جگہ پڑے رہیں گے۔لیکن آج میں ان دوستوں سے جنہوں نے سوسائٹی قائم کرنے کی تجویز دی تھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سوسائٹی کے کام کو آگے بڑھانے اور اتمام تک پہنچانے کے لیے کچھ کیا ہے۔کتنے آدمیوں سے بات چیت کی ہے؟ کتنا لٹریچر چھپوایا ہے؟ کہاں کہاں کے دورے کیے ہیں' خود کتنا روپیہ دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔اور اگر آپ نے کچھ بھی نہیں کیا سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال کر بے فکر ہو گئے ہیں تو خود سوچئے کہ آپ کا یہ رویہ کہاں تک حق بجانب ہے۔آپ اپنے لیے کون سا نام پسند کرتے ہیں۔میں تو ایسے آدمیوں کو شیخ چلی کہا کرتا ہوں۔

یہ جو کچھ میں نے بیان کیا یہ تو تھا ہی قابل افسوس لیکن سب سے زیادہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بیسیوں اور سینکڑوں مرتبہ بتانے کے باوجود ارکان حلقہ کی اکثریت اب تک یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ ہمارا یہ نیا سلسلہ کیوں قائم کیا گیا ہے اور ہمارے سلسلہ اور دوسرے سلسلوں میں کیا فرق ہے۔ یہ بات چوں کہ میں ہر ایک آدمی کو بار بار نہیں بتا سکتا اس لیے "طریقت توحیدیہ" میں کافی وضاحت کے ساتھ لکھ دی ہے۔ لیکن آپ لوگ تو اس چھوٹی سی کتاب کو غور سے پڑھنے اور اس میں دیئے ہوئے خاص خاص اصولوں کو یاد رکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے 'عمل کرنے اور اپنے کردار کو ان اصولوں کے مطابق ڈھال لینے کا تو ذکر ہی بے فائدہ ہے۔

میرے خیال میں تو اتنی بات سبھی جانتے ہیں کہ انسان کی تمام شرافت اور ساری بڑائی صرف اس اصول پر منحصر ہے کہ وہ جن باتوں کو خود اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے اوپر لازم کر لے ان پر دل و جان سے عمل کرے اور کتنی ہی رکاوٹیں راہ میں حائل کیوں نہ ہوں سب کو ٹھکراتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ جو فرد یا جماعت ایسا نہیں کرتی وہ کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آج کے خطبہ میں میری سب سے بڑی نصیحت آپ کو یہی ہے کہ آپ عمل کرنے کی عادت بنا ڈالیں اور یاد رکھیں کہ عمل زندگی ہے اور بے عملی موت۔

اب میں ایک مرتبہ پھر یہ بتاتا ہوں کہ ہم نے سلسلہ توحیدیہ کیوں قائم کیا ہے؟ پچھلے سال کے خطبہ میں میں نے بیان کیا تھا کہ ایک اچھے اور سچے مرشد کی تلاش میں دس سال تک ہر قسم کے فقیروں کے پاس گیا اور ہر رنگ اور ہر سلسلہ کے بزرگوں سے ملا۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا کریم الدین احمد e سے نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت ہو گیا۔ بیعت ہونے کے بعد جب تک نقشبندیہ سلوک طے نہ کر لیا میں اور کسی بزرگ سے قطعاً نہیں ملا۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے سالک میں اپنے سلسلہ اور شیخ کا خالص رنگ پیدا نہیں ہوتا' دورنگی آجاتی ہے اور یہ بہت بڑا نقص ہے۔ تکمیل سلوک کے کچھ عرصہ بعد میں نے پھر فقرا سے ملنا شروع کیا اور بیس بائیس سال تک ہر رنگ اور ہر سلسلہ کے بزرگوں سے ملتا رہا۔ لیکن پہلے زمانہ کے ملنے اور اب تکمیل سلوک کے بعد کے ملنے میں بڑا فرق ہے۔ پہلے تو میں عقیدت اور طلب کے جذبہ سے ملتا تھا اور اب جس سے ملتا اس کو تنقیدی اور تحقیقی نظر سے دیکھتا ہوں۔

اسبابِ زوالِ امت:

آپ کو سوال کرنا چاہیے کہ اب میں ان لوگوں سے کیوں ملتا تھا اور ان ملاقاتوں سے میں کیا تجربہ اور علم حاصل کیا۔ میں بتاؤں' دراصل مجھ کو بچپن ہی سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ دنیا میں آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرو۔ اپنے گردوپیش اور ماحول کے حالات سے پوری طرح باخبر رہو۔ مجھے اس بات کی پوری تربیت بھی دی گئی تھی اور اب یہ بات میری عادت بن گئی تھی۔ چنانچہ جوں جوں علم و مشاہدہ بڑھتا گیا۔ دل و دماغ میں یہ احساس بھی شدت اختیار کرتا گیا کہ مسلمان جو کبھی اس زمین پر اللہ کے وارث اور خلیفہ یعنی نائب تھے آج اس قدر پسماندہ اور ذلیل کیوں ہو گئے ہیں کہ دنیا کی ہر ایک قوم ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ قدرتی طور پر مجھے مسلمانوں کے اسباب زوال کی جستجو شروع ہوئی اور اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں اور مضامین مل سکے سب کا مطالعہ کیا اور مسلمانوں کے مذہبی' معاشرتی اور اخلاقی حالات کو بنظر غائر دیکھا۔ اور ان کے اخلاق و عمل کا موازنہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں اور ان اقوام کے ساتھ کیا جو آج تہذیب و تمدن کی اجارہ دار خیال کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں میں ترقی کی جو تحریکیں وجود میں آئیں ان کے متعلق بھی بحد امکان پوری معلومات حاصل کیں۔ مثلاً جمال الدین افغانیؒ کی تحریک اتحاد المسلمین۔ سید احمد بریلویؒ کی تحریک جہاد۔ ترکی کی تحریک اتحاد و ترقی۔ سید احمد خانؒ کی تحریک احیاء العلوم۔ علامہ مشرقی کی تحریک خاکساراں اور ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک خلافت۔ پھر ان تمام تحریکوں کی ناکامیابی کے نفسیاتی اور مادی اسباب پر برسوں غور کیا۔ اس کے علاوہ اچھے ہوش مند علماء اور باخبر لوگوں سے تبادلہ خیالات بھی کرتا رہا اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے زوال کے ذمہ دار ہمارے تین طبقات ہیں۔

اول بادشاہ اور امراء' دوسرے علماء اور تیسرے صوفیا۔ چونکہ عوام سارے کے سارے ہر وقت ان تینوں طبقات سے متاثر ہوتے ہیں اور انہی کی ریس اور پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے جب ان طبقات میں خرابیاں پیدا ہوئیں تو ساری قوم خراب ہو گئی۔ ان طبقات میں یہ خرابیاں کس طرح پیدا

ہوئیں اور کس طرح دوسروں پر اثر انداز ہوئیں اس کی مکمل تاریخ لکھنے کے لیے تو ہزار ہا صفحات اور بڑا وقت درکار ہے۔

اس خطبہ میں نہ یہ سب کچھ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ اس کا موقع ومحل ہے۔تا ہم اس قدر بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خرابی نے سب سے پہلے بادشاہوں اور امیروں کے گھر میں جنم لیا اور اس کی ابتدا شاہان بنی امیہ کے زمانہ میں ہوگئی تھی۔بنو عباس کے زمانہ میں یہ خرابی اور زیادہ ہوگئی اس کی وجہ دولت کی زیادتی ٬حکومت کا نشہ٬ سامان عیش وعشرت کی افراط اور رفتہ رفتہ قرآن اور سنت سے دوری ومہجوری تھی۔امراء سے یہ وباء علماء کے طبقہ میں پہنچی۔اکثر بادشاہ اور امراء اپنی سیاسی اور معاشرتی ناجائز اغراض کو پورا کرنے کے لیے علماء سے فتوے لیتے تھے جو عالم انکار کر دیتا اس پر عتاب نازل ہوتا اور جو مرضی کے مطابق فتویٰ دے دیتا اس کو مال وزر اور اعزاز ومناصب سے نوازا جاتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علماء میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جو علماء سوء کے نام سے مشہور ہے٬ شاہان بنو عباس کے زمانہ میں یونان کا فلسفہ اور دوسرے علوم عربی میں ترجمہ کیے گئے جس کی وجہ سے فرقہ معتزلہ وجود میں آیا اور قرآنی آیات اور شعائر دینی کی نئی نئی تاویلات ہونے لگیں اور نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے مثلاً کلام حادث ہے یا قدیم٬ اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان مسائل میں جو علماء بادشاہ وقت کے عقیدے کے خلاف ہوتے ان کو ایذا اور سزائیں دی جاتیں اور جو متفق ہوتے ان کو انعام واکرام سے مالامال کر دیا جاتا۔اس طرح رفتہ رفتہ علمائے حق کم اور علمائے سوء زیادہ ہوتے گئے اور ہمارے زمانہ میں تو ان کے درمیان امتیاز کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ ''فرمایا رسول اللہ ﷺ نے قریب ہی لوگوں پر ایسا وقت آئے گا جب اسلام میں صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا اور نہیں رہے گا قرآن میں سے مگر اس کے نقوش۔ان کی مسجدیں (بظاہر) آباد لیکن حقیقت میں خراب ہوں گی۔ہدایت سے ان کے علماء آسمان کے نیچے کی تمام مخلوق میں

سب سے بدتر ہوں گے ۔انہی سے دین میں فتنہ پیدا ہوگا اور انہی میں لوٹ آئے گا۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے ﷺ تو شاید اپنے ہی زمانہ کو اس حدیث کا مصداق خیال کرتے ہوں لیکن اگر ہمارے زمانہ پر بھی یہ صادق نہیں آتی تو پھر شاید وہ زمانہ کبھی نہ آئے۔

یہ تو تھا ہمارے امراء اور علماء کا حال۔صوفیاء کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔وہ تصوف جس کی تعلیم حضور سرور کائنات ﷺ نے دی تھی مشکل سے ڈیڑھ دو سو برس قائم رہا۔جیسا کہ تاریخ تصوف کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔لیکن دوسری صدی ہجری کے آخری ربع سے اس میں طرح طرح کی بدعتیں شامل ہونے لگیں اور اس آب حیات کا وہ چشمہ صافی جو انسانی روح کو قرار واقعی زندگی بخشتا ہے گدلا ہونے لگا اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مکدر سے مکدر ہوتا چلا گیا۔اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ a تو ایسی کوئی تعلیم دے ہی نہیں سکتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو اور قرآن نے ہم کو دو باتیں بتائی ہیں ایک یہ کہ ماننے اور پوجنے کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔وہی تمام کائنات کا خالق اور مالک ہے۔وہی پیدا کرتا اور مارتا ہے۔وہی مرنے کے بعد ہمارے اعمال کی جزا و سزا دے گا اور وہی ہم کو پھر قبروں سے زندہ کر کے نکالے گا۔وہی تقدیریں بناتا اور بگاڑتا ہے وہ ہر لحاظ سے یکتا اور بے مثال ہے۔نہ اس کا کوئی ثانی ہے نہ شریک یہی وہ توحید ہے جو قرآن سکھاتا ہے۔

اب اگر کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا عالم اور صوفی مانا جاتا ہو اگر ہمیں اس توحید کے خلاف کچھ بتائے تو کیا ہمیں اس کی بات مان لینی چاہیے؟

دوسری بات قرآن نے یہ بتائی ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔کہنے کو تو یہ دو لفظ ہیں لیکن یہی دو لفظ انسان کے تمام اعمال و افعال پر حاوی ہیں۔ان دونوں لفظوں کی تفصیل بھی قرآن نے بتائی ہے اور خیر پر چلنے اور شر سے بچنے کا حکم دیا ہے۔یہی وہ قانون ہے جس پر عمل کرنے سے انسان اس دنیا میں امن و سکون، راحت و آرام اور خوشی و مسرت کی زندگی بسر کر کے ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں تکوین و ایجاد کی اس کو عطا کی ہیں ان کو کام میں لا کر زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اس کو تسخیر کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔

اب آپ یہ بتائیں کہ اگر کوئی صوفی ہم کو یہ تعلیم دے کہ اللہ ہم سے الگ اور کوئی ہستی نہیں ہے۔ہم خود ہی خدا ہیں یا دنیا کی ہر شے خدا ہے۔یا شر اور خیر سب ڈھونگ ہے' نہ گناہ کوئی چیز' نہ نیکی کوئی شے ہے۔نہ عبادت کی ضرورت ہے۔یا یہ کہے کہ یہ دنیا محض خواب و خیال ہے اس میں ترقی و عظمت حاصل کرنے کا خیال کرنا بھی گناہ ہے۔اس کے لیے نہ کسی کوشش وسعی کی ضرورت ہے' نہ محنت و مشقت کی۔ان سب کو چھوڑ کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ جاؤ۔خدا پر توکل کر وہ تمہارا رزق خود ہی تمہارے پاس بھیج دے گا تو آپ ہی فرمائیں کہ اس کا یہ کہنا کہاں تک قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔

اب حقیقت یہ ہے کہ پچھلے ہزار سال سے صوفیوں کی ایک بڑی جماعت یہی تعلیم دے رہی ہے' اب مصیبت یہ ہے کہ عوام امیروں بلکہ علماء سے بھی کہیں زیادہ صوفیوں کو مانتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے ولی اور اس کے مقرب بندے ہیں' خدا ان سے باتیں کرتا ہے' وہ جو کچھ کہتے ہیں' خدا کی زبان سے کہتے ہیں' اس لیے ان کا کہا کس طرح غلط ہو سکتا ہے۔سونے پر سہاگہ یہ کہ اکثر صوفیوں سے کشف و کرامات سرزد ہوتی دیکھتے ہیں تو ان کا عقیدہ ان صوفیا پر اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔اس لیے کوئی لاکھ سر پٹخے وہ تو انہی کی بات کو سچ جانتے ہیں اور انہی کے کہنے کے مطابق عمل کرتے ہیں۔یہ سب کچھ ایک ہزار برس سے ہو رہا ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری قوم بدعقیدگی اور بداعمالی کے اس درجہ تک گر چکی ہے جہاں سے اس کو اٹھانا ناممکن نہیں تو بے انتہاء دشوار ضرور ہے۔

امراء، علماء اور صوفیاء کا کردار:

قصہ مختصر مدت دراز تک امراء' علماء اور صوفیاء کے اعمال و کردار کی تحقیق کرنے اور عمر کا ایک بڑا حصہ اس میں صرف کر دینے کے بعد میرا یہ خیال یقین کے درجہ تک پہنچ گیا کہ قوم کی گراوٹ اور تباہی کے ذمہ دار یہی تین طبقے ہیں۔میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں طبقوں میں اچھا آدمی کوئی ہے ہی نہیں' بلا استثنٰی سبھی برے ہیں۔اچھے لوگ بھی بہت ہیں لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی ہے۔

امراء میں تین قسم کے آدمی ہیں:

1۔نواب اور زمیندار وغیرہ۔

2۔بڑے بڑے تاجر اور سرمایہ دار۔

3۔افسران حکومت۔

ان تینوں جماعتوں میں ذاتی اور شخصی عیوب کے علاوہ ایک عیب ایسا ہے جس کا اثر عوام پر بہت زیادہ پڑتا ہے اور وہ ہے عوام کے ساتھ ان کا تحقیر آمیز سلوک' عیاشی اور اوباشی کے عیب کسی میں بھی ہوں اس قدر رازداری اور پردے میں کیے جاتے ہیں کہ عوام کو معلوم نہیں ہوتا سوائے ان چند افراد کے جو ان کی ہوس رانیوں کا آلہ کار بنتے ہیں۔اس لیے ایسے ذاتی و شخصی عیوب کا اثر عام نہیں ہوتا۔لیکن ویسے دن رات کی پبلک زندگی اور کاروبار میں چونکہ عوام کا واسطہ چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ پڑتا ہے اس لیے وہ ان کے طریقہ سلوک سے بہت زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں۔یہ جب اپنے ملازموں' کارندوں' اہل کاروں' ماتحتوں یا اہل معاملہ سے ملتے ہیں تو اس وقت ان کی حرکات وسکنات اور انداز تخاطب میں اس قدر رعونت و خشونت اور سختی و درشتی ہوتی ہے کہ ملنے والے اپنے آپ کو سخت ذلیل و حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ دن رات ہر جگہ اور ہمیشہ یہی کچھ پیش آتا ہے اس لیے رفتہ رفتہ احساس کمتری اور قنوطیت ان میں اس درجہ سرایت کر جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو واقعی حقیر و ذلیل' بے کس و بے بس اور بے چارہ و ناکارہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ڈر' خوف اور بے حوصلگی ان کی طبیعت ثانی بن جاتی ہے۔احساس خودی و خودداری' خود اعتمادی اور ذاتی تعزز کا ان میں نام و نشان بھی نہیں رہتا اور رفتہ رفتہ دوسری اخلاقی خوبیاں بھی فنا ہو جاتی ہیں۔جس قوم کی بھاری اکثریت ایسے آدمیوں پر مشتمل ہو وہ قوم بھلا کیا کام کر سکتی ہے اور دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ کس طرح دوش بدوش چل سکتی ہے۔سچی بات تو یہ ہے کہ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر اگر چہ اپنے ملازموں وغیرہ کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ نہیں کرتے لیکن اہل معاملہ کے ساتھ خاصی خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ یہ خوش خلقی قطعاً بناوٹی اور محض کسب زر اور جلب منفعت کے لیے ہوتی ہے۔لیکن افسران حکومت تو اہل معاملہ کے ساتھ بھی اسی خشونت و رعونت سے ملتے ہیں جیسے کہ اپنے نجی ملازموں یا ماتحتوں سے۔الغرض ان لوگوں کی وجہ سے بھی

عوام میں اپنی کمتری اور ذلت کا احساس اسی طرح پیدا ہوتا ہے جیسے کہ رئیسوں اور تاجروں کے سلوک سے ہوتا ہے۔

دوسرا طبقہ علماء کا ہے۔ان کا سلوک بھی عوام کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ امراء کا۔یہ بھی غریبوں سے اسی رعونت اور خشونت سے پیش آتے ہیں جیسے کہ امراء اور افسر۔امراء اور افسروں کو اپنی دولت اور حکومت کا زعم ہوتا ہے۔علماء کو اپنے تقویٰ اور علم کا غرور ہوتا ہے۔یہ اپنے آپ کو جنتی اور دوسروں کو دوزخی جانتے اور ان سے سیدھے منہ بات کرنے میں شاید اپنی توہین سمجھتے ہیں۔اگر ایک غریب آدمی ان کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے جائے اور مولانا کی بات سے اس کی تسلی نہ ہو اور وہ کوئی جرح کردے تو سمجھ لو کہ اس کی شامت آگئی۔وہ صلواتیں سننی پڑتی ہیں کہ خدا کی پناہ! اگر کوئی ایسا شخص جس کی داڑھی منڈی یا کتری ہوئی ہو، لبیں بڑھی ہوئی ہوں، پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو، ان کی خدمت میں حاضر ہو تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔میں یہ باتیں کہاں تک گنواؤں۔مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے جو کچھ مسدس حالی میں ان کی بابت تحریر فرمایا ہے وہی لکھ دوں۔و ھو ھذا

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی
جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گناہ گار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ
کوئی مسئلہ پوچھنے ان سے جائے
تو گردن پہ بار گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے
تو قطعی خطاب اہل دوزخ کا پائے

اگر اعتراض اس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے
کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھلاتے
کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منہ پہ لاتے
کبھی خوک اور سگ ہیں اس کو بتاتے
کبھی مارنے کو عصا ہیں اٹھاتے
ستوں چشم بددور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلق رسول a امیں کے

الغرض یہ ہے سچی تصویر ہمارے علماء سوء کی۔ میری نظر سے ایک دونہیں سینکڑوں واقعات ہوبہوا یسے ہی گزرے ہیں۔ آج سے کوئی بیس بائیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک دن میں عصر کی نماز پڑھنے دہلی کی ایک اچھی بڑی اورمعروف مسجد میں گیا۔ جماعت ہوچکی تھی اس لیے میں نے اپنی نماز اکیلے ہی پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد میں کچھ وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ یہ آواز کان میں آئی:

''تم سے کہا کس مردود نے تھا کہ اپنے لڑکے کوانگریزی پڑھاؤ۔ اب مجھے کیا کہتے ہو جاؤ دفع ہو جاؤ۔'' یہ بات سن کر میں نے سر موڑا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد کے پیش امام صاحب ایک آدمی سے مخاطب ہیں۔ وہ غریب مولانا کی بات سن کر بہت حیران ہوا اور کہنے لگا'' کیا انگریزی پڑھنا گناہ ہے۔'' مولانا تو یہ بات سن کرآگ بگولا ہو گئے۔ فرمانے لگے ''گناہ کا بچہ اب یہ تو کفر ہے کفر۔ یہ جتنی بے دینی پھیل رہی ہے سب انگریزی کی ہی وجہ سے ہے۔ چلو یہاں سے دفان ہو۔'' یہ کہہ کر مولانا نے اس کی طرف سے منہ پھیرلیا اور وہ بے چارہ جوتے اٹھا کر چل دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھا۔ مسجد سے باہر آ کر میں نے اس سے پوچھا کہ'' کیا معاملہ تھا'' کہنے لگا ''جی کیا بتاؤں، میرا لڑکا میٹرک کے امتحان میں فیل ہوگیا ہے اور اس وجہ سے اتنا رنجیدہ ہے کہ کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ پڑھنا لکھنا بھی چھوڑ دیا

ہے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا کہ کوئی تعویذ دے دیں تا کہ اس کا دل پڑھائی میں لگنے لگے تو وہ کہتے ہیں انگریزی پڑھنا ہی کفر ہے۔" وہ تو یہ کہہ کر ایک طرف چلا گیا اور میں کچھ سوچتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔ یہ ایک واقعہ ہے ان سینکڑوں واقعات میں سے جو خود میں نے دیکھے ہیں۔

قرآن تو کہتا ہے کہ "اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور پیاری پیاری نصیحت کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ۔" لیکن ہمارے علماء کا طریقہ نصیحت تو ایسا کڑوا ہے کہ جس کو ایک مرتبہ واسطہ پڑ جائے وہ پھر دوبارہ ان کے پاس جانے کا نام بھی نہیں لیتا۔ اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اصلاح تو ہوتی نہیں' دین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً انگریزی تعلیم یافتہ تو ان مولویوں کی بداخلاقی کو دیکھ کر بالکل ہی بے دین ہو جاتے ہیں۔ وہ دین سے تو واقف ہوتے نہیں ان علماء ہی کو دیکھ کر دینی تعلیم کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور یہ باور کر لیتے ہیں کہ دین اسلام میں غصہ' نفرت اور سختی و درشتی کے سوائے ہے ہی کچھ نہیں۔ ان میں سے کتنے ہی تو عیسائی ہو جاتے ہیں اور محض اس واسطے ہو جاتے ہیں کہ عیسائی خود بھی اور ان کے پادری بھی بہت اچھے اخلاق کے ساتھ ان سے ملتے ہیں اور اکثر مصیبتوں میں ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔

علماء کا کام صرف یہی تو نہیں کہ مسجد میں نماز پڑھا دی۔ جمعہ کے دن خطبہ سنا دیا۔ مدرسہ میں درس دے دیا۔ یا مسئلے مسائل سمجھا دیے وہ تو نائب رسول ﷺ ہیں۔ اس لیے ان کا فرض تو یہ ہے کہ قوم کا اخلاق رسول ﷺ کے معیار پر قائم رکھیں۔ قوم کے افراد میں اتحاد اور محبت واخوت پیدا کریں تا کہ قومی قوت اور طاقت میں کمی نہ آنے پائے اور قوم دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے۔ مگر یہاں تمام باتیں الٹی ہیں۔ اخلاق وہ سدھار سکتا ہے جس کا اخلاق خود اچھا ہو اور ان کے اخلاق کا نمونہ ابھی بیان ہوا۔ اسی طرح محبت و اخوت صرف وہ لوگ پیدا کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں خود محبت اور اخوت کے جذبات موجزن ہوں۔

یہاں تو یہ حال ہے کہ قوم میں ارتباط پیدا کرنے کی بجائے اس کے ٹکڑے کیے جا رہے

ہیں ۔کتنے ہی فرقے ہیں اور ہر فرقہ کے علماء اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو گمراہ سمجھتے ہیں۔ پرائیویٹ بات چیت ہو یا کسی انجمن میں گفتگو۔ پبلک جلسوں میں تقریریں ہوں یا مساجد کے منبروں سے جمعہ کے خطبے ہر جگہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا ان کا شیوہ ہے۔اخلاق پر کسی کو تقریر کرتے آپ نے سنا ہے؟ محبت و اخوت اور رابطہ و اتحاد کی تحریک کسی عالم نے کبھی پیش کی ہے۔عوام ان کی حرکات کو دیکھ دیکھ کر خود بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔

الغرض کہاں تک بیان کروں جو کچھ بیان کر رہا ہوں یہ بھی برائی ہے اور برائی خواہ کیسے ہی حالات میں کی جائے آخر برائی ہے۔میرا دل ایسی باتیں کرنے سے بہت دکھتا ہے۔ لیکن انتباہ اور آگاہی کے لیے کہنا ہی پڑتا ہے۔نیت بخیر ہو تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔نہ بتاؤ اور نہ ظاہر کرو تو بھی شاید اللہ تعالیٰ باز پرس کر بیٹھے کہ جب تو جانتا تھا تو بتایا کیوں نہیں۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ میرا سچا دوست وہ ہے جو میری برائیوں کا تحفہ لے کر میرے پاس آتا ہے۔رسول اکرم ﷺ کی حدیث ان علماء سوء کے بارے میں ابھی بیان کی جا چکی ہے ایک بار اس کو پھر دیکھ لیں۔

مشہور انگریز فلاسفر فرانسس بیکن کہتا ہے کہ ''مذہبی فرقے اگر زیادہ ہو جائیں تو اس سے قوم میں الحاد پیدا ہوتا ہے۔''اس کا یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہے۔مسلمانوں میں دین سے تغافل اور بے پروائی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ہر فرقہ کے علماء اور مقلد دوسرے فرقے کو گمراہ بتاتے اور قرآن و حدیث سے ثابت کرتے ہیں تو سننے والوں کے دلوں میں نادانستہ طور پر یہ بات جم جاتی ہے کہ یہ سبھی جھوٹے اور غلط راستوں پر گامزن ہیں یا خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے مذہب کی تعلیم میں ہی اس قدر متضاد باتیں موجود ہیں کہ ہر فرقہ اپنی سچائی اور دوسروں کے بطلان کا ثبوت ایک ہی کتاب سے پیش کر سکتا ہے۔اس لیے سارا مذہب ہی گویا بازی گر کا پٹارہ ہے کہ اس میں سے جو چاہو نکال کر دکھا دو۔انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اس فرقہ بندی سے زیادہ متاثر ہوتے

ہیں اور مذہب سے بے زار ہو جاتے ہیں۔

الغرض علماء کی صحبت میں بیٹھنے‘ پرائیویٹ اور پبلک جلسوں میں ان کی باتیں سننے اور ان کی نجی اور پبلک زندگی کا دور ونزدیک سے گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں یہی رائے قائم کرنے پر مجبور رہوا کہ ہمارے درد کا علاج ان کے پاس بھی نہیں ہے یہ تو بنانے کی بجائے اور بگاڑ رہے ہیں۔تعمیر کی بجائے تخریب میں مصروف ہیں۔اب تھوڑا سا حال صوفیائے کرام کا بھی سن لیں۔ان کا علم تو مجھے امراء اور علماء سے بھی کہیں زیادہ ہے۔کیوں کہ جیسا میں پچھلے سال کے خطبے میں بیان کر چکا ہوں میں نے اپنی تمام عمر ہی کسب تصوف میں بسر کی ہے اور اس کے ہر شعبہ اور ہر رنگ سے خوب واقف ہوں۔لیکن صوفیوں کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے یہ بتا دینا بہت ضروری ہے کہ تصوف کیا ہے۔اس کا موضوع ومقصد کیا ہے۔اس کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اور جب آدمی کامل صوفی بن جاتا ہے تو پھر اس کا کام کیا ہوتا ہے۔

تصوف کا موضوع ومقصد:

اب مختصر طور پر سنیے کہ تصوف ایک علم ہے جس کا موضوع ہے ان طاقتوں اور ہستیوں کی حقیقت معلوم کرنا جن پر ہمارے مذہب کی بنیاد قائم ہے اور جن کو بغیر دیکھے اور بغیر ثبوت کے ماننا ہمارا پہلا فرض ہے اور انہی کے مان لینے کو ایمان بالغیب کہتے ہیں۔وہ طاقتیں اور ہستیاں ہیں اللہ‘ فرشتے‘ الہامی کتب‘ رسول جن پر یہ کتابیں نازل ہوئی ہیں۔قیامت کا دن اور حیات بعد الموت اور جزا اور سزا کے سلسلہ میں جنت اور دوزخ۔ان تمام میں سے انسان صرف الہامی کتب اور رسولوں کو دیکھ سکتا ہے۔لیکن وہ فرشتہ جو یہ الہام لے کر اللہ کی طرف سے آتا ہے دکھائی نہیں دیتا۔

اب تصوف کا موضوع صرف یہ ہے کہ ان چیزوں کا علم اور حقیقت معلوم کرے کہ اللہ کیا ہے‘ کیسا ہے مخلوق سے اس کا کیا تعلق ہے۔قرآن میں وہ اپنے لیے ہاتھ‘ آنکھ‘ کان اور نفس وروح وغیرہ کا ہونا بیان کرتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے۔وہ ہاتھ‘ آنکھ‘ کان اور نفس و

روح وغیرہ کیسے ہیں۔کیاوہ ایسے ہیں جیسے کہ ہمارے یااور کسی طرح کے۔کیااللہ کی شکل اور جسم انسان جیساہی ہے' جیسا کہ ایک حدیث شریف میں بیان ہوا ہے اور اگر اس کی شکل و صورت اور جسم انسان جیسا ہی ہے تو پھر وہ ہر جگہ حاضر و ناظر کس طرح ہوسکتا ہے وغیرہ وغیرہ ۔اسی طرح تصوف یہ بتاتا ہے کہ فرشتے کیسے ہوتے ہیں ۔وحی یاالہام کیونکر ہوتا ہے۔ دوزخ و جنت کی حقیقت کیا ہے اور وہ کہاں ہیں۔کیا آدمی جیتے جی ان کو دیکھ سکتا ہے یا صرف ان کا علم حاصل ہوتا ہے پھر ان چیزوں کے علم ومعرفت کے حصول کے لیے یہ جاننا بھی تصوف ہی کے دائرے میں ہے کہ کائنات کیا ہے ۔مادہ کیا چیز ہے۔روح ونفس کیا ہیں ۔عقل وجذبات کی حقیقت کیا ہے ۔انسان کیا ہے' کہاں سے آتا ہے' کہاں چلا جاتا ہے۔پیدا ہونے سے پہلے کیا تھا' مرنے کے بعد کیا بن جائے گاوغیرہ وغیرہ۔

اب رہی دوسری بات کہ ہم کوان باتوں کا علم حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے تو وہ چند باتیں ہیں۔یعنی اول تو انسان کو اپنی زندگی ظاہری اور باطنی دونوں طرح پاکیزہ بنانی پڑتی ہے ۔پھر اس کو اپنے اخلاق کا تزکیہ کرنا پڑتا ہے ۔یعنی یہ کوشش کرنی پڑتی ہے کہ جتنی اخلاقی برائیاں ہیں وہ سب دور ہوں اور جتنی خوبیاں ہیں وہ سب پیدا ہو جائیں ۔اس کے لیے کچھ ریاضت اور مجاہدہ بھی کرنا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ اس کو شریعت کی پوری پابندی کرنی اور ہر لحاظ سے رسول کریم a کے نقش قدم پر چلنا پڑتا ہے ۔مدت دراز تک ایسا کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بزرگی اور بڑائی پیدا ہوتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ انسان کامل ہوجاتا ہے۔جولوگ تھوڑی محنت اور تھوڑا عمل کرتے ہیں ان کوتھوڑا سا حصہ مل جاتا ہے اور جو زیادہ کرتے ہیں ان کو زیادہ ۔بدنصیب اور بیوقوف ہیں وہ لوگ جو کچھ بھی نہیں کرتے اور اپنے مرشد کے سر رہتے ہیں کہ ایک نظر میں کامل بنادو۔

اب سوال یہ ہے کہ جب انسان کامل بن جاتا ہے تو پھر اس کا کام کیا ہوتا ہے ۔اس کا کام بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کی اصلاح کرے۔ان کو اللہ کا سیدھا راستہ بتائے ۔اخلاق سکھائے ۔لوگوں سے برائیاں اور گناہوں کی عادت چھڑائے اور نیک بنائے ۔اور اگر کوئی

اس سے زیادہ چاہتا ہے تو اس کو تصوف سکھائے اور اپنی طرح سے بزرگ بنائے۔اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب علماء اور صوفیا دونوں ہی کا کام اصلاح اور اخلاق کی درستی ہے تو عالم بن جانا ہی کافی ہے اس قدر پاپڑ بیلنے اور ریاضت اور مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔تو جواب یہ ہے کہ علماء صاحب قال ہوتے ہیں اور صوفی صاحب حال۔علماء کے کہنے کا دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن صوفی اگر واقعی کامل ہو تو اس کے کہنے کا اثر بہت جلدی ہوتا ہے۔علاوہ ازیں صوفی کے دل میں ایک طاقت ہوتی ہے وہ اس طاقت کو جس کے دل پر ڈال کر قوت ارادی سے کام لیتا ہے اس کی کیفیات کو رفتہ رفتہ بدل سکتا ہے اور اس کے دل پر جو زنگ ہوتا ہے اس کو آہستہ آہستہ دور کر دیتا ہے۔اس طرح انسان آہستہ آہستہ بد سے نیک اور شقی سے سعید بن جاتا ہے۔

اب اس سے زیادہ اچھا کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ معاشرہ کو برے آدمیوں اور برائیوں سے پاک کر کے اس میں نیک آدمیوں اور نیک کاموں کا اضافہ کیا جائے۔انبیاء کا کام بھی یہی تھا اور جو بزرگ یہ کام کرتے ہیں صحیح معنوں میں وہی انبیاء کے وارث اور نائب کہلانے کے مستحق ہیں۔اس کے علاوہ ان بزرگوں کا کام تبلیغ اسلام ہے۔آج اقصائے عالم میں جو مسلمان نظر آتے ہیں اور جو تعداد میں پچاس ساٹھ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہیں وہ انہیں بزرگوں کی محنت کا ثمر ہیں۔جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام مسلمان بادشاہوں کے زور بازو سے پھیلا ہے وہ بتائیں کہ انڈونیشیا، چین وغیرہ میں جو کروڑوں مسلمان آباد ہیں وہاں کون سے بادشاہ فوجیں لے کر گئے تھے۔ہندوستان میں بھی سلطنت اسلامیہ قائم ہونے سے پہلے لاکھوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے اور یہ بھی مسلمان صوفیوں کی محنت و تبلیغ ہی سے مسلمان ہوئے تھے۔ان بزرگوں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات بابرکات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔آج کل دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مسلمان بنانے کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ خود مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی۔لیکن آپ غور فرمائیں تو یہ کام مطلق نہیں ہو رہا ہے۔الغرض! یہ ہیں وہ کام جو تصوف میں کامل ہونے کے بعد صوفیاء پر لازم اور فرض ہو

جاتے ہیں۔

جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے اگر آپ نے غور سے سنا اور پڑھا ہے تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ تصوف اور اس کا مقصد کیا ہے اور اس میں کمال حاصل کرنے والے کیا کرتے ہیں۔

اب اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اپنے زمانہ کے صوفیوں اور بزرگوں کا مقابلہ ان بزرگوں سے کریں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور دیکھیں کہ یہ صوفی اور پیر (دو چار فیصدی کو چھوڑ کر) اسلام اور اہل اسلام کی کیا خدمت کر رہے ہیں اور قوم کے لیے کہاں تک مفید یا مضر ہیں۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات میں سے شاید ہی کوئی ہو جس کو دس بیس پیروں فقیروں سے ملنے یا ان کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ اس لیے آپ خود فیصلہ کریں کہ یہ پیر فقیر معاشرے کے لیے کہاں تک مفید ہیں یا مضر۔ انہوں نے آپ کو اللہ، رسول ﷺ اور روحانیت کے متعلق کیا بتایا ہے۔ ان کی صحبت میں آپ کے اخلاق کی کتنی اصلاح ہوئی ہے۔ کوئی بڑا گاؤں یا قصبہ شاید ہی ایسا ہوگا جہاں دو چار پیر فقیر موجود نہ ہوں۔ ان میں عام طور پر صرف دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ مجذوب قسم کے فقیر جو برہنہ بیٹھے ہوئے چرس کے دم لگاتے اور طرح طرح کی بڑیں مارتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں۔ دیہات کے سیدھے سادھے لوگ ان سب کو ولی اللہ جان کر ہر وقت ان کے گرد جمع رہتے ہیں اور کوئی ضرورت یا مصیبت ہو تو خدا پر بھروسہ کر کے اپنی قوت بازو اور عقل سے کام لینے کی بجائے انہی پیروں اور فقیروں کے پاس دوڑے آتے ہیں۔ مجذوبوں سے دعا کراتے اور دوسروں سے تعویذ گنڈے لیتے ہیں۔ پھر ان تعویذ گنڈے والوں میں ایسے بھی ہیں جو سفلی عمل اور کالا علم جانتے ہیں اور لوگوں کو بیمار کر ڈالنے اور تباہ کرنے کے لیے مصروف عمل رہتے اور نذرانہ میں بڑی بڑی رقمیں لیتے ہیں۔ جو پیر یا فقیر تھوڑا بہت پڑھے لکھے ہیں ان کی باتیں سن کر سر پھوڑنے کو دل چاہتا ہے۔ درحقیقت ان کی باتوں اور قصے کہانیوں نے

جتنا نقصان دین کو پہنچایا ہے اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ان پیروں کی تعلیم میں سب سے پہلے یہ پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے کہ طریقت شریعت سے بالکل الگ چیز ہے اور اس میں ایسے ایسے راز کی باتیں ہیں کہ اگر کسی نااہل کو بتادی جائیں تو وہ کافر ہو جائے۔واہ کیا اچھا علم ہے کہ اگر اس کے اسرار و اغراض کسی کو بتا دیے جائیں تو اس کا ایمان کامل ہونے کی بجائے الٹا خراب ہو جاتا ہے۔کوئی ان بھلے مانسوں سے پوچھے کہ پھر ایسا علم کوئی مسلمان کیوں سیکھے جس کے حقائق مومن کو کافر بنا دیتے ہیں۔استغفر اللہ۔یہ باتیں آج کل کے جاہل صوفی اور ملنگ وغیرہ ہی نہیں کرتے پرانے زمانہ کے بزرگوں میں سے بھی اکثر یہی کچھ کہہ گئے ہیں۔یقین نہ آئے تو تصوف کی مشہور و معروف کتابیں اٹھا کر پڑھ لیجیے۔لائیے میں آپ کو ایک قصہ سناؤں جو میں نے اکثر صوفیوں کی زبانی سنا اور بعض کتابوں میں بھی پڑھا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ فقیری لاکھوں' کروڑوں آدمیوں میں سے کسی ایک کو ملتی ہے۔لیکن جب مل جاتی ہے تو کسی طرح ضائع نہیں ہوتی۔خواہ وہ فقیر زنا کرے' شراب پیے' حرام کھائے' چوری یا قتل کرے۔چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ جناب بہاءالدینؒ اپنے بالاخانہ کی کھڑکی میں بیٹھے تھے۔نیچے سڑک پر ایک کنواں تھا۔اتفاقاً ایک آدمی اس میں گر گیا۔سارے محلے میں شور مچ گیا اور لوگ اسے نکالنے کو دوڑے۔یہ لوگ ابھی نزدیک بھی نہ آنے پائے تھے کہ حضرت بہاءالدینؒ نے بالاخانہ پر بیٹھے بیٹھے وہیں سے کنویں میں ہاتھ ڈال کر اس آدمی کو باہر نکال لیا۔یہ دیکھ کر شور ہوا اور لوگ ان کی اس کرامت کی تعریف کرنے لگے۔ایک گدڑی پوش فقیر وہاں سے گزر رہا تھا یہ کیفیت دیکھ کر حضرت بہاءالدینؒ سے کہنے لگا:''صاحبزادے یہ تو بھان متی کا کرتب ہے فقیری نہیں ہے۔''حضرت صاحب نے جب سنا تو بالاخانہ سے نیچے اترے اور فقیر کے پاس پہنچ کر پوچھا کہ ''بابا اگر یہ بھی فقیری نہیں تو پھر فقیری کیا ہے؟'' فقیر نے جواب دیا:''فقیری یہ ہے کہ نہ شراب سے ضائع ہو' نہ زنا سے جائے' نہ حرام کھانے سے اس میں کوئی نقص آئے۔''یہ کہہ کر فقیر تو چلا گیا اور آپ یہ سوچتے ہوئے گھر آئے کہ اس کو آزمانا چاہیے کہ جیسا کہتا ہے ایسا ہی ہے یا یونہی زٹل مارتا ہے۔چنانچہ دو تین دن بعد آپ

نے ایک کتا کٹوا کر اس کا پلاؤ پکوایا' ایک شراب کی بوتل خریدی اور اپنی لونڈی سے کہا کہ اچھے کپڑے پہن اور خوب بن ٹھن کر یہ پلاؤ اور شراب کی بوتل لے کر دریا پار فلاں جگہ اس نام کا فقیر رہتا ہے اس کے پاس جا اور یہ شراب اور پلاؤ اس کو دے آ ؤ ۔ اور اگر وہ تجھ سے بھی کوئی ارادہ کرے تو انکار نہ کرنا ۔ چنانچہ لونڈی فقیر کی خدمت میں حاضر ہوئی ۔ فقیر نے پلاؤ کھایا، شراب پی اور لونڈی سے بھی متمتع ہوا ۔ پھر لونڈی سے کہا کہ جا بہاء الدین e سے کہہ دینا کہ شراب' کتے کے پلاؤ اور کنیز کی قربت سے کہیں فقیری جاتی ہے ۔ لونڈی نے آ کر یہ ماجرہ سنایا تو حضرت بہاء الدینؒ اس کے کشف پر حیران رہ گئے ۔ خود اس سے ملنے کا ارادہ کیا اور ایک دن گھوڑی پر سوار ہو کر اس کی ملاقات کو گئے ۔ راستہ میں دریا تھا ۔ جب بیچ دریا میں پہنچے تو گھوڑی نے پیشاب کر دیا ۔ فقیر جو دوسرے کنارے سے دیکھ رہا تھا چلایا کہ ''صاحبزادے یہ کیا کیا' تمہاری گھوڑی نے تو سارا دریا ناپاک کر دیا ۔ اب مخلوق خدا پانی کہاں سے پئے گی'' حضرت صاحب نے جواب دیا کہ ''واہ بابا تم تو فقہ کے معمولی مسائل سے بھی واقف نہیں ۔ دریا بھی کہیں گھوڑے کے پیشاب سے ناپاک ہوتا ہے ۔'' فقیر نے کہا: ''جب اتنا سا دریا پیشاب سے ناپاک نہیں ہوتا تو معرفت کا دریائے زخار اور بحر نا پیدا کنار ذرا سی شراب' کتے کے پلاؤ اور زنا سے کس طرح ناپاک ہو سکتا ہے ۔''

سنا آپ نے یہ ہے وہ تصوف جس کی تعلیم یہ جاہل صوفی اور پیر لوگوں کو دیتے ہیں اور یہی ہیں وہ راز درون پردہ کہ اگر کسی مومن کو بتا دیئے جائیں تو وہ کافر ہو جائے ۔ یہ ایک حکایت تو میں نے آپ کو نمونے کے طور پر سنائی ہے ایسی ایک دو نہیں' دس بیس نہیں' سو دو سو نہیں' ہزاروں کہانیاں ان صوفیوں میں مشہور ہیں اور مشہور ہی نہیں تصوف کی اکثر کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جن کو لوگ خوب چٹخارے لے لے کر پڑھتے اور جھوم جھوم کر دوسروں کو سناتے ہیں ۔ صرف یہی نہیں ان کم بختوں نے تو ہمارے حضور سرور کائنات a کے متعلق بھی ایسے ایسے قصے گھڑ رکھے ہیں اور ایسے ایسے گندے شعر لکھے ہیں کہ پڑھ کر دل کانپتا اور روح لرزتی ہے ۔ مجھے ایسی بہت سی چیزیں اور شعر یاد ہیں مگر بہ لحاظ پاس و ادب لکھتا نہیں

چاہتا۔ میرے خیال میں تو کسی بھی مسلمان کی آنکھ ایسی باتیں پڑھنے کے لیے کھلی نہیں رہ سکتی اور کسی بھی مومن کے کان یہ خرافات سننے کی تاب نہیں لا سکتے۔

اچھا تو اب حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی جو میں نے آپ کو سنائی بالکل غلط' لغو اور جناب حضرت بہاء الدینؒ کی ذات گرامی پر ایک کھلا بہتان بلکہ رکیک حملہ ہے۔ آپ کی ذات مبارک ان لغویات سے بہت ارفع و اعلیٰ تھی۔ آپ کا علم' آپ کا تقویٰ اور آپ کی پاک بازی کے ہزاروں ثبوت موجود ہیں اور آپ کے متعلق یہ گمان کہ آپ نے شراب خریدی' کتے کا پلاؤ پکوایا اور اپنی کنیز کو اس فقیر کے پاس بھیجا کوئی نہایت ہی جاہل' عقل سے عاری اور دنی الطبع آدمی ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے بزرگوں خصوصاً جناب غوث الاعظمؒ کے متعلق ہزاروں قصے مشہور ہیں جو سب غلط اور سراپا لغو ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح زندیقوں کی ایک منظم جماعت جھوٹی حدیثیں گھڑ کر اسلام کی ظاہری تعلیم کو خراب کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے اسی طرح صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے نام سے بھی یہ سب قصے کسی خاص سازش کے ماتحت منظم طور پر گھڑے اور بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے کوئی سلیم الطبع آدمی جس کو دین اسلام سے ذرا سی بھی واقفیت ہے ان پر یقین نہیں کر سکتا۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ جب قرآن' احادیث اور حضور اکرمؐ کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے تو پھر مسلمان ان جاہل اور گمراہ صوفیوں کے معتقد کیوں ہو جاتے ہیں؟ تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ عام مسلمان جاہل ہیں' ان کو نہ قرآن کی خبر ہے' نہ احادیث کی' نہ وہ حضور اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ سے واقف ہیں۔ دوسری وجہ قوم کی غربت و افلاس ہے' لوگ مفلسی اور غریبی کی وجہ سے بلند عزائم اور اعلیٰ کردار سے عاری ہو چکے ہیں۔ وہ حرام حلال اور جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی مراد پوری ہو جائے خواہ جائز طریقے سے ہو یا ناجائز سے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا عقیدہ یہ ہے کہ فقراء کو مافوق الفطرت طاقتیں حاصل ہوتی ہیں اور وہ انسان کی ہر مراد پوری کر سکتے ہیں۔

تیسری وجہ (اور سب سے بڑی وجہ) یہ ہے کہ وہ ان مجذوبوں' ملنگوں اور غیر شرعی

فقیروں سے کرامتیں بھی سرزد ہوتی دیکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ عوام متشرع اور غیر متشرع کا لحاظ کیے بغیر ہر فقیر کے پاس چلے جاتے ہیں۔ اس تمام قضیہ میں سب سے عجیب وحیران کن یہی کرامات ہیں۔ جاہل اور بے پڑھے لکھے تو رہے ایک طرف بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور عالم و فاضل جب ان فقیروں سے کرامات صادر ہوتی دیکھتے ہیں تو ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک ایسا معمہ ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ فقراء جھوٹے اور گمراہ ہیں تو ان سے کرامتیں کیوں ظہور میں آتی ہیں میں خود پچیس تیس برس سخت حیران و پریشان رہا۔ میری سمجھ میں کسی طرح بھی نہ آتا تھا کہ جب یہ لوگ طہارت' عبادت' اخلاق اور ہر اچھی چیز سے کورے ہیں تو پھر ان سے کرامتیں کیوں صادر ہوتی ہیں۔ لیکن آخر کار جب حقیقت سمجھ میں آئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو بہت ہی معمولی بات ہے۔

کرامات اور کشف کی حقیقت:

دراصل قصہ یہ ہے کہ تصوف اور روحانی طاقت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہر وہ آدمی جو کرامتیں دکھائے ضروری نہیں کہ صوفی بھی ہو لیکن ہر کامل صوفی میں کرامات دکھانے کی طاقت ضرور ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کرامات دکھائے نہ دکھائے۔ تصوف کا مقصد جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اللہ اور مبداء و معاد کی حقیقت معلوم کرنا ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کا راستہ نیکی' پارسائی و پاکبازی' تزکیہ اخلاق اور تصفیہ قلب ہے۔ لیکن روحانی طاقت حاصل کرنے کا مقصد صرف خرق عادات یعنی کرامات کا حصول ہے اور اس کے لیے کسی خاص نیکی' پارسائی' اخلاق حسنہ اور عبادت کی ضرورت نہیں۔ یہ طاقت تو ایسی چند مشقوں اور ریاضتوں سے پیدا ہو سکتی ہے جیسی کہ ہندوؤں کے یوگ میں کی جاتی ہیں۔ اس طاقت کو حاصل کرنے کے لیے صرف دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک ارتکاز خیال (Concentration) دوسری قوت ارادی (Will Power) یہ دو باتیں جس کسی میں بھی کمال کے درجے تک پیدا ہو جائیں اسی سے کرامتیں سرزد ہونے لگتی ہیں اور یہ دو

باتیں چند خاص مشقوں سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

زیادہ آسانی سے سمجھانے کے لیے آپ کو مسمریزم اور ہپناٹزم کا حوالہ دیتا ہوں۔آپ لوگوں میں سے جس نے بھی کسی اچھے مسمرائزر یا ہپناٹسٹ کے کمالات دیکھے ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ کیسے عجیب عجیب کرتب دکھا سکتے ہیں۔ایک معمولی سا کرتب تو یہ ہے کہ کسی کمزور قوت ارادی والے بچے پر اپنی قوت ارادی سے غنودگی یا نیند طاری کر دیتے ہیں جو اصطلاح میں قوت مقناطیسی کہلاتی ہے۔جب ان کا معمول بے ہوش ہو جاتا ہے (یا سو جاتا ہے) تو اس سے طرح طرح کے سوال کرتے ہیں اور وہ ہر سوال کا بالکل صحیح جواب دیتا ہے۔لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ معمول صرف انہی باتوں کے صحیح جواب دے سکتا ہے جو عامل یعنی مسمریزم کرنے والا خود جانتا ہو اس کے علاوہ یہ لوگ اکثر امراض کا علاج بھی کرتے ہیں جو روحانی طریقہ علاج کہلاتا ہے۔یہ مرض کو اپنی قوت ارادی سے سلب کر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ علاج آج کل یورپ میں بہت مقبول ہوتا جا رہا ہے۔بڑے بڑے فلاسفر اور سائنسدان ہپناٹزم کی اس طاقت سے حیران ہیں۔حتیٰ کہ امریکہ کے مشہور زمانہ فلاسفر ولیم جیمز نے اپنی تحریروں میں جابجا اس طریقہ علاج کا بڑی شد و مد سے ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ یہ ہپناٹسٹ اور بھی کئی کمالات دکھاتے ہیں۔مثلاً Transformation of thoughts (انتقال خیال اپنے دماغ سے دوسرے کے دماغ میں) خواہ وہ آدمی نزدیک اور سامنے ہو یا دور کہیں فاصلے پر ہو اسی کو ٹیلی پیتھی بھی کہتے ہیں۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ یہ ہپناٹسٹ مادی ٹھوس چیزوں کی طرف نظر جما کر اشارہ کرتے ہیں اور وہ چیزیں ان کی طرف سرکنے لگتی ہیں۔مگر یہ عمل زیادہ وزنی چیزوں پر نہیں کر سکتے صرف ہلکی پھلکی چیزوں پر کر سکتے ہیں۔مثلاً قلم، پنسل، ماچس بکس اور گلاس وغیرہ۔مسمریزم اور ہپناٹزم کی طاقت زیادہ ہو جائے تو آدمی مردوں کی روحوں کو دیکھنے اور بلانے پر بھی قادر ہو جاتا ہے۔بعض اشخاص میں یہ طاقت قدرتی اور پیدائشی ہوتی ہے یہ لوگ اصطلاح میں Medium کہلاتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں بہت سی جماعتیں ہیں جو یہی کام کرتی ہیں یہ جماعتیں

Spiritual socities کہلاتی ہیں۔لوگ مرے ہوئے انسانوں کی روحوں کو بلا لیتے ہیں اوران سے طرح طرح کےسوالات کر کے بڑی اہم معلومات حاصل کرتے ہیں۔ لوگوں کوان کےرشتہ داروں کی روحوں سے ملاتے ہیں'روحوں کےفوٹو لیتے ہیں'ڈاکٹروں کی روحوں کوبلاکر بیماروں کےامراض'تشخیص اوردوا تجویز کراتے ہیں۔ ہمارے ہاں مشرق میں بھی ایک ایسا ہی علم موجودتھا جو حاضرات کہلاتا تھا۔اب اس کےجاننے والےمفقود ہیں۔ البتہ دھوکے باز مدعی بہت ہیں جوطرح طرح سےلوگوں کوفریب دےکران کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

الغرض یہ علوم ہیں جوخاص طریقوں پرعمل کرنے سے ہرآدمی کوحاصل ہوسکتے ہیں۔مگر تصوف سےان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔نہ ان کے لیے کسی خاص پارسائی'تقویٰ اورعبادت و عقائدکی ضرورت ہے۔ ہمارےاکثر پیراورفقیربھی مخصوص مشقیں کرکے یہ طاقتیں حاصل کر لیتے ہیں اورعوام پراپنی ولایت کارعب ڈالتے ہیں۔ میں بذات خودایسے کئی مشہور پیروں سےواقف ہوں۔ ہمارےان پیروں اوریورپ کےلوگوں میں یہ فرق ہے کہ یورپ والے یہ سب کچھ بدرجہ کمال حاصل کرنے کے باوجودولایت کا دعویٰ نہیں کرتے۔اپنے آپ کو Spiritulist ہی کہتےاورظاہرکرتے ہیں اورہمارےہاں ہروہ شخص جس میں تھوڑی سی بھی یہ طاقت پیدا ہوجائے وہ ولایت سےادھرتو رکتا ہی نہیں۔بس چلےتو نبوت کا دعویٰ بھی کر بیٹھے۔

میرےخیال میں متذکرہ صدربیانات سےان کرامات کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہوگی اب میں کچھ تھوڑا ساحال کشف کابھی بیان کیےدیتا ہوں۔دراصل گزشتہ یا آئندہ واقعات کومعلوم کرنے کی جستجوانسان کوشایدابتدائے آفرینش ہی سے رہی ہے۔چنانچہ عہد عتیق میں ایسے کئی علوم پیدا ہوئے اورآج تک موجود ہیں جوانسان کا ماضی یا مستقبل بتاسکتے ہیں۔ان میں سےنجوم'رمل'جفر'علم قیافہ اورعلم الید بہت مشہور ہیں۔

اب ہمارےجعلی پیروں میں سےاکثرایسے ہوتے ہیں جوان میں سےکسی علم خصوصاً

نجوم میں مہارت تامہ حاصل کر لیتے ہیں۔اب جو کوئی ان سے ملنے آتا ہےتو وقت اور ساعت دیکھ کرا ور کبھی کبھی اس کا نام معلوم کر کے نجوم کے ذریعہ اس کی دو چار گزشتہ باتیں بتا دیتے ہیں اور سننے والا لامحالہ ان کا معتقد ہو جاتا ہے۔اس کے بعد پیر صاحب مستقبل کے متعلق جو کچھ بھی بتائیں خواہ وہ غلط ہو یا صحیح وہ شخص خواہ مخواہ یقین کر لیتا ہے۔بعض آدمی جو ستارہ سہیل کی ساعت میں پیدا ہوتے ہیں ان میں یہ طاقت فطرتی ہوتی ہے جو کچھ ان کے منہ سے نکل جاتا ہے اکثر صحیح ہوتا ہے بعض پیر نفسیات اور قیافہ کی مدد سے دو چار اگلی پچھلی باتیں بتا دیتے ہیں۔بعض نہایت چالاک لوگ جو ہپناٹزم میں اچھی طرح مہارت رکھتے ہیں یہ چالاکی کرتے ہیں کہ اپنی قوت ارادی سے سائل کے دل میں کوئی سوال خود ہی پیدا کر دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ تمہارے دل میں یہ خیال یا یہ سوال ہے اب وہ بے چارہ معتقد نہ ہو تو کیا ہو۔یہ تو تھیں عقل والوں اور سیانوں کی باتیں کشف تو پاگلوں اور مجذوبوں کو بھی ہوتا ہے اور بہت زیادہ ہوتا ہے یہ بھی پچھلی اور اگلی باتیں بتا دیتے ہیں۔

میرے مشاہدے میں اس سے بھی زیادہ حیران کن باتیں آئی ہیں میں نے ایک چھ سال کی لڑکی کو دیکھا جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ اس کے سر پر جن آتا ہے۔اس لڑکی پر جب دورہ پڑتا اور وہ نیم بے ہوش ہو جاتی تھی تو اکثر سوالات کا بالکل صحیح جواب دے دیتی تھی۔سب سے عجیب بات یہ تھی کہ آپ جہاں سے کہیں وہیں سے قرآن شریف سنانا شروع کر دیتی اور رکوع پر رکوع سناتی چلی جاتی حالانکہ وہ الف بے تے بھی نہیں جانتی تھی۔اسی طرح میں نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکا دیکھا کہ اس پر جب اسی قسم کا دورہ پڑتا تو انگریزی میں فصیح و بلیغ تقریر کرنے لگتا۔

الغرض!جس کو تحقیق کا شوق ہو اور وہ تفتیش و تفحص کرے تو ایسے کئی واقعات بچشم خود دیکھ سکتا ہے۔لیکن مصیبت یہ ہے ان باتوں کی نفسیاتی وجہ نہ تو کسی ماہر نفسیات کو معلوم ہے نہ کوئی فلاسفر، سائنسدان یا عالم دین جانتا ہے نہ ہمارے صوفیاء اور اولیائے کرام ہی نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔میں نے بھی تکمیل فقر کے بعد سالہا سال اس

کی تحقیق پر صرف کیے مگر کامیابی نہ ہوئی ۔لیکن جوئندہ یابندہ جب نیوٹن پر کشش ثقل کا راز منکشف ہوسکتا ہے تو میں کیوں محروم رہتا ۔اللہ تبارک وتعالٰی نے محض اپنے فضل وکرم سے اس کا کچھ راز مجھ پر منکشف کر دیا جو میں آپ کو بھی بتائے دیتا ہوں لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لیتا کہ آپ سمجھ بھی جائیں گے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک بہت ہی عجیب وغریب مخلوق ہے اور اس میں ایسی ایسی مادی' ملکوتی' جبروتی اور لاہوتی طاقتیں پنہاں ہیں جو خود اس کی سمجھ میں نہیں آتیں ۔ان میں سے کچھ طاقتیں تو ظاہر ہو چکی ہیں کچھ ہو رہی ہیں اور کچھ آئندہ ہوں گی اور ممکن ہے کہ کچھ طاقتیں قیامت کے دن ہی ظاہر ہوں ۔یوں تو انسانی جسم کا ایک ایک عضو' ایک ایک رگ' بلکہ ایک ایک ذرہ کرشمہ قدرت کا طلسمات خانہ ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب اس کا دماغ ہے ۔انسان سے جتنے بھی نوادرات ظاہر ہوتے ہیں ان سب کا ماخذ دماغ ہی ہے ۔ماہرین نفسیات نے اگرچہ انسانی دماغ کی مادی ساخت کے متعلق بہت کچھ علم حاصل کرلیا ہے لیکن وہ غیر مادی قوتیں جو ظہور پذیر ہو کر اس کے ارادے اور تخیل کو وجود ظاہری یا مادی بخشتی ہیں ان کا مکمل حال نہ اب تک کسی فلاسفر کو معلوم ہوسکا ہے نہ کسی ماہر نفسیات کو۔ان میں سے خاص خاص قوتیں یہ ہیں:

ارادہ' خیال' تصور' احساس' حزن ومسرت اور وہ کوائف جن کا تجربہ صرف شاعروں' مفکروں اور اولیاء اللہ کو ہوتا ہے ۔فلسفہ میں ان کو Mind یا ذہن کی قوتیں کہتے ہیں ۔تصوف میں ان کا نام لطائف ہے ۔مگر تصوف میں کچھ اور لطیفے بھی ہیں جیسے قلب' سر' خفی' اخفیٰ' نفس' عقل اور روح ان کے علاوہ چند اور لطیفے بھی ہیں جن کے لیے ابھی تک کسی زبان میں کوئی نام نہیں ہے ۔ایک کامل صوفی ان سب کی حقیقت اور ماہیت کو کم وبیش ضرور جانتا ہے اور جب تک ان سب کا تھوڑا بہت علم نہ ہو کشف وکرامات کے صدور کی اصل حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکتی ۔اس چھوٹے سے خطبہ اور ذرا سے وقت میں ان سب کی پوری تفصیل بیان کرنا تو ناممکن ہے ۔صرف اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ جیسا کہ ماہرین نفسیات کہتے ہیں انسانی دماغ کے دو حصے ہیں ایک شعور سے متعلق ہے دوسرا لاشعور سے (شعور کیا ہے اور لاشعور کیا ۔یہ بات

بھی بہت وضاحت طلب ہے لیکن یہاں اس کی بھی گنجائش نہیں) اب ہوتا یہ ہے کہ جب شعور غائب یا فنا ہو جاتا ہے یعنی جب حواس ظاہری کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو لاشعور جاگ اٹھتا ہے اور اس کا تعلق عالم روحانی یعنی طبقات ملکوت، جبروت، لاہوت، ہاہوت اور ہو وغیرہ سے قائم ہو جاتا ہے۔

اب جاننا چاہیے کہ جو واقعات اس عالم مادی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ان سب کی تحریک اور روحانی تعمیر عالم قضا و قدر میں ہوتی ہے اور وہاں سے متذکرہ بالا عوالم میں تنزل کرتی ہوئی اس عالم مادی میں ظہور پذیر اور متشکل ہو کر ظاہری حواس کے ذریعہ انسان کے علم میں آتی ہے۔ اس لیے جس آدمی کا لاشعور بیدار رہونے کی وجہ سے ان عوالم سے متعلق ہوتا ہے آئندہ ہونے والے کچھ واقعات اس کے لاشعور پر منعکس ہو جاتے ہیں اور ایک کیفیت بے خودی میں اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ فلاں بات ہونے والی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس شخص کو تمام عالم روحانی کا ہر واقعہ یا ہر بات معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس کی روح کو اپنے جس قدر ماحول کا علم ہوتا ہے صرف اتنے ہی حصہ میں سے تنزل کرنے والے واقعات معلوم ہو سکتے ہیں اور یہ امر کہ کسی روح کا ماحول کتنا وسیع ہے اس کی لطافت اور طاقت پر منحصر ہے۔

الغرض! اس طرح وہ باتیں جو اس دنیا میں کچھ وقت بعد ظاہر ہونے والی ہیں اس کو پہلے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ یہی کشف کہلاتا ہے۔ پاگلوں اور مجذوبوں سے جو کشف کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کا سبب بھی یہی ہے کہ ان کے حواس ظاہری معطل اور لاشعور بیدار ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا لاشعور ہر وقت ہی بیدار رہتا ہے۔ ہرگز نہیں صرف کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے اوپر جو واقعہ قرآن پڑھنے والی لڑکی اور انگریزی بولنے والے لڑکے کا بیان کیا گیا ہے اس کی توضیح بھی یہی ہے چونکہ یہ لڑکی اور لڑکا اس وقت عالم بے ہوشی میں ہوتے تھے اور ان کے ظاہری حواس معطل ہو جاتے تھے اس لیے ان کا لاشعور جاگ اٹھتا تھا۔ اس حالت میں اس لڑکی کی روح کا تعلق کسی مردہ یا زندہ حافظ قرآن کی روح سے عارضی طور پر قائم ہو جاتا تھا اور وہ قرآن پڑھنے لگتی تھی۔ اسی طرح لڑکے کی روح کسی انگریزی خواں کی روح

سے پیوستہ ہو جاتی تھی اور وہ انگریزی بولنے لگتا تھا۔

یہ باتیں میں نے اپنی طرف سے تو نہایت آسان اور سادہ زبان میں زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ہمارے حلقہ کے ان چند حضرات کو چھوڑ کر جنہوں نے تعمیر ملت کو بہت غور وخوض سے پڑھا اور سمجھا ہے اور کسی کی سمجھ میں اچھی طرح نہ آئی ہوں گی۔ اس معاملہ میں میں مجبور محض اور معذور ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ روحانیت کے متعلق جتنی چیزوں کا حال ہم کو بیان کرنا پڑتا ہے ان کی نہ تو کوئی مثال اس عالم مادی میں موجود ہے نہ ہماری کسی زبان میں ان کے کما حقہ اظہار کے لیے مناسب الفاظ موجود ہیں۔ پڑھنے یا سننے سے یہ حقیقت ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کسی نے خوب کہا ہے:

محبت سمجھی جا سکتی ہے سمجھائی نہیں جاتی

بالکل یہی بات لطائف روحانی پر بھی صادق آتی ہے اور سچ پوچھو تو محبت بھی ایک لطیفہ روحانی ہے۔ اس وقت مجھے حضرت مولانا رومؒ کا ایک شعر یاد آیا۔ فرماتے ہیں:

چشم بند و گوش بند و لب بند

گر نہ بینی سر حق بر من بہ خند

یعنی آنکھ منہ اور کان بند کر لے اگر اس پر بھی راز حق تجھ کو معلوم نہ ہو سکے تو جتنا دل چاہے میرا مذاق اڑانا۔ یہاں آنکھ منہ اور کان بند کرنے سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہاتھوں سے ان کو بند کر لو۔ آنکھوں پر پٹی باندھ لو، کانوں میں روئی ٹھونس لو ہونٹوں کو گوند سے چپکا لو جیسا کہ ہمارے بہت سے سالک کیا کرتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کامل نفی کرنا سیکھو تاکہ تمہارے یہ حواس معطل ہو جائیں اور تم عالم روحانی کے اسرار ربانی کا مشاہدہ کر سکو۔

امید ہے کہ اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ کشف وکرامات کے صدور کا اصل سبب کیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہو تب بھی اتنا یقین تو ضرور آ گیا ہوگا کہ صرف کشف وکرامات کی وجہ سے کسی کو ولی اللہ ہرگز نہ ماننا چاہیے۔ اولیاء اللہ میں بھی یہ طاقت ارتکاز خیال اور قوت ارادی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان کا طریقہ کار کچھ اور ہوتا

ہے اور جتنی یہ طاقت ان میں ہوتی ہے' نہ کسی مسمرائزر اور ہپناٹسٹ میں ہوتی ہے' نہ کسی یوگی اور جوگی میں۔ان کے لیے یہ سب کچھ بہت معمولی باتیں ہیں اور ان میں یہ طاقت بالکل ابتدا ہی میں پیدا ہو جاتی ہے۔لیکن ان کا مقصود چونکہ اللہ کی معرفت ہے اس لیے وہ اپنا وقت ان پر خراب نہیں کرتے۔تصوف کے جو مبتدی اس طاقت پر نازاں ہو کر یہ تماشے دکھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے نامراد رہ جاتے ہیں۔عوام چونکہ کراموں کے بہت معتقد ہوتے ہیں اس لیے پہلے زمانے کے اولیاء لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے کرامتیں دکھایا کرتے تھے۔لیکن اس زمانہ میں سائنسی ایجادات و اکتشافات کی وجہ سے چھوٹی موٹی کراموں کی کوئی قدر اہل علم کی نظر میں نہیں ہے وہ ان باتوں کو شعبدہ بازی سمجھتے ہیں۔مثلاً ان سے کہو کہ فلاں بزرگ ہوا میں اڑ سکتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ وہ تو اکیلا ہی اڑتا ہے ہمارے ہوائی جہاز تو سینکڑوں آدمیوں اور ہزاروں من بوجھ کو اڑا لے جاتے ہیں۔

میں نے ایک انگریز سے کہا کہ ہمارے اولیاء اللہ اپنی آواز ہزاروں میل دور پہنچا سکتے ہیں تو وہ کہنے لگا کہ یہ تو کوئی بات نہیں۔ہمارے وائرلیس تو ہماری آواز ستاروں تک پہنچاتے اور وہاں کی آوازیں سن سکتے ہیں۔''اسی طرح ایک دفعہ ایک مجلس میں ذکر آیا کہ فلاں بزرگ پانی پر اس طرح چلتے تھے کہ جیسے ہم خشکی پر چلتے ہیں۔''تو ایک دوست بولے کہ''وہ تو اکیلے ہی دریا پار کرتے تھے۔ایک ہندو سیٹھ اس دریا پر پل بنوا دے اور روزانہ ہزاروں آدمی اور لاکھوں من بوجھ پل کے ذریعہ دریا پار کر جائے تو معاشرہ کے لیے کون زیادہ مفید اور زیادہ قابل قدر رہے۔وہ بزرگ جو اکیلا دریا کو پار کرتا ہے یا وہ ہندو جس کی وجہ سے خلق خدا کو اتنا آرام ملتا ہے۔''قصہ مختصر مغربی تعلیم یافتہ کرامات وغیرہ کی کوئی خاص قدر نہیں کرتے۔آج کل تو علم و عمل کا زمانہ ہے اور یہ لوگ پر کیف و سکون اور راحت و مسرت سے بھرپور زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔لیکن یہ دولت حصول روحانیت کے بغیر میسر نہیں آ سکتی۔لہٰذا ان کو تصوف کی وہ اعلیٰ تعلیم دینی چاہیے جو کشف و کرامات کی شعبدہ بازی سے بلند

وبرتر ہواوران کی دنیا کو جنت بنادے۔

سُکری اور صحوی تصوف:

پچھلے سال کے خطبہ میں میں نے بتایا تھا کہ تصوف کی دوقسمیں ہیں۔ایک سکری دوسری صحوی آج میں ان دونوں کی کچھ تشریح کروں گا۔دراصل طریقت کی بے شمار منزلیں طے کر کے عرفان ذات باری تعالیٰ تک پہنچنے کے صرف دو راستے ہیں ایک راستہ عشق کا ہے جو جذب کہلاتا ہے دوسری عبادت وتقویٰ کا ہے جس کو سلوک کہتے ہیں (آج کل دونوں طریقوں کے لیے ایک لفظ ''سلوک'' ہی استعمال ہوتا ہے۔)

جذب سے انسان پر ایک ایسا نشہ طاری ہوتا ہے اور ایسی بے خودی پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات گھنٹوں تک اپنے وجود کا بھی ہوش نہیں رہتا۔لیکن سلوک میں نشہ ہوتا ہے نہ بے خودی۔سلوک کے طریقہ سے انسان ایک مدت دراز میں مقصود تک پہنچتا ہے لیکن جذب کی راہ سے صرف چند ماہ یا چند سال میں وہ گوہر مقصود پالیتا ہے۔جذب کے راستہ کو راہ قلندری بھی کہتے ہیں۔عراقی نے مندرجہ ذیل شعر میں اسی راہ کی طلب ظاہر کی ہے۔کہتا ہے:

> خمارہ قلندر سزد ار بہ من نمائی
> کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

اس سے یہ نہ سمجھنا کہ جذب کے راستے میں شریعت اور نماز روزہ لازم ہی نہیں ہے۔صرف اتنی بات ہے کہ کامل بے خودی کی وجہ سے بعض اوقات نماز قضا ہو جاتی ہے تو وہ بعد میں ادا کر لینی چاہیے۔صحیح اور آسان ترین راستہ یہی ہے کہ انسان شریعت کے راستہ پر عشق کے براق پر سفر کرے۔سلسلہ توحیدیہ کی تعلیم یہی ہے۔

سلسلہ توحیدیہ کے جن اصحاب نے سلسلہ کی تعلیم پر باقاعدہ عمل کیا وہ اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ اللہ اللہ شروع کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد قلب میں ہلکا ہلکا سوز اور سرور پیدا ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ ایسا نشہ اور بے خودی پیدا ہوتی ہے جس کا مقابلہ دنیا

کی کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس بے خودی میں ایسا کیف ومزہ ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کے رنج والم کو بھول کر اسی کا ہو رہتا ہے۔ لیکن یہی کیفیت وجذب اگر زیادہ بڑھ جائے تو انسان کی عقل جاتی رہتی ہے اور وہ ایسا مجذوب بن جاتا ہے جیسے کہ ہمارے شہروں اور قصبات میں ہر جگہ لنگوٹی باندھے یا بالکل برہنہ پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے شیخ طریقت کا فرض ہے کہ وہ اپنے مریدوں کے حال پر نگاہ رکھے اور جذب کو حد سے نہ بڑھنے دے۔ جذب کی اس کیفیت میں انسان کا دل مطلق نہیں چاہتا کہ کوئی کام کرے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کہ گوشہ تنہائی میں پڑا اسی کے مزے لوٹتا رہے۔ نہ اس کو فقر وفاقہ کی پرواہ ہوتی ہے نہ بال بچوں کے حقوق وفرائض ادا کرنے کا خیال۔

ظاہر ہے کہ ایسے آدمیوں کی دنیا تباہ ہو جاتی ہے اور وہ معاشرہ پر ایک بار گراں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو پاکستان کے طول وعرض میں جگہ جگہ اڈے جمائے پڑے ہیں۔ چونکہ بے خودی کے عالم میں کرامات بہت ظاہر ہوتی ہیں اس لیے دنیا والے عمل اور شرع سب کچھ چھوڑ کر انہی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ذرا سی مشکل پیش آئے کوشش وسعی سے اس کو دور کرنے کی بجائے سیدھے پیر صاحب یا سائیں بابا کے پاس دوڑے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف تو عمل سے عاری ہو جاتے ہیں دوسری طرف خدا اور رسول a سے بھی غافل رہتے ہیں ان کو ہر بات کے لیے صرف ''بابا'' یاد رہتا ہے۔ یہ ''بابا'' لوگ خود تو کچھ کرتے نہیں دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے ہیں کہ توکل کیے پڑے رہو تمہاری تقدیر کا حصہ تم تک خود بخود پہنچ جائے گا۔ یہ اور اسی قسم کے تمام فقیر سکری یعنی نشئی فقیر کہلاتے ہیں اور معاشرے کے لیے بے انتہا تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔

ان کے برخلاف وہ سالک ہیں جو ''جذب'' پر قابو رکھتے ہیں۔ دینی فرائض باقاعدہ ادا کرتے ہیں۔ دنیا کے بھی سارے کام محنت اور ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں۔ اپنے دنیوی فرائض کو جانتے ہیں اور بال بچوں' ماں باپ' عزیز واقارب' ہمسایوں اور شہریوں کے

تمام حقوق کما حقہ پورے کرتے ہیں ان کا کردار ایک شریف ٗ بہادر اور غیور انسان کا کردار ہوتا ہے۔ ان میں حوصلہ ٗ ہمت ٗ جرأت ٗ خود اعتمادی ٗ عمل ٗ یقین اور محبت وغیرہ جیسی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے عاشق زار ٗ حق آ گاہ و حق بین ٗ اول درجہ کے عقل مند ٗ فریس ٗ دانشور اور معاملہ فہم ہوتے ہیں ۔اس کے ساتھ ہی ان میں روحانی قوت بھی ہوتی ہے جس سے وہ لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں اگر ایسے لوگوں کی تعداد قوم میں دس فیصد بھی ہو تو وہ کبھی ذلیل و خوار نہیں ہو سکتی بلکہ دن رات ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔

الغرض! یہ ہے صحوی تصوف اور یہ ہیں وہ صحوی صوفی جو مردوں کو جگاتے اور جینے والوں کو پر لگا کر اڑاتے ہیں۔

میں نے خطبہ کے شروع میں کہا تھا کہ میں آپ کو بتاؤں گا کہ میں نے یہ نیا سلسلہ کس غرض سے قائم کیا ہے اور میں کیا چاہتا ہوں تو اب میں بتاتا ہوں کہ میں آپ کو صحوی تصوف سکھانا اور انسان کامل بنانا چاہتا ہوں۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حقائق کو چھوڑ کر کوائف میں کھو جائیں۔ دنیا کا کوئی کام نہ کریں۔ توکل کی چادر اوڑھے شراب معرفت کے نشہ میں مست پڑے کرامتیں دکھایا کریں۔ میں جس راستہ پر آپ کو چلانا چاہتا ہوں وہ بالکل ہمارے سرکار ابد قرار احمد مختار ﷺ کے نقش قدم پر جاتا ہے جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ملا لو۔ اگر میں کہیں غلطی پر ہوں تو مجھے آ گاہ کر دو۔ میں اپنے طریقے میں بڑی خوشی سے ترمیم کر لوں گا جو لوگ اس راستہ پر چلنا نہیں چاہتے ان کو چاہیے کہ حلقہ سے الگ ہو جائیں اور کسی ایسے سلسلہ میں شریک ہو جائیں جو ان کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہو۔

اچھا! آیئے اب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس حلقہ کو کامیاب فرمائے اور ہم سب کو صحیح معنوں میں حضور اکرم ﷺ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین! یا رب

العالمین۔

خادم الخدام
عبدالحکیم انصاری

لاہور، 19/اپریل 1963ء

خطبہ......3

10-4-1964

کو چھٹے سالانہ اجتماع پر بمقام لاہور ارشاد فرمایا

نحمده و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلۂ توحیدیہ..........السلام علیکم

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ پورے ایک سال بعد ہم سب پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا یہ اجتماع مطلق کسی دنیاوی غرض سے نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہاں اس خیال سے نہیں آیا کہ غریب ہے تو دولت مند بن جائے گا۔ بے اولاد ہے تو اولاد ہو جائے گی۔ بیمار ہے تو یہاں سے تندرست ہو کر جائے گا۔ یا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہے تو اس سے چھٹکارا مل جائے گا۔ نہ ہمارا یہ اجتماع کسی سیاسی، عمرانی یا اقتصادی غرض سے منعقد ہوا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر آپ لوگ یہاں کس لیے آئے ہیں؟ دور دراز مقامات سے سفر کی تکلیفیں برداشت کر کے، گھر کے سو کام چھوڑ کے، جیب سے پیسے خرچ کر کے آخر یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟

یہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی شخص بھی بغیر کسی مقصد کے نہ اتنی تکلیف اٹھاتا ہے نہ مالی طور پر زیر بار ہوتا ہے تو آپ کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہو گا۔ آخر وہ مقصد کیا ہے؟ آپ کو سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی صورتیں ہی اس کا جواب ہیں۔ خلوص اور محبت ایسی چیز نہیں جو چھپائے چھپ جائے۔ آپ کے چہروں سے خلوص کا رنگ جھلکتا ہے اور آنکھوں سے محبت کے فوارے پھوٹ رہے ہیں۔ یہی نہیں مجھے تو آپ کے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دے رہی ہیں اور ان دھڑکنوں میں جو نام آپ کے دل سے نکلتا اور عرش سے ٹکراتا ہے وہ بھی سنائی دے رہا ہے۔ وہ کیا نام ہے؟ بتاؤں۔ وہ نام ہے "اللہ" کیسا پاک نام ہے۔ کتنا پیارا نام ہے ہمارے خالق کا نام، ہمارے مالک کا نام، ہمارے محبوب کا نام۔ ہاں آپ کا جواب ہے "اللہ" یعنی آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم سب یہاں دلی خلوص اور محبت سے صرف "اللہ" کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ آیئے آیئے۔ میں آپ سب کو دل و جان سے خوش آمدید کہتا ہوں اور اسی اللہ سے جو آپ کا مقصود ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے مقاصد دلی میں کامیاب اور بامراد

فرمائے۔دین ودنیا کی دولتوں سے مالامال کرے۔اپنی راہ پراور زیادہ خلوص اور جوش سے چلنے کی توفیق دے۔اپنی اور اپنے محبوب ﷺ کی محبت کے نور سے آپ کے دلوں کو جگمگا دے۔آپ کی روحوں کو تڑپا دے۔ہمیشہ صراط مستقیم پر قائم رکھے اور اپنے پیارے رسول ﷺ کے صدقے یہ ہمت دے کہ آپ امت محمدیہ کی خدمت اور فلاح وبہبود کے لیے اپنی جان، اپنی روح، اپنے جسم کا ایک ایک ذرہ، اپنی ملکیت کا ایک ایک پیسہ اور اپنے خون کا ایک ایک قطرہ نچھاور کر دیں۔آمین یا رب العالمین۔

آیئے اب ہم اس اللہ کا شکر ادا کریں جس نے ہم سب کو ایک سال تک زندہ رکھا۔صحت دی اور ایک ایسے اجتماع میں شریک ہونے کے قابل کیا جس کی نظیر شاذونادر ہی کہیں مل سکتی ہے۔آپ نے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور شادی بیاہ کے کئی اجتماعات میں شرکت کی ہوگی۔اس لیے آپ اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ جو لطف وسرور یہاں آتا ہے اور جو سوزوساز اور کیف وگداز یہاں ملتا ہے اس کا عشرعشیر بھی کسی دنیوی محفل میں نہیں ملتا۔ایسا پاک ماحول کہاں میسر ہوتا ہے جہاں آنکھیں ہر طرح کی زشت وبدروئی کی طرف سے بے بصر، صرف حسن وخوبی کے جلوے دیکھتی ہیں۔جہاں کان ہر قسم کی لغو بیانی اور بدکلامی کی طرف سے بند، صرف نغمات لاہوتی اور اصوات سرمدی سنتے ہیں۔جہاں زبانیں ہر نوع کی بدگوئی اور غیبت وبہتان طرازی کی طرف سے گنگ، صرف حمدوثنا کے ترانے گاتی ہیں۔جہاں دل ودماغ ہر برے خیال، غصہ، نفرت، حسد، حرص وہوا اور عناد وفساد کے تمام ناپاک جذبات سے یکسر خالی، شراب عشق ومحبت کے نشہ میں چور، دیدار یار کی تمنا میں دنیا ومافیہا سے بالکل غافل وسرمست ہیں۔

الغرض!اس اجتماع میں ہر طرف خلوص ہی خلوص، پریم ہی پریم اور محبت ہی محبت ہے پھر ایسے اجتماع میں شرکت کی توفیق عطا کرنے والے رحیم وکریم آقا کا شکر ہم کیوں نہ ادا کریں۔حق تو یہ ہے کہ جتنا بھی شکر ادا کیا جائے اور جتنی بھی حمدوثنا کی جائے کم ہے۔

خدائے قادروقیوم کے شکر کے بعد میں اپنی اور تمام حلقہ توحیدیہ کی طرف سے ان برادران حلقہ لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہم کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ان میں سب سے پہلے

ہمارے شکریہ کے مستحق جناب میاں محمد علی صاحب ہیں۔ یہ صرف انہی کے خلوص ومحبت اور ایثار کا نتیجہ ہے کہ ہمارا اجتماع اس مرتبہ پھر لاہور میں ہو رہا ہے۔ میاں صاحب نے پچھلے سال بھی اجتماع کا تقریباً سارا بوجھ خود ہی اٹھایا تھا اور اس مرتبہ بھی ان کا یہی اصرار ہے کہ یہ سعادت صرف انہی کے حصہ میں آئے۔ ایسے پرخلوص اور ایثار مجسم انسان دنیا میں کہاں ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دین ودنیا کی ہر نعمت لازوال سے مالا مال فرمائے اور وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتے رہیں تاکہ خلق خدا کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ آمین

اجتماع کا انتظام اور اہتمام لاہور کے خادم حلقہ جناب محمد قاسم صاحب نے کیا ہے اور اس کے لیے اپنے کاروبار کو نظر انداز کر کے سخت محنت ومشقت سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور حلقہ کے ان تمام بھائیوں کو بھی اپنی عنایات بے پایاں سے نوازے اور دین ودنیا دونوں میں سرخرو فرمائے جنہوں نے انتظام واہتمام میں مدد دی اور قاسم صاحب کا ہاتھ بٹایا ہے۔ میں قاسم صاحب اور ان سب بھائیوں کا بھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان سب برادران حلقہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے سو کام چھوڑ کر اور سفر کی تکلیفیں اٹھا کر اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کی دلی مرادیں برلائے اور جو لوگ نہیں آئے یا نہیں آسکے ان پر بھی اپنے رحم وکرم کی بارش کرے۔ آمین

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ اصل خطبہ شروع کروں:

1962ء کے خطبے میں میں نے تصوف کے متعلق اپنے ذاتی تجربوں کا بیان کیا تھا اور 1963ء کے خطبے میں تصوف کی دو قسموں، تصوف سکری اور تصوف صحوی پر روشنی ڈالی تھی اور کشف وکرامات کی قدر وقیمت اور ان کے ظہور میں آنے کی نفسیاتی وجوہات کا ذکر بھی کیا تھا۔ آج کے خطبے میں آپ کو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تصوف کا انسان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ علم کیوں سیکھنا چاہیے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے بعد کیا کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تصوف کیا ہے۔ لیکن تصوف چونکہ مذہب کا حصہ ہے اس لیے جب تک مذہب کی اہمیت اور افادیت اچھی

طرح ذہن نشین نہ ہو جائے تصوف کی عظمت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔لہٰذا میں پہلے یہ بتاؤں گا کہ مذہب انسان کے لیے کیوں ضروری ہے۔

مذہب اور اس کی اہمیت:

یہ ایک ضابطہ حیات ہے۔ایک دستور اور آئین زندگی جو اللہ تعالیٰ نے انبیائے مرسلین کے توسل سے انسان کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔یہ ضابطہ حیات اللہ کی طرف سے ضمانت ہے اس بات کی کہ اس پر عمل کرنے سے انسان امن وامان اور آسائش وآرام کی زندگی بسر کر سکے گا اور اس قابل ہو جائے گا کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی جتنی قوتیں اس کے دل و دماغ میں پوشیدہ ہیں وہ سب نشو ونما پا کر بروئے کار آئیں اور انسان اللہ کے ان تمام خزانوں کو مسخر کرے جو زمین وآسمان میں ظاہر یا چھپے ہوئے ہیں۔قرآن میں ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجاثیہ:13)

"یعنی زمین وآسمان میں جو کچھ بھی ہے اللہ نے سب کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔"

غور کیجیے کہ جب ایک معمولی سے قلعہ یا چھوٹے سے شہر کو فتح کرنے کے لیے کس قدر علم و عقل، تجربہ اور سوجھ بوجھ، ہمت و محنت اور صبر و استقلال درکار ہوتے ہیں تو زمین وآسمان کی تمام اشیاء کو تسخیر کرنے کے لیے کیا کچھ درکار نہ ہوگا۔

لیکن یہ ناممکن یا محال بھی نہیں ہے۔ناممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں ایسا فرماتا ہی کیوں، ویسے تجربہ سے بھی یہی ثابت ہوا ہے کہ انسان زمین وآسمان کی تمام اشیاء کو مسخر کر سکتا ہے۔یہی انسان ہے جو کبھی جنگلی جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ننگا پھرنا، خودرو نباتات اور شکار کے گوشت سے پیٹ بھرنا۔زمین کے بھٹوں یا پہاڑ کے غاروں میں رہتا اور پیدل سفر کرتا تھا پھر رفتہ رفتہ کھیتی باڑی کرنا، کپڑے بننا اور سینا۔جھونپڑیاں اور کچے پکے مکان بنانا۔باربرداری اور سواری کے لیے جانور سدھانا اور گاڑیاں بنانا سیکھ گیا۔اور آج وہی انسان ہے جو کمخواب وزربفت سے بھی زیادہ اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ہزاروں قسم کے لذیذ ماکولات ومشروبات استعمال کرتا ہے۔سر بفلک عمارتیں بناتا ہے۔ریلوں، جہازوں اور ہوائی جہازوں میں برسوں کا سفر گھنٹوں اور گھنٹوں کا

سفر منٹوں میں طے کرتا ہے اور لاکھوں من بوجھ بڑے بڑے سمندروں اور اونچے اونچے پہاڑوں کے پار بہ آسانی پہنچا دیتا ہے اور اب تو خود ہمارا علم و مشاہدہ گواہ ہے کہ وہی انسان جس کے لیے کل تک معمولی پہاڑوں پر چڑھنا یا سمندروں کی تہہ تک پہنچنا اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا بھی مشکل تھا۔ آج چاند تاروں میں اپنے راکٹ بھیج کر وہاں کے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ اس کی آبدوز کشتیاں سمندروں کی تہ میں لگاتار کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہے۔ اس کے مصنوعی سیارے کرۂ زمین سے سینکڑوں میل دور فضا میں آدمیوں کو اڑا کر لے جاتے ہیں اور کئی کئی دن زمین کے گرد اپنا الگ مدار بنا کر گردش کرتے رہتے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ یہی انسان کچھ عرصہ بعد زحل، مشتری اور مریخ وغیرہ میں بھی آنے جانے لگے اور دو چار صدی بعد اپنے نظام شمسی کے علاوہ دوسرے ستاروں میں بھی اس کی رسائی ہو جائے۔ انسان کی اس کامیابی سے صرف مادی فوائد ہی حاصل نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس کے ذہن اور عقل نے بھی بے انتہا ترقی کر لی ہے اور آج وہ اپنے خالق کا پہلے سے کہیں زیادہ معترف و مداح ہے۔ مزید سماوی دریافتیں اور اجرام فلکی کی تسخیر یقیناً اس کو خدا سے اور بھی قریب کر دیں گی اور وہ مالک ارض و سماء کی معرفت بدرجہ اولیٰ حاصل کر لے گا۔

سوال یہ ہے کہ اتنی عظیم الشان اور محیر العقول ترقی انسان کس وجہ سے کر سکا؟ میرا جواب ہے صرف ''امن و امان'' کی وجہ سے۔ اگر امن و امان کی زندگی میسر نہ آتی اور انسان جنگلی اور خونخوار درندوں کی طرح جنگ و پیکار ہی میں مصروف رہتا تو یہ معیشتی، معاشرتی، تمدنی، علمی اور ذہنی ترقی ممکن ہی نہ ہوتی اور جس آرام و آسائش کی زندگی ہم آج بسر کر رہے معرض وجود ہی میں نہ آتی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ترقی بڑے بڑے دانشوروں اور مفکروں کے متواتر غور و فکر اور سائنس دانوں کی لگاتار عملی کدو کاوش اور تجربوں کا نتیجہ ہے۔ اگر دنیا میں امن و امان نہ ہوتا تو نہ بڑے بڑے مفکروں کو غور و فکر کا وقت ملتا، نہ سائنس دان اطمینان و سکون سے نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کرنے کے قابل ہوتے۔ اب اگر آپ ٹھنڈے دل سے ذرا بھی غور کریں کہ یہ امن و امان انسان کو کس نے دیا تو بڑی آسانی سے سمجھ جائیں گے کہ مذہب نے۔ مذہب ایک سیدھا سادا سا ضابطہ ہے جو صرف ان دو جملوں پر مشتمل ہے۔

1۔یہ کرو 2۔یہ مت کرو۔انہی کو مذہبی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔
مذہب جتنے بھی کام کرنے کا حکم دیتا ہے وہ خیر اور جن سے سے منع کرتا ہے وہ شر کہلاتے ہیں۔ خیر و شر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ ہر وہ فعل و قول اور حرکت و سکون جو نوع انسان کی بقا و تعمیر کا باعث ہو خیر ہے اور جو تباہی و تخریب کاری کا سبب بنے وہ شر ہے۔اس تعریف کو آپ انسانی زندگی کے کسی گوشہ، کسی شعبہ اور انسان کے کسی قول و فعل اور حرکت و سکون پر منطبق کر کے دیکھ لیں آپ پر اس کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہو جائے گی اور آپ اچھی طرح سمجھ جائیں گے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی نعمتیں اور دولتیں پیدا کی ہیں ان سب میں خیر یعنی امن و امان ہی سب سے بڑی دولت اور نعمت ہے یہ کوئی منطقی استدلال یا استنباط نہیں بلکہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے جس کو تمام قوموں اور قوموں کے تمام دانشوروں نے تسلیم کر لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تمام قومیں ادارۂ اقوام متحدہ میں جمع ہو کر ہر وقت قیام امن عالم کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں۔

یہ اللہ کا بڑا ہی کرم تھا کہ جب انسان جہالت کی تاریکیوں میں وحشت و بربریت کی زندگی گزار رہا تھا تو اس نے انہی انسانوں میں کچھ خاص بندے پیدا کیے اور ان پر عقل، القاء، الہام اور وحی کے ذریعہ وہ تعلیم نازل کی جو "مذہب" کہلاتی ہے۔ یہی تعلیم ان مقبول بندوں نے "(جو پیغمبر کہلاتے ہیں) اپنی قوم کو دی۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ہادی نہ آیا ہو، لیکن جس قوم میں بھی کوئی ہادی آیا قوم نے نہ صرف اس کو ٹھکرایا بلکہ طرح طرح کی اذیتیں بھی دیں جیسا کہ تمام پیغمبروں کی سوانح حیات سے ظاہر ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ تعلیم الٰہی یا قانون حق نازل ہونے سے پہلے ہر قوم آزاد اور ہر شخص مختار تھا کہ جو چاہے کرے۔ان کے قول و فعل اور اعمال و افکار پر نہ کوئی پابندی تھی نہ کوئی روک ٹوک کرنے والا۔

جب پیغمبروں نے حکم الٰہی کے مطابق ان اعمال و افعال وغیرہ پر پابندیاں لگائیں کہ "یہ کرو" اور "یہ مت کرو" تو لوگوں کو سخت ناگوار گزرا اور وہ ناراض ہو کر دشمنی اور ایذا رسانی پر اتر آئے۔ لیکن ان نفوس قدسی نے دنیا کی بڑی سے بڑی مخالفت اور سخت سے سخت اذیت کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی۔ دن رات اپنا کام جاری رکھا اور مرتے دم تک اپنے پر از حکمت و محبت،

مواعظ و نصائح سے لوگوں کو سمجھاتے رہے یہاں تک کہ قوم کے ایک بڑے طبقہ نے ان کی بات مان لی اور قانون حق کو خود اپنی خوشی سے اپنے اوپر نافذ کرلیا۔مگر آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں کسی قانون پر بھی عملدر آمد نہیں ہوسکتا جب تک اس کی پشت پر کوئی طاقت ایسی موجود نہ ہو جو قانون شکنی کرنے والوں کو سزا دے سکے۔اس لیے پیغمبروں نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ جس اللہ نے یہ قانون نازل کیا ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔وہ حاضر و ناظر اور سمیع و بصیر بھی ہے۔یعنی ہر وقت ہر جگہ موجود ہے اور اپنے بندوں کے تمام اعمال و اقوال کو دیکھتا اور سنتا ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ دلی خیالات کو بھی جان لیتا ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ مرنے کے بعد تم کو ایک دن پھر زندہ کیا جائے گا اور تم نے اس دنیا میں جو کچھ کیا ہے اس کا پورا بدلہ ملے گا۔اس لیے جو لوگ اس ضابطہ الٰہی کے خلاف کریں گے ان کو سخت عذاب دیا جائے گا اور جو اس پر عمل کریں گے ان کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کی جائیں گی۔

لوگوں نے پیغمبروں کی ان باتوں کو بھی مان لیا۔اس طرح یہ قانون حیات مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگیا اور دنیا امن و امان کی برکتوں سے نہال ہوگئی۔اور آج جو چہل پہل اور رونق و ترقی ہم دیکھتے ہیں وہ سب اسی ضابطہ حیات یا بالفاظ دیگر مذہب پر چلنے کا نتیجہ ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ کروڑوں انسان ایسے بھی ہیں جو نہ تو خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے مرسلہ ضابطہ حیات کو۔اور جو مانتے ہیں ان میں سے بھی سب اس پر سو فیصدی عمل نہیں کرتے'اگر دنیا کی پوری آبادی بلا استثنٰی اس ضابطہ حیات کی سو فیصدی پابندی کرے تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا صحیح معنوں میں رشک فردوس نہ بن جائے۔

جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ خدا' رسول' وحی' الہام' حیات بعد الموت اور جنت و دوزخ جیسی کوئی شے بھی موجود نہیں ہے۔یہ سب من گھڑت افسانے ہیں جو عہد عتیق کے عقل مندوں نے محض اس لیے وضع کیے تھے کہ لوگوں کو ایک نادیدہ قوت کا خوف دلا کر قتل و غارت سے روکا جائے۔اب انسان اس قدر ایڈوانس ہو چکا ہے کہ اپنے بھلے برے اور خیر و شر کو خوب اچھی طرح جانتا ہے اور اپنی قانون ساز اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں ضرورت وقت کے مطابق

قانون بنا کر امن و امان قائم رکھ سکتا ہے۔ اس لیے اب ایسے خلاف عقل افسانوں پر یقین کرنا بے کار محض ہے۔ ان لوگوں سے میری گزارش ہے کہ چلو یونہی سہی۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ آپ ہی سچے ہیں۔ خدا وغیرہ کوئی بھی موجود نہیں (نعوذ باللہ۔ نقل کفر کفر نہ باشد) اس صورت میں دو عقیدے ہو گئے۔ ایک یہ کہ خدا موجود ہے۔ دوسرا یہ کہ خدا موجود نہیں ہے۔ تو اب ہم کو یہ غور کرنا چاہیے کہ ان دونوں عقیدوں میں سے کون سا عقیدہ قیام امن و امان میں مدد دے سکتا ہے اور کون سا نہیں دے سکتا۔

اب فرض کیجیے دو آدمی ہیں زید اور بکر۔ زید کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا صرف موجود ہی نہیں بلکہ حاضر و ناظر، سمیع و بصیر اور قادر و قیوم بھی ہے۔ اگر میں نے ایک بات بھی اس کے حکم کے خلاف کی تو اس کو فوراً معلوم ہو جائے گا اور وہ مجھے اس دنیا میں بھی سزا دے گا اور مرنے کے بعد بھی عذاب الیم میں مبتلا کرے گا۔ اس کے برخلاف بکر کا تخیل کچھ اس انداز کا ہوگا کہ اگر میں نے اپنے ملکی قانون کے خلاف کچھ کیا اور لوگوں کو یا پولیس کو معلوم ہو گیا تو وہ مجھے گرفتار کر کے چالان کر دے گی اور مجسٹریٹ مجھے سزا دے دے گا۔ اسے بہت فکر ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ پولیس کو رشوت دی جا سکتی ہے۔ وہ نہ مانے تو شاید مجسٹریٹ ہی رشوت قبول کر لے۔ یہ بھی نہ ہوا تو پھر میں ایک بہت قابل وکیل کر لوں گا اور گواہوں کو روپیہ یا کسی کے اثر و رسوخ سے مجبور کر دوں گا کہ میرے خلاف گواہی نہ دیں۔

اب بتایئے ان دونوں میں سے کون سا قانون شکنی کر سکتا ہے۔ زید جو خدا کو مانتا ہے یا بکر جو نہیں مانتا۔ اچھا یہ تو تھا ایسے مواقع کا حال جہاں پولیس یا لوگوں کے دیکھ لینے کا خدشہ ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی میں تو ایسے موقعے بھی اکثر ہوتے ہیں جہاں پولیس یا لوگوں کو علم ہو جانے کا مطلقاً کوئی امکان ہی نہیں ہوتا اور انسان کو سو فیصدی یقین ہوتا ہے کہ اس کے جرم کا حال کبھی بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا۔ اب بتایئے کہ ایسے موقعوں پر ارتکاب جرم کون کر سکتا ہے، وہ شخص جو خدا پر ایمان رکھتا ہے یا وہ شخص جو صرف پولیس اور عدالت کے خوف سے قانون شکنی نہیں کرتا۔

امید ہے کہ اب مذہب کی ضرورت و اہمیت آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی اور آپ یہ مان گئے

ہوں گے کہ انسان کی تعمیر و بقا کے لیے مذہب اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ پانی اور ہوا۔اور اگر اب بھی آپ کی تسلی نہ ہوئی ہو تو دومنٹ کے لیے تصویر کے دوسرے رخ پر بھی غور کر لیں اور ایک ایسے خطہ زمین کا تصور کریں جہاں قانون موجود نہیں۔ لاقانونیت اور انارکی کا دور دورہ ہے۔ نہ کوئی حاکم' نہ عدالت' نہ کوئی ضابطہ تعزیر۔ ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام اور اپنی مرضی کا مالک ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ایسے مقامات پر صرف ایک ہی قانون چلتا ہے۔ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' یہاں کسی کو بھی اپنے جان و مال' بیوی بچوں اور عزت و آبرو کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص محنت و مشقت سے کچھ پیسہ بچاتا ہے۔ مکان بناتا ہے اور کچھ سامان اکٹھا کرتا ہے کہ ایک دن اچانک دس پانچ آدمی آجاتے ہیں اور اس کو مار ڈالتے ہیں یا جو کچھ اس کے پاس ہے لوٹ کر لے جاتے ہیں اور وہ دیکھتے کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ایسے مقامات پر نہ تمدن ترقی کر سکتا ہے' نہ تہذیب پھیل سکتی ہے' نہ آدمی کی عقلی اور ذہنی قوتیں نشو و نما پا سکتی ہیں۔ ایسی زندگی کا صحیح تصور ہمارے لیے اس واسطے ممکن نہیں کہ ہم متمدن دنیا میں رہتے ہیں۔ اپنی محنتوں کا پورا نہیں تو کچھ نہ کچھ ثمرہ ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ اپنی جائز تمناؤں اور خواہشات کو بڑی حد تک پورا کر سکتے ہیں۔ اپنے اہل و عیال اور دوستوں کی محبت کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ رات کو پاؤں پھیلا کر سوتے اور صبح کو ہنستے اور مسکراتے اٹھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی بہت سی تکلیفیں اور پریشانیاں موجود ہیں۔ لیکن وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ معاشرے کے تمام افراد خدائی قانون یعنی مذہب پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔

اگر آپ لاقانونیت اور انارکی کی زندگی کا صحیح کرنا چاہتے ہیں تو سکندر اعظم' چنگیز خان اور ہلاکو جیسے لٹیروں کے حالات پڑھیں۔ جنہوں نے قانون اور امن عالم کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اور دیکھیں کہ جن ممالک کو انہوں نے تاخت و تاراج کیا تھا وہاں اس زمانہ لاقانونیت میں انسانی زندگی کی کیا قیمت تھی۔

1857ء میں خود ہندوستان پر جو مصیبت آئی اس کے حالات بھی قابل مطالعہ ہیں۔ دور کیوں جائیں 1947ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہونے پر دہلی' مشرقی پنجاب اور یوپی کے چند

مغربی اضلاع پر جو آفت آئی اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر جو قیامت ڈھائی اس کے چشم دید گواہ آج بھی لاکھوں موجود ہیں۔ مجھے خود بھی ان واقعات کا بہت سا ذاتی علم و تجربہ ہے مگر بخوف طوالت بیان نہیں کر سکتا۔ صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ ایسی مصیبتیں دشمنوں پر بھی نہ ڈالے۔ فساد زدہ علاقوں میں کئی ماہ تک وہ افراتفری اور پریشانی رہی کہ کسی مسلمان کو دو منٹ کے لیے بھی اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ دو چار دن تو بہت ہیں۔ دو چار منٹ کا بھی بھروسہ نہ تھا کہ خدا جانے کیا ہو جائے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا محض اسی لیے کہ کوئی قانون باقی نہ رہا تھا اور وہ امن و امان مفقود ہو گیا تھا جس کو قائم رکھنے کا حکم خدا نے مذہب کے ذریعے اپنے بندوں کو دیا ہے۔

میں نے مذہب کے بیان پر بہت کافی وقت لے لیا ہے۔ اب میں اصل موضوع یعنی تصوف کی طرف آتا ہوں اور آپ کو بتاتا ہوں کہ انسان کی زندگی پر تصوف کا کیا اثر پڑتا ہے۔

تصوف کی حقیقت:

یہ ایک علم ہے جس کا موضوع و مقصد ہے ذات باری تعالیٰ کی معرفت و حقیقت۔ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے تصوف کی جو تعریفیں کی ہیں وہ مشتمل ہیں تین باتوں پر۔

۱۔ تصوف کا مقصد وحید اخلاق حسنہ میں کمال پیدا کرنا ہے۔

۲۔ تصوف کا موضوع و مقصد ہے اللہ کی معرفت حاصل کرنا۔

۳۔ تصوف علم حقائق کا نام ہے۔ یعنی کائنات و ماورائے کائنات جو کچھ بھی موجود ہے اس کی حقیقت معلوم کرنا۔ اس میں صرف مادی اشیاء ہی کا نہیں بلکہ ماورائے سریات کا علم بھی شامل ہے۔ مثلاً فرشتے، دوزخ، جنت، قیامت، حیات بعد الموت اور خود ذات اقدس باری تعالیٰ۔

ان تینوں تعریفوں میں صرف دوسری تعریف صحیح ہے۔ پہلی تعریف اس لیے درست نہیں کہ تزکیہ اخلاق بذاتہ تصوف کا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو چند متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے مقصد و موضوع تک پہنچنے کا۔ حضرت امام غزالی e فرماتے ہیں کہ

''تصوف اور دوسرے علوم میں یہ فرق ہے کہ اور علوم تو پہلے حاصل کیے جاتے ہیں پھر ان پر عمل کیا جاتا ہے لیکن تصوف میں اس کے برعکس پہلے کچھ عمل کرنے پڑتے ہیں پھر علم حاصل

ہوتا ہے۔''

تو انہی اعمال میں سے ایک تزکیہ اخلاق بھی ہے۔مطلب یہ ہے کہ اگر تزکیہ نہ کیا جائے تو سالک اپنے مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔یعنی اس کو کسی صورت میں بھی معرفت باری تعالیٰ حاصل نہیں ہوسکتی۔

تیسری تعریف اس لیے غلط ہے کہ مادی اشیاء کی حقیقت معلوم کرنا بھی تصوف کا موضوع و مقصد نہیں ہے۔یہ چیز بھی معرفت باری تعالیٰ حاصل ہونے پر خودبخود حاصل ہو جاتی ہے۔تمام صوفیائے کرام کا قول ہے کہ جس کو معرفت باری تعالیٰ حاصل ہوگئی اس کو معرفت الاشیاء بدرجہ اولیٰ حاصل ہو جاتی ہے۔

تصوف کا مفہوم حاضرہ:

یہ تو تھی تصوف کی تعریف اور اس کی اصلیت۔لیکن آج کل دنیا تصوف کو جو کچھ سمجھتی ہے وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔اس امر میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ بات سننے کی بہ نسبت دیکھنے سے زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔چنانچہ بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے دیہات تک آپ کو ہر جگہ کچھ آدمی ایسے نظر آئیں گے جن کو لوگ صوفی یا خدا رسیدہ سمجھتے ہیں۔ان میں سے اکثر مادر زاد ننگے رہتے ہیں۔بھنگ پیتے یا چرس کے دم لگاتے ہیں۔نماز روزے کے پاس بھی نہیں جاتے۔یہ ہیں مسلمانوں کے پیشوا اور رہادی جن کو نہ دین کا پتہ ہے نہ دنیا کا' نہ حرام کو جانتے ہیں نہ حلال کو۔اب ایک طرف تو اسلام ہے جو طہارت و پاکیزگی کو انسان کا فرض اولین بتاتا ہے اور اس کے بغیر نماز کو بھی جائز قرار نہیں دیتا اور دوسری طرف وہ مسلمان ہیں جو غلاظت و گندگی کے ان مجسموں کو بزرگ اور ولی اللہ مانتے ہیں۔سوچنے کی بات ہے کہ جس قوم کے ولی اور رہادی ایسے ہوں اس کو دوسری قومیں کیا سمجھتی ہوں گی۔لوگ ان کو مجذوب سمجھ کر ان کی عزت و خدمت کرتے ہیں۔لیکن یہ مجذوب نہیں پاگل ہوتے ہیں۔اصطلاح تصوف میں مجذوب وہ ہے جس پر اللہ کی محبت یا کسی جلالی صفت کا اس قدر غلبہ ہو کہ حواس ظاہر مغلوب ہو کر استغراق کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

لیکن یاد رکھیئے کہ یہ غلبہ کبھی مستقل نہیں ہمیشہ عارضی ہوتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ بعض آدمیوں پر جذب واستغراق کی کیفیت کئی کئی سال طاری رہتی ہے۔لیکن اس حال میں بھی ان سے کوئی خلاف شرع قول یا فعل کبھی سرزد نہیں ہوتا۔عام طور پر نماز کے وقت ان کا استغراق جاتا رہتا ہے یا اتنا کم ہو جاتا ہے کہ پنجگانہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔روزے بھی رکھتے ہیں اور پاک صاف بھی رہتے ہیں۔کچھ مدت بعد یہ بالکل ہوش میں آجاتے ہیں۔جذب واستغراق کا نام بھی نہیں رہتا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا قول ہے کہ "رسول اللہ کی امت میں سب سے پہلے مجذوب حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ کہاں تصوف کا جذب پاکیزہ اور کہاں لوگوں کا پاگل پن۔سوال یہ ہے کہ اگر یہ پاگل ہیں تو ان سے کشف وکرامات کیوں سرزد ہوتی ہیں۔جن کی وجہ سے دنیا ان کو بزرگ مانتی ہے۔اس بات کا جواب میں پچھلے سال کے خطبہ میں بہت وضاحت سے دے چکا ہوں اور خوارق عادات کی نفسیاتی وجوہات اچھی طرح سمجھا کر یہ بتا چکا ہوں کہ خوارق عادات پاگلوں سے کیوں ظہور میں آتے ہیں۔یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کو دنیا بزرگ جانتی ہے۔مثلاً نجومی' رمال' پامسٹ' مسمرائزر' ہپناٹسٹ' عامل اور ملنگ وغیرہ۔

تو یاد رکھئے ان میں سے کوئی بھی صوفی یا ولی نہیں ہوتا۔یہ تو سرے سے تصوف کے طالب علم ہی نہیں ہوتے اور ان کا مقصود اللہ یا اس کا عرفان ہرگز نہیں ہوتا۔صرف دنیا کمانا ہوتا ہے۔یہ تو رہے ایک طرف آپ یہ سن کر حیران رہ جائیں گے کہ متقدمین میں بھی بہت سے بزرگ جنہوں نے تصوف پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں اور جن کو دنیا ان کتابوں کی بناء پر بہت بڑا صوفی سمجھتی ہے۔کامل صوفی نہ تھے متصوف تھے۔

حضرت علی ہجویریؒ نے بزرگوں کی تین قسمیں لکھی ہیں:

ا۔صوفی:

وہ ہے جو مکمل سلوک طے کر کے درجہ کمال تک پہنچ جائے۔یعنی اس کو خدا کا عرفان حاصل ہو

جائے۔

۲۔متصوف:

وہ ہے جس نے مکمل طور پر سلوک طے نہ کیا ہو۔آدھا تہائی کیا ہو لیکن عالم و فاضل ہو اور تصوف پر بڑی بڑی کتابیں پڑھ کر ان کوائف اور آخری منازل و مقامات سے واقف ہو جائے جہاں تک وہ خود نہیں پہنچا اور جن کا علم خود اس کو ذاتی طور پر حاصل نہیں ہوا۔صرف کتابی علم رکھتا ہے۔

۳۔متصوف:

وہ ہے جس نے نہ عملی طور پر سلوک طے کیا نہ تصوف پر کوئی مستند کتاب پڑھی۔بس فقیروں کا سا حلیہ بنالیا اور ادھر ادھر کی سنی سنائی باتیں بنانے اور جہلا کو بہکانے لگا۔

یہ جو دنیا میں ہزاروں پیر فقیر نظر آتے ہیں اگر آپ مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں ان کو پرکھیں تب بھی شاید ہی معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کون کامل اور سچا صوفی ہے' کون ناقص ہے اور کون بالکل جھوٹا اور مکار ہے۔حقیقتاً یہ جنس اتنی سستی اور یہ کام اتنا آسان نہیں کہ جس کا دل چاہے سال دو سال ذکر وغیرہ کر کے سچا ولی اور کامل صوفی بن جائے۔لاکھوں آدمی جو اس خیال سے اللہ اللہ شروع کرتے ہیں۔ان میں سے دو چار ہی آخری منزل تک پہنچتے ہیں۔ورنہ راستہ ہی میں رک جاتے ہیں۔آپ کو پوچھنا چاہیے کہ جب حال یہ ہے تو پھر ایک کامل صوفی' ایک متصوف اور ایک متصوف کی خاص پہچان کیا ہے؟

تو سنیے ایک کامل صوفی کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کشف و کرامات کی طاقت اور روحانی قوت بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس کا اخلاق' اخلاق محمدی ﷺ کا نمونہ ہوتا ہے۔وہ شریعت کا سختی سے پابند ہوتا ہے اور اس کے عقائد بالکل قرآن اور حدیث کے مطابق ہوتے ہیں۔اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس بدترین گناہگار بھی اصلاح کے لیے آئیں اور اس کی تعلیم و ہدایات پر عمل کریں تو نیک پارسا اور متقی بن جاتے ہیں۔مگر بڑی دقت یہ ہے کہ اس طرح ایک کامل صوفی اور ایک جعل ساز متصوف کا فرق معلوم ہو سکتا ہے لیکن ایک کامل صوفی اور متصوف

میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے دو عوالم کا سلوک طے کرنا پڑتا ہے۔پہلے عالم خلق کا اور پھر عالم امر کا۔عالم خلق کی ابتدا ناسوت اور انتہا ھو ہے اور عالم امر کی ابتدا عدم اور انتہا ذات باری تعالیٰ ہے۔جو سالک ذات باری تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا عرفان حاصل کر لیتا ہے وہ کامل کہلاتا ہے اور جو نیچے کسی مقام تک رہ جاتا ہے وہ خواہ کتنا ہی بڑا بزرگ ہو بہر حال ناقص ہی سمجھا جاتا ہے۔تو متصوفین میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو عالم خلق کا تو خوب علم ہو جاتا ہے لیکن عالم امر کا ذاتی علم بالکل نہیں ہوتا یہ علم وہ دوسرے بزرگوں کی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے (حالانکہ غلط سمجھتے ہیں) اسی کو صحیح سمجھ کر وعظ و نصیحت میں بیان کرتے اور خود اپنی کتابوں میں لکھ دیتے ہیں۔یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلاً یونہی جاری رہتا ہے اور جتنا آگے بڑھتا ہے غلطیاں اور غلط فہمیاں اور زیادہ ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ اغلاط کا یہ طومار جب غیر صوفی عوام تک پہنچتا ہے تو کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔یہی سبب ہے کہ بعض مانے ہوئے بزرگوں کی کتابوں میں ایسے اقوال ملتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایسے اقوال کو ہرگز نہیں ماننا چاہیے۔مگر ساتھ ہی نہ تو ان بزرگوں کو برا کہنا چاہیے نہ ان کی بزرگی کے متعلق کوئی بدگمانی کرنی چاہیے۔امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عالم امر میں صور و اشکال کا ادراک بالکل ختم ہو جاتا ہے اس لیے وہاں کا حال کوئی سالک بیان کرنا چاہے تو بھی نہیں کر سکتا اور اگر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے الفاظ سے کفر ٹپکنے لگتا ہے۔اور صحیح مطلب چونکہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کفر بک رہا ہے۔

الغرض! ایک سچے صوفی کی شناخت یہ ہے کہ کشف و کرامات اور بے پناہ روحانی طاقت کے باوجود اس کا کوئی قول اور فعل شریعت کے خلاف نہیں ہوتا۔میرے خیال میں اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ سچا تصوف کیا ہے اور جس کو عام لوگ تصوف سمجھتے ہیں وہ کیا چیز ہے۔اب اسی سچے تصوف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ بتانا ہے کہ تصوف کا انسانی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔

اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ یہاں انسانی زندگی سے کیا مراد ہے۔اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ انسانی زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے، یہ کہاں سے

آتی ہے' کہاں جاتی ہے۔ازلی وابدی ہے یا حادث و فانی وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا مطلب ہوسکتا ہے انسان کی روزمرہ زندگی جو ہم دنیا میں بسر کرتے ہیں۔تو گزارش یہ ہے کہ اگر چہ انسانی زندگی کے ماورائی پہلو پر بھی بہت کچھ کہا اور بتایا جا سکتا ہے لیکن یہ بات ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔لہٰذا جو کچھ کہا جائے گا وہ انسان کی روزمرہ زندگی کی بابت ہوگا۔یہ موضوع بھی بہت وسیع اور مشکل ہے۔لیکن میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ کہوں باوجود انتہائی اختصار کے زیادہ سے زیادہ واضح ہو۔

اب میں خود ہی ایک سوال کرتا ہوں اور خود ہی اس کا جواب دیتا ہوں۔سوال یہ ہے کہ تصوف ہم کو کیا دیتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ تصوف ہم کو دنیا و دین کی اتنی بے شمار اور نایاب نعمتیں دیتا ہے جن کا احاطہ تحریر و تقریر میں نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے میں اختصار کے خیال سے صرف چند چیزوں کے بیان پر اکتفا کروں گا۔وہ چیزیں یہ ہیں:

1۔علم باطن 2۔روحانی طاقت 3۔عقل سلیم 4۔قلب سلیم

اب ان میں سے ہر ایک کا تھوڑا تھوڑا سا حال سنیے:

علم باطن:

علم باطن یا علم سریات ان چیزوں اور طاقتوں کا علم ہے جو حواس ظاہر سے معلوم و محقق نہیں ہو سکتیں۔ان میں وہ چیزیں خاص طور پر شامل ہیں جن پر بن دیکھے ایمان لانا آسمانی مذہب کی اساس و بنیاد ہے۔مثلاً خدا' فرشتے' آسمانی کتابیں' رسول' قیامت' حقیقت خیر و شر' حیات بعد الموت اور جنت دوزخ وغیرہ۔

اس علم سے خدا پر ایمان اور دوسری زندگی میں جزا و سزائے اعمال پر یقین اس قدر مستحکم ہو جاتا ہے کہ بال برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔لہٰذا ایسے آدمی سے دنیوی زندگی میں کوئی گناہ یا لغزش نہیں ہوتی۔وہ ہمیشہ صراط مستقیم پر چلتا رہتا ہے۔

یقین تین طرح کا ہوتا ہے:

۱۔علم الیقین ۲۔عین الیقین ۳۔حق الیقین

علم الیقین وہ یقین ہے جو معتبر اور متواتر خبروں یا شہادتوں سے حاصل ہو۔ جیسے کہ خدا' قیامت اور حیات بعد الموت کا یقین جو پیغمبروں جیسے سچے اور معتبر گواہوں کے بیان سے پیدا ہوتا ہے۔

عین الیقین وہ ہے جو کسی چیز کو خود آنکھوں سے دیکھ کر حاصل ہو۔ لیکن اس میں بھی یہ ہوتا ہے کہ انسان کو ایک چیز نظر آتی ہے لیکن وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتا۔

حق الیقین یہ ہے کہ انسان جن چیزوں کو جانتا اور دیکھتا ہے ان کی حقیقت سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ حق الیقین کے معنی ہی ''حق یا حقیقت کا یقین'' ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ کسی دنیوی علم میں کمال حاصل کر لیتے ہیں مثلاً ڈاکٹر' فلاسفر اور سائنسدان وہ کس قدر دانشور اور عظیم المرتبت ہوتے ہیں۔ بس اسی پر قیاس کر لیجیے کہ جو نفوس قدسی علم باطن میں کمال حاصل کر لیں ان کے مرتبے کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

اسی باطنی علم میں کشف الغیوب بھی ہے۔ ان بزرگوں کو یہ بھی بدرجہ اولی میسر ہوتا ہے۔ وہ کسی آدمی کا گزشتہ یا آئندہ حال معلوم کرنا چاہیں تو سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ باتیں بھی جو خود اس آدمی کو بھی یاد نہیں رہیں۔

قرآن میں ہے کہ

''ایک ذرہ برابر خیر و شر بھی جو تم کرتے ہو لکھ لیا جاتا ہے اور قیامت کے دن تمہارے سب اقوال و اعمال تم کو دکھائے جائیں گے۔''

کچھ مدت پہلے عوام کو اس بات کا یقین نہیں آتا تھا لیکن سائنس کی تحقیق ہے کہ دنیا میں ایک مرتبہ جو حرکت یا آواز پیدا ہوتی ہے وہ ایتھر میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ کبھی بھی فنا نہیں ہوگی۔ اس سے قرآن کی صداقت کا اندازہ کر لیجیے۔ ہاں تو ان کاملین تصوف کو وہ بصیرت و بصارت مل جاتی ہے کہ جس آدمی یا جس واقعہ کا گزشتہ حال معلوم کرنا چاہیں اس کا اثیری ریکارڈ دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔ سائنس ابھی تک یہ دریافت نہیں کر سکی کہ جو واقعات آئندہ پیش آنے والے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں اور ان کا ماخذ کیا ہے۔ لیکن ایک صوفی کامل کو یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کو خود اپنی

تقدیر کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس پر فلاں فلاں مصیبتیں آئیں گی اور فلاں فلاں نعمتیں ملیں گی۔لیکن وہ نہ مصیبتوں سے پریشان ہوتا ہے نہ نعمتوں پر فخر وغرور کرتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اللہ کی مرضی ہی یوں ہے۔یہ سب کچھ یونہی ہو کر رہے گا۔اس لیے وہ تسلیم ورضا کے مسلک پر ثابت قدم ہو جاتا ہے اور اللہ کے اس حکم پر پوری طرح عمل کرتا ہے کہ ''اگر تمہاری کوئی چیز تم سے چلی جائے تو اس کا افسوس نہ کرو۔اور اگر تم کو کچھ (نعمت) مل جائے تو اس پر نازمت کرو۔'' اس طرح اس کو استغنائے کامل حاصل ہو جاتا ہے اور دائمی اطمینان قلب کی وہ دولت میسر آ جاتی ہے جو دنیا کے کسی علم سے بھی بدرجہ کمال میسر نہیں آ سکتی۔

آپ شاید خیال کریں کہ جب ایک صوفی کامل آئندہ کا حال معلوم کر لیتا ہے تو وہ آنے والی مصیبتوں کا قبل از وقت مداوا بھی کر لیتا ہوگا۔یہ خیال غلط ہے اگر وہ کبھی ایسی کوشش کرتا بھی ہے تو اپنے آپ کو مجبور محض اور عاجز پاتا ہے اور خدا کی قدرت وعظمت کا اور بھی زیادہ معترف ہو جاتا ہے۔وہ تقدیر کو خود نہیں بدل سکتا ہاں اس کے بدلنے کی دعا کر سکتا ہے اور اللہ اس کی خاطر کبھی کبھی تقدیریں بدل بھی دیتا ہے۔

دراصل کشف کا یہ مطلب نہیں کہ اولیائے کرام کو تمام کائنات کے ذرے ذرے کا حال ہر وقت معلوم رہتا ہے۔جیسا کہ جاہل لوگ سمجھتے ہیں۔ہرگز نہیں۔کشف میں تو صرف وہی حال معلوم ہوتا ہے جو کوئی بزرگ جاننا چاہے یا خود اللہ تعالیٰ کسی مصلحت سے اس کو بتانا چاہے۔باقی باتوں کے متعلق تو وہ بھی ایسے ہی اندھیرے میں رہتا ہے جیسے کہ عام آدمی۔

الغرض! یہ ہیں علم باطن کی برکتیں اور ان کا اثر جو ایک صوفی کی زندگی پر پڑتا ہے اور جو اس کو دوسرے عوام وخواص سے ممتاز وافضل بنا دیتا ہے۔

روحانی طاقت:

دنیا میں طاقت سب سے بڑی نعمت اور کمزوری سب سے بڑی لعنت ہے۔طاقت دو قسم کی ہوتی ہے، مادی اور روحانی۔مادی طاقت مشتمل ہے جسمانی، علمی، عقلی اور دولت کی طاقتوں پر۔اس وقت دنیا میں جو چہل پہل اور ترقی نظر آتی ہے وہ سب انہی چار طاقتوں کی مشترکہ مساعی کی وجہ سے ہے۔مادی

طاقت کے کرشمے آنکھوں سے نظر آتے ہیں اس لیے اس کو سب جانتے ہیں ۔لیکن روحانی طاقت کا اظہار کرامات وخوارق کی شکل میں ہوتا ہے ۔اس لیے بہت سے لوگ اس کو نہیں مانتے ۔

افسوس یہ ہے کہ جب ہم اولیاء اور صوفیاء کی کرامات کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ ناک بھوں چڑھاتے اور مذاق اڑاتے ہیں ۔لیکن جب ہم مسمریزم اور ہپناٹزم کا حوالہ دیتے ہیں تو اس کو مان لیتے ہیں ۔جب مسمریزم اور ہپناٹزم سے بیماریوں کے علاج کا ذکر آتا ہے یا یورپ وامریکہ کی روحانی مجلسوں میں روحوں کو بلانے اور ان سے کام لینے کے قصے بیان کیے جاتے ہیں تو تسلیم کر لیتے ہیں ۔لیکن جب حاضرات اور عملیات یا دم وغیرہ کے ذریعے امراض کے علاج کا حال کہا جاتا ہے تو ہنسی اڑاتے ہیں ۔یہ سب ہٹ دھرمی نہیں تو کیا ہے ۔

معمولی روحانی کرشمے تو ہمارے فقیر اور عامل دن رات دکھاتے رہتے ہیں لیکن کامل بزرگوں کی کرامات کچھ اور چیز ہے ۔روحانی طاقت سے کیا کچھ نہیں ہوسکتا ۔اس کے ذریعہ سے مہلک بیماریوں کا علاج ہوسکتا ہے جیسے کہ ہپناٹزم سے ہوتا ہے ۔ہمارے کاملین اپنی قوت خیال کا اثر ڈال کر لوگوں کو ایسے نظارے دکھا سکتے ہیں جن کا وجود ہی نہیں ہوتا (یہ چیز سیمیا کہلاتی ہے)۔ہزاروں میل کے فاصلہ پر روحانی پیغام بھیج کر اپنے کسی معتقد سے اس پر عمل کراسکتے ہیں (یہ ٹیلی پیتھی کہلاتی ہے)۔موجود چیزوں کو ناظرین کی نظر سے غائب کردیتے ہیں حالانکہ وہ وہیں ہوتی ہیں ۔خود بھی اسی طرح غائب ہوجاتے ہیں ۔اپنے گھر بیٹھے بیٹھے ہزاروں میل کے فاصلہ پر دوستوں سے جسمانی ملاقات کر لیتے ہیں ۔چشم زدن میں ایک مقام سے ہزاروں میل دور مع جسم کے پہنچ جاتے ہیں ۔آگ پر چل سکتے ہیں ۔ہوا میں اڑ سکتے ہیں ۔پانی پر دوڑ سکتے ہیں ۔مادے کے پار گزر جاتے ہیں ۔برسوں زمین میں دفن رہنے کے بعد زندہ نکل آتے ہیں ۔مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا بنا دیتے ہیں ۔مردے کو زندہ کرسکتے ہیں ۔دوزخ اور جنت میں پہنچ کر وہاں کی سیر کرآتے ہیں بلکہ عرش تک پہنچ جاتے ہیں ۔

الغرض! روحانی طاقت سے کیا کچھ نہیں ہوسکتا ۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ واقعی کامل ہوتے ہیں ان میں اگر چہ یہ سب کچھ کرنے کی طاقت موجود ہوتی ہے ۔لیکن وہ ان

سب باتوں کو تضیع اوقات اور حرکات طفلانہ سمجھ کر کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہاں اگر اللہ کا حکم ہو تو پھر سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ آپ کو پوچھنا چاہیے کہ کامل صوفیوں کے علاوہ اور لوگ جو خوارق دکھاتے ہیں تو کیا وہ اللہ کے حکم کے بغیر خود اپنی مرضی اور اختیار سے ہی ایسا کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کی روحانی طاقت بہت معمولی قسم کی ہوتی ہے جو چند قسم کی مقررہ پریکٹسوں سے حاصل ہو جاتی ہے اس کو حاصل کر لینے کے بعد وہ مختار ہیں کہ جب چاہیں دکھائیں۔ ان لوگوں کا مقصد ذاتی نفع و نام نمود اور شہرت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں بطور پیشے اور فن کے اپنے ذاتی فائدے کے لیے کرتے ہیں۔ محض خدا کے لیے نہیں کرتے۔ صوفیائے عظام بھی اپنی مرضی سے جب چاہیں کرامت دکھا سکتے ہیں۔ لیکن ان کو مشیت الٰہی کا پتہ ہوتا ہے اور جہاں مشیت ایزدی ان کی خواہش کے خلاف ہوتی ہے وہاں یا تو وہ کرامت دکھانے کا ارادہ ہی ترک کر دیتے ہیں یا خدا سے اذن طلب کرتے ہیں۔

اللہ چاہتا ہے تو ان کی خاطر اپنی مشیت بدل دیتا ہے اور وہ کرامت دکھا دیتے ہیں ورنہ نہیں دکھاتے۔ ابتدائے سلوک ہی سے صوفیائے کرام کا مقصود اللہ تک رسائی ہوتا ہے کرامتوں کی قوت پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ یہ ساری طاقتیں تو ان کو سلوک طے کرتے ہوئے خود بخود مل جاتی ہیں۔ اس لیے ان کے دل میں ان کی کوئی قدر بھی نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب وہ طاقتیں ان میں پیدا ہو جاتی ہیں تو اگر وہ ان کے کرشمے دیکھنے دکھانے ہی میں لگ جائیں تو اللہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور جب وہ اللہ تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر یہی طاقتیں اور کرامات ان کو بچوں کا کھیل نظر آتی ہیں۔ ان کو تو وہ کچھ ملتا ہے جس کے مقابلہ میں یہ چیزیں اتنی بھی وقعت نہیں رکھتیں جتنی ایک گھاس کا تنکا۔

اس میں شک نہیں کہ اولیائے کرام کی توجہ اور دعا سے لوگوں کو ہر طرح کے فائدے پہنچتے اور بہت سے بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ بزرگ ان انفرادی فوائد کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ اصل کام جو اس طاقت سے لیتے ہیں وہ تو اجتماعی اصلاح ہے اور صحیح معنوں میں بنی نوع انسان کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ تمام پیغمبر بھی اسی غرض سے بھیجے گئے تھے۔

انفرادی طور پر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔ ہمارے آقائے محترم رسول اکرم ﷺ جب تشریف لائے تو سارا عرب جہالت' جدال وقتال اور مفلسی کے گھنگھور طوفانوں میں گھرا ہوا تھا۔ مگر حضور ﷺ نے ان کا افلاس دور کرنے کے لیے نہ تو پارس پتھری دی' نہ کیمیا کا نسخہ بتایا' نہ دست غیب کا عمل سکھایا (ہاں کبھی کبھی کاروباری مشورے ضرور دیئے) بلکہ اجتماعی طور پر سارے ملک کی اصلاح کے لیے اہل عرب کو خدا اور اس کے قانون سے روشناس کرایا۔ اور عمر بھر ناقابل بیان تکلیفیں اٹھا کر منوا دیا کہ ہاں خدا موجود ہے اور اس کا قانون سچا ہے اور جب انہوں نے اس قانون پر عمل درآمد شروع کر دیا تو ساری دنیا نے دیکھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب کی کایا پلٹ گئی۔ وہی عرب جو جاہل تھا مہذب بن گیا۔ جدال وقتال کی جگہ محبت' خلوص اور پریم نے لے لی۔ اور افلاس کا نام ونشان بھی نہ رہا۔ تیس برس کے قلیل عرصہ میں اہل عرب کے پاس قیصر وکسریٰ کے خزانے جمع ہو گئے اور کوئی بھی مفلس نہ رہا۔

اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ روحانی طاقت والوں کے لیے انفرادی طور پر لوگوں کی خدمت کرنا زیادہ وقیع اور اہم ہے یا اجتماعی طور پر ان کی تہذیب واصلاح کی کوشش۔

اب آپ شاید یہ سوال کریں کہ اصلاح تو ہمارے علمائے ظاہر بلکہ دنیاوی لیڈر اور ریفارمر بھی کر سکتے ہیں اس لیے روحانیت اور اہل روحانیت ہی کی کیا ضرورت ہے؟ تو میں کہوں گا کہ معاف فرمایئے آپ کا یہ سوال روحانیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ ایک تار جس میں بجلی نہ ہو ہرگز وہ کام نہیں کر سکتا جو بجلی سے بھرا ہوا ایک Living Wire کر سکتا ہے۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں یہ اگر ممکن ہوتا تو آج دنیائے اسلام کو اصلاح کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ سنئے میں نے ابھی Living Wire کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس تار میں بجلی دوڑ رہی ہو اس کو Living Wire کہتے ہیں اس کے لفظی معنی ہیں ''زندہ تار'' اہل روحانیت بھی ایک زندہ تار کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی رگ رگ میں ایک ایسی برقی قوت اور مقناطیسی کشش ہوتی ہے کہ آدمی خواہ مخواہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں ان پر عمل کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں اور بہت جلد نیک اور اچھے شہری بن جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان بزرگوں میں یہ طاقت بھی ہوتی ہے کہ جو آدمی کہنا نہ مانے یا کوئی

بری بات نہ چھوڑے اس پر متواتر توجہ کر کے وہ عادت چھڑا دیتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ ان کا اخلاق' اخلاق محمدی ﷺ کا نمونہ ہوتا ہے۔ اور جو کوئی ان کی صحبت میں رہتا ہے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ میرے خیال میں روحانی طاقت کا بیان امید سے زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ اب ہم کو عقل سلیم کا ذکر کرنا چاہیے۔

عقل سلیم:

خدا کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں عقل بھی ایک بڑی نعمت ہے اور انسان وحشت اور بربریت کی زندگی سے تہذیب و تمدن کی موجودہ بلندیوں تک اسی کی مدد سے پہنچا ہے۔ عقل نے اس کو اس مقام تک جس طرح پہنچایا وہ بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز داستان ہے مگر اس چھوٹے سے خطبہ اور محدود وقت میں کہاں بیان ہو سکتی ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ انسان نے اپنی پیدائش سے آج تک سفر ہستی کا جتنا راستہ طے کیا ہے اس میں عقل نے ایک لمحہ بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ سارا راستہ انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلایا اور ہر ہر قدم پر بتایا کہ اس ماحول میں جتنی چیزیں بھری پڑی ہیں ان میں سے یہ تیرے لیے مفید ہیں اور یہ مضر۔ یہ حیات آفریں ہیں اور یہ مہلک۔ یہ عقل ہی ہے جس نے ماکولات و مشروبات میں مفید و مضر اشیاء کا نہ صرف تعین کیا بلکہ ان کی مضرت اور افادیت کے درجات بھی مقرر کیے۔ یہ عقل ہی جس نے ملبوسات و مکانات میں ہر ماحول اور آب و ہوا کے مطابق طرح طرح کی ایجاد و اختراع کر کے ان کو انسان کے لیے آرام دہ بنایا۔ یہ عقل ہی ہے جس نے زراعت' تجارت اور بار برداری کے نئے سے نئے وسیلے ایجاد کیے اور انسان کو آبادیوں میں مل جل کر رہنے کے طور طریقے سکھائے۔

الغرض عقل ہی نے انسان کو پالا پوسا اور بڑا کیا۔ اور آج بھی جب کہ وہ عنفوان شباب کے آستاں پر قدم رکھ چکا ہے اس دایہ مہربان نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ آج بھی انسان کی انگلی اسی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ آسمانی سفر کی تیاری کر رہا ہے۔

عقل کے دو مدارج ہیں۔ پہلا **عقل صمیم** اور دوسرا **عقل سلیم**۔ اب تک جو کچھ بھی عقل نے کیا وہ

اس سطح زمین پر مادی اسباب ووسائل کے ذریعہ انسان کی بقاء اور ترقی کے لیے تھا یہ سب کام تھا عقل صمیم کا، لیکن انسان صرف گوشت پوست اور ہڈیوں کے ڈھانچے ہی کا نام نہیں۔اس کے خمیر میں مادی اجزاء کے علاوہ کچھ مابعد الطبیعاتی تقاضے اور ماورائی تمنائیں بھی ہیں۔ان تقاضوں کو پورا کرنا اور ان تمناؤں کے حصول میں مدد دینا عقل سلیم کا کام ہے۔یہ تقاضے اور تمنائیں بہت سی ہیں یہاں صرف دو بنیادی چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول یہ کہ ہر انسان بلا استثنٰی یہ چاہتا ہے کہ اسے اطمینان قلب نصیب ہو۔رنج و الم اس کے نزدیک بھی نہ آئے اور وہ ہمیشہ خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کرے۔

دوم یہ کہ انہی انسانوں میں کوئی کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو ہر وقت ہر شے اور ہر بات کی کنہ اور حقیقت معلوم کرنے کے درپے رہتا ہے اور اس کے دل میں ہر وقت یہ آوازیں اٹھتی ہیں:

میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جاؤں گا؟ میرے آنے کا مقصد کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ اس کا بنانے والا کوئی ہے یا نہیں ہے؟ ہے تو وہ کہاں ہے کیسا ہے اور اپنی مخلوق سے اس کا تعلق کس طرح قائم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے شق اول کے لیے ایک ایسے نظام اخلاق کی ضرورت ہے۔جس کا پابند رہ کر انسان امن وامان کی زندگی بسر کر سکے۔یہ نظام اخلاق کیا چیز ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟

سنیے! دنیا میں کوئی آدمی بھی تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ہر شخص مجبور ہے کہ احتیاجات زندگی کے حصول اور جذبات کی تسکین کے لیے دوسروں سے مدد لے اور میل جول پیدا کرے۔اس کے ساتھ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ہر انسان کی طبیعت فطرتاً اور تربیتاً دوسروں سے کسی نہ کسی قدر مختلف اور بعض اوقات بالکل متضاد ہوتی ہے۔اس واسطے جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو تصادم ہو جاتا ہے۔جس سے عناد، فساد اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور بعض اوقات نوبت قتل و غارت تک پہنچتی ہے۔یہ چیز نوع انسانی کی فلاح و بہبود اور ترقی و بقاء کے لیے سم قاتل ہے۔اس لیے ناگزیر ہوا کہ کوئی طریقہ اور راستہ دریافت کیا جائے کہ یہ اختلافات اور فتنہ و فساد بالکل ختم نہ ہو سکیں تو اس حد

تک کم ضرور ہو جائیں کہ تخریب و تباہی کا خوف جاتا رہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ انسانی افعال و اعمال اور تخیلات میں زیادہ سے زیادہ یکسانیت نہ پیدا ہو۔ اس موقع پر جب فکر عاجز ہونے لگی تو عقل سلیم نے آگے بڑھ کر دستگیری کی اور انسان کے تمام اعمال و افعال اور تخیلات بلکہ حرکت و سکون تک سب کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور بتلایا کہ دیکھو حصہ اول میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب خیر کہلاتی ہیں اور حصہ دوم میں جو کچھ ہے اس کو شر کہتے ہیں۔ جو چیزیں خیر ہیں وہ انسان کی ترقی و تعمیر' بقاء و بہبود' خوشی و خوش حالی اور اطمینان و سکون کا موجب ہوتی ہے اور جتنی چیزیں شر ہیں وہ تنزل و تخریب' ہلاکت و تباہی' فلاکت و افلاس اور انتشار و الم کا سبب بن جاتی ہیں۔ اس لیے خیر کو اختیار کرو اور شر سے بچو۔ اگر تم میرا کہنا مانو گے تو قیامت تک پھولو پھلو گے اور خدا کی لامحدود نعمتوں سے متمتع ہو گے۔ نہ مانو گے تو فنا ہو جاؤ گے اور فنا نہ بھی ہوئے تو وحشت و بربریت کی زندگی بسر کرو گے۔ چنانچہ جن قوموں نے عقل سلیم کے مشورہ پر جتنا زیادہ عمل کیا وہ دوسری قوموں سے اتنی ہی زیادہ معزز و مفتخر ہوئیں اور آسائش و آرام سے رہیں۔ جنہوں نے نہ مانا وہ خراب و خوار ہوئیں اور آج تک ہیں۔ یقین نہ آئے تو وحشی قبائل کی حالت دیکھ لو۔

غور کرو تو یہ نظام اخلاق وہی قانون الہٰی ہے جو مذہب پیش کرتا ہے۔ عقل سلیم کا کام نظام اخلاق کی تدوین پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ہمیشہ دو بہت ہی اہم امور میں مصروف رہتی ہے۔

دوسری شق میں جتنے بھی امور ہیں وہ سب مابعد الطبیعاتی اور ماورائی ہیں اور اس راہ کا مسافر تو عقل سلیم کی مدد کے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر اس میدان میں عقل سلیم آخری منزل تک سالک کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تاہم وہ اس کو صراطِ مستقیم پر ڈال کر ایک ایسے آستان قدسی تک پہنچا دیتی ہے جس میں داخل ہونے کے بعد ہر مشکل آسان اور ہر راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کا کام اور فلسفہ کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ یہاں سے ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتی اور بے اختیار پکار اٹھتی ہے۔

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

اس آستاں سے آگے کا راستہ قلب سلیم کی معیت و رہنمائی میں طے ہوتا ہے مگر وہ بھی آخری منزل تک ساتھ نہیں دے سکتا۔ راستے ہی میں تھک کر بیٹھ جاتا ہے پھر کیا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے کسی زبان میں بھی کوئی لفظ نہیں ہے لہٰذا خاموشی ہی آخری جواب ہے۔

قلب سلیم:

چوتھی نعمت جو تصوف کی بدولت انسان کو ملتی ہے اور جو انسان کو فرشتوں سے بھی افضل بنا دیتی ہے' قلب سلیم ہے۔ قلب سلیم سے انسان کو کیا کیا ملتا ہے' یہ الفاظ میں نہیں بتایا جا سکتا صرف کر کے دیکھنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ تاہم اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ مدت دراز تک عبادت' مجاہدہ' تزکیہ اخلاق اور ذکر و فکر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک کا قلبی تعلق ساری دنیا سے قطع ہو کر صرف اللہ سے قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی بمصداق وتبتل الیہ تبتیلا وہ سب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو رہتا ہے۔ اللہ سے اس کی قوی نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ ہر امر میں اس کو اللہ سے براہ راست ہدایت ملنے لگتی ہے اور وہ خیر و شر کی پہچان اور اپنے حقوق کی بجا آوری میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔ دنیا کے جتنے انفرادی یا اجتماعی مسائل اسے پیش آتے ہیں سب کو کماحقہ سمجھتا اور ہمیشہ صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ جتنے آدمی اس سے ملتے ہیں ان میں سے جو ملنے کے قابل نہیں ہوتے اس کا دل ان کی طرف کبھی مائل نہیں ہوتا۔ باوجود اس کے وہ ان سے بھی بڑے پیار اور اخلاق سے ملتا ہے اور جو خدمت ممکن ہو اس سے گریز نہیں کرتا۔ قلب سلیم کی برکتیں کہاں تک گنوائی جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ صاحب قلب سلیم براہ راست اللہ کی نگرانی اور حفاظت میں آ جاتا ہے اور ہر قسم کے مضرات اور مہلکات سے بچا رہتا ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ایسے آدمی کا دنیا اور امور دنیوی سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رہتا۔ وہ دنیا کے سارے کام اسی طرح کرتا ہے جیسے ایک غیر صوفی اور عام نیک آدمی کرتا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کو کسی رنجیدہ بات کا رنج اور خوش کن بات کی خوشی نہیں ہوتی۔ یا غریبوں' بیماروں اور بے کس و لاچار آدمیوں کو دیکھ کر اس کا دل نہیں دکھتا۔

لیکن کوئی تاثر بھی دو چار منٹ سے زیادہ نہیں رہنے پاتا اور اس قلیل عرصہ میں بھی وہ خدا سے

غافل نہیں رہتا۔اس کی حالت بالکل حرف مشدد کی سی ہوتی ہے کہ ایک طرف مخلوق میں شامل ہوتا ہے تو دوسری طرف اللہ سے واصل رہتا ہے۔کیا اس سے زیادہ نعمت ایک انسان کے لیے اور بھی کوئی ہو سکتی ہے آیئے اب دعا کریں کہ اللہ ہم سب کو ایسا ہی قلب سلیم عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین

خام الخدام

عبدالحکیم انصاری

لاہور، 10 اپریل 1964ء

خطبہ......4

24-4-1965

کو ساتویں سالانہ اجتماع پر بمقام لاہور ارشاد فرمایا

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ..........السلام علیکم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو ایک سال بعد پھر اکٹھے ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہماری صحت اچھی رکھی۔ زندگی دی اور اپنے راستہ پر ہماری طلب کو پہلے سے زیادہ ترقی بخشی۔ اس کے بعد اہل حلقہ لاہور خصوصاً جناب محمد علی صاحب، محمد قاسم صاحب اور چوہدری جلال الدین صاحب کا شکریہ بھی اپنی اور آپ سب کی طرف سے ادا کرتا ہوں۔ محمد علی صاحب نے اس مرتبہ پھر اجتماع کا پورا بار خود اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ دولت اور صحت دے اور مزید نیکیوں کی توفیق بخشے۔ قاسم صاحب اور چوہدری جلال الدین صاحب نے حسب دستور اپنی کاروباری مصروفیتوں کو نظر انداز کر کے اجتماع کے انتظام و انصرام میں اپنے وقت عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تمام دلی مرادیں بر لائے۔ آمین

آخر میں ان تمام دوستوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جو دور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے تشریف لائے اور جلسہ کی رونق و کامیابی کا باعث ہوئے۔

برادران حلقہ! اس خوشی و مسرت کے موقع پر میں آپ کو ایک بہت ہی اندوہناک واقعہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ گزشتہ سال کے دوران ہمارے ایک بہت ہی عزیز بھائی کو موت کے ظالم پنجے نے ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا کر دیا۔ میری مراد مرحوم و مغفور سارجنٹ محمد سلیمان صاحب سے ہے۔ جنہوں نے کچھ ماہ ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم نے ایک بوڑھی ماں اور بھائی بہنوں کے علاوہ اپنے پیچھے ایک بیوہ اور ایک شیر خوار بچہ چھوڑا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خود ان سب کی دستگیری و سرپرستی فرمائے اور مرحوم کو اپنا قرب عطا کرے۔ آمین

مرحوم بہت بڑی خوبیوں اور نہایت ہی اعلیٰ کردار کے انسان تھے۔ بہت تھوڑے عرصہ میں بہت نمایاں روحانی ترقی کی تھی۔ اگر زندہ رہتے تو ہمارے حلقہ کے لیے نہایت قابل فخر ثابت

ہوتے ۔مرحوم کے علاوہ حلقہ کے اورکئی بھائیوں کے والدین اورقریبی رشتہ دار بھی اس سال اللہ کو پیارے ہوئے ۔ میں اپنی اور تمام اہل حلقہ کی طرف سے ان سب کی وفات پر اظہار تعزیت و ہمدردی کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔آمین

آیئے اب ہم سب ان کے لیے دعائے مغفرت کریں ۔

برادران حلقہ! پچھلے تین سال کے خطبات میں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ قرآن میں جس تصوف کا ذکر آیا ہے اور رسول کریم ﷺ نے جس تصوف کی تعلیم دی ہے وہ کیا تھا ۔لیکن مرور ایام سے رفتہ رفتہ کیا سے کیا بن گیا ۔انہی خطبات میں آپ کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تصوف کا مقصد حصول کشف وکرامات ہرگز نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ تصوف کا مقصد تو ذات باری تعالیٰ کا قرب وعرفان ہے ۔آج کے خطبے میں میں یہ بیان کروں گا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے طریقے کیا ہیں ۔یعنی باری تعالیٰ کا قرب وعرفان کس طرح میسر آ سکتا ہے ۔

قرب وعرفان کے حصول کا طریقہ:

یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس طرح ہر علم کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے چند متعین طریقے ہوتے ہیں ۔بالکل اسی طرح تصوف کے مقصد یعنی ذات باری تعالیٰ کا قرب وعرفان حاصل کرنے کے بھی چند خاص طریقے ہیں ۔ان طریقوں پر عمل کرنے کو "سلوک" کہتے ہیں ۔تصوف دوسرے مذاہب میں بھی ہے لیکن ان کا سلوک اس قدر مشکل ہے کہ اگر کوئی اس پر پوری طرح عمل کرے تو دنیا کا کام کر کے اپنی اور بال بچوں کی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ملتا ۔یہی وجہ ہے کہ ان تمام مذاہب میں دنیا کو چھوڑے بغیر کام نہیں بنتا ۔مذہب اسلام کا سلوک ایسا نہیں ہے ۔اس میں سالک دنیا کے سارے کام بوجوہ احسن کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے ۔یہ قاعدے نہایت ہی سادہ اور سہل العمل ہیں ۔مگر سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ سلوک شروع کرتے وقت انسان اچھا مسلمان ہو یعنی اس کے عقائد' عبادات اور اعمال قرآن کے مطابق ہوں ۔وہ نماز'

روزے وغیرہ کا پابند ہو' حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اچھی طرح پورا کرتا ہو' کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور اس کا اخلاق اسلامی تعلیم کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ اگر کسی شخص میں یہ سب باتیں نہیں ہیں تو پہلے اس کو ایک اچھا اور پکا مسلمان بننا چاہیے پھر سلوک شروع کرنا چاہیے۔

بات دراصل یہ ہے کہ صرف نماز روزہ وغیرہ کی ادائیگی اور امر و نہی کی پابندی سے آدمی پکا مسلمان تو ضرور بن جاتا ہے لیکن ولی اللہ نہیں بن سکتا۔ ورنہ جتنے بھی نمازی مسلمان ہیں آج یہ سب ولی اللہ ہوتے۔ ولی اللہ بننے کے لیے کچھ اور اونچے درجے کی عبادت اور تزکیہ اخلاق کی بہت ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں کچھ اعرابی مسلمان ہونے کے لیے حاضر ہوئے۔ جب حضور ﷺ نے ان کو مسلمان کرلیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ مبارک ہو ہم ایمان لے آئے۔ اس پر حضور اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰـكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات:14)

یعنی "اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔ ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔"

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ پہلے آدمی مسلمان بنتا ہے۔ پھر اس سے آگے ترقی کرکے مومن بنتا ہے اور پھر اس سے بھی زیادہ ترقی کرکے مرتبہ احسان پر فائز ہوتا ہے۔ یعنی ولی اللہ بن جاتا ہے۔ مومن کی پہچان حضور رسول کریم ﷺ نے یہ بتائی ہے کہ جب وہ عبادت کرے تو یوں محسوس کرتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور مرتبہ احسان کی پہچان یہ بتائی ہے کہ جب وہ عبادت کرے تو یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اس حدیث اور متذکرہ صدر آیت سے یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ ولی اللہ بننے کے لیے انسان کو پہلے پکا مسلمان بننا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ مومن اور آخر میں ولی کامل بن سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ احباب حلقہ بیعت ہونے کے بعد عبادات اور شریعت کے دوسرے احکام پر اچھی طرح عمل کریں۔ جو لوگ ایسا نہیں کریں گے وہ اپنا مقصد حاصل نہ کرسکیں گے۔ البتہ جو لوگ پہلے ہی عبادت و شریعت کے پابند ہوں گے وہ

بیعت ہونے کے بعد سلوک کے طریقوں پر عمل کر کے بہت جلد کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

ذکر پاس انفاس:

اسلامی سلوک میں کوئی دقت یا پیچیدگی مطلق نہیں۔ بلکہ جس طرح اسلام ایک سیدھا اور آسان مذہب ہے اسی طرح اسلام کا سلوک بھی بالکل سادہ اور آسان ہے۔اس میں دوسرے مذاہب کی طرح نہ تو ترک دنیا لازمی ہے نہ ایسے سخت مجاہدے اور ریاضتیں ہیں جن سے جسم اور نفس کو اذیت پہنچے۔اس سلوک کے صرف دو حصے ہیں ایک تو **ذکر** دوسرے **تزکیہ اخلاق**۔ذکر میں نماز اور تلاوت قرآن بھی شامل ہے۔لیکن یہ دونوں چیزیں تو ہر مسلمان کرتا ہی ہے سالک کو ان کے علاوہ کچھ اور ذکر بھی کرنا پڑتا ہے۔وہ ذکر دو طرح کا ہے ایک "پاس انفاس" دوسرا "نفی اثبات" ان دونوں اذکار کی اصل قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ سے اخذ کی گئی ہے۔پاس انفاس تو یہ ہے کہ جب آپ کا دماغ دنیوی امور سے خالی ہو اس وقت ہر سانس سے لفظ اللہ دل میں کہیں۔نفی اثبات کلمہ طیبہ کا ذکر ہے۔اس کا طریقہ آپ سب جانتے ہیں اس لیے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

الغرض ان دونوں اذکار میں کوئی بھی ایسا نہیں جو قرآن یا حدیث کے خلاف ہو۔

اسلامی سلوک کی ابتدا اور انتہا اللہ تبارک وتعالی نے سورہ مزمل کی ایک چھوٹی سی آیت میں بیان کر دی ہے فرماتے ہیں:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل: 8)

یعنی "اپنی رب کے نام کا ذکر کرو اور سب کو چھوڑ کر اللہ کے ہو جاؤ۔"

ظاہر ہے کہ رب ایک صفاتی نام ہے ذاتی نام ہاری تعالی کا اللہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ لفظ اللہ کا ذکر کیا کرو۔یہ ذکر کس طرح کیا جائے اس کا طریقہ بھی اللہ تعالی نے خود ہی بتایا ہے۔فرمایا ہے:

وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِينَ (الاعراف: 205)

یعنی "اور اپنے رب کو دل میں یا دکرو زاری اور ڈر سے زبان سے آواز نکالے بغیر صبح اور شام

اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ (النساء:103)

یعنی ''اور جب تم نماز ختم کر چکو تو اللہ کو یاد کیا کرو۔ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے۔''

ذکر کے متعلق جو اور آیات قرآن مجید میں ہیں ان کو اور ان دو آیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اولیائے کرام نے یہ نتیجہ نکالا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو چوبیس گھنٹے برابر ہی یاد رکھنا چاہیے اور اس یاد سے غفلت کبھی نہیں کرنی چاہیے۔

اب چونکہ ہر کام کا ایک مناسب قاعدہ ہوتا ہے اس لیے انہوں نے اللہ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لیے پاس انفاس کا طریقہ ایجاد کیا۔ یعنی ہر سانس سے جو باہر نکلے یا اندر آئے لفظ اللہ دل میں کہا جائے آواز نکالے بغیر مگر بے خیالی اور بے پروائی سے نہیں بلکہ جب بھی دل اللہ کہے تو محبت کے ساتھ اللہ کا خیال بھی دل میں آئے۔ درحقیقت اس سے بہتر اور کوئی طریقہ اللہ کو ہر وقت یاد رکھنے کا ہے بھی نہیں۔ عام طور پر جس چیز یا جس بات کو یاد رکھنا ہو اس کو کسی ریفرنس یعنی حوالہ یا وسیلہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ یاد رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں اس کا ماحول اور کیفیات تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد برابر بدلتی رہتی ہیں۔ ابھی آپ گھر میں تھے تو کچھ دیر بعد آپ دفتر پہنچ گئے' پھر کچھ دیر بعد آپ بازار میں تھے' تو پھر کسی میدان یا باغ میں چلے گئے۔ ان متواتر تغیرات کی وجہ سے آپ کسی چیز کو بھی اللہ کی یاد کا وسیلہ نہیں بنا سکتے۔ لیکن آپ کا سانس ایک ایسی چیز ہے جو ہر جگہ اور ہر حال میں یکساں طور پر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس لیے سانس کے علاوہ اور کوئی ایسا وسیلہ نہیں ہو سکتا جس کے ذریعہ سے خدا کو ہمیشہ یاد رکھا جا سکے۔

اسم ذات کا پاس انفاس اگر باقاعدہ اور کچھ مدت تک جم کر کیا جائے تو اس سے پہلا فائدہ جو سالک کو پہنچتا ہے وہ اطمینان قلب کا حصول ہے' اور یہ وہ دولت ہے جس کے لیے تمام علماء و تمام فلاسفر اور تمام ماہرین نفسیات دن رات مارے مارے پھرتے ہیں اور نت نئے طریقے سوچتے اور

ایجاد کرتے ہیں لیکن کچھ بن نہیں پڑتا۔لیکن اسم ذات کے پاس انفاس سے یہ دولت بے قیاس تھوڑے ہی عرصہ میں حاصل ہو جاتی ہے۔اور کیوں نہ ہو جب کہ اپنے کلام پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اطمینان قلب حاصل کرنے کا یہی نسخہ تجویز فرمایا ہے' ارشاد ہوتا ہے:

اَلاَ بِذِکْرِ اللہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد:28)

یعنی ''بے شک اطمینان قلب اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سالک اپنی منزل مقصود کا راستہ سالوں کی بجائے مہینوں میں طے کرتا چلا جاتا ہے اور تھکتا نہیں۔

تیسرے یہ کہ اسی ذکر سے وہ برقی حرارت قلب میں پیدا ہوتی ہے جس کو روحانی طاقت کہا جاتا ہے اور اسی حرارت سے وہ سرخوشی اور کیف و سرور سالک کو حاصل ہوتا ہے جو دنیوی حرام شراب پینے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ان تمام فوائد کے علاوہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اسی ذکر کے ذریعہ سے انسان کا تعلق خدا کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور جوں جوں اس ذکر میں پختگی پیدا ہوتی ہے یہ تعلق گہرا اور قوی سے قوی تر ہوتا رہتا ہے۔یہاں تک کہ حضور رسول کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق آخر کار اللہ تعالیٰ اس سالک کے کان بن جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے' اس کی آنکھیں بن جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے' اس کے ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ کام کرتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے سالک کو معمولی نماز کے علاوہ کافی وقت نوافل میں گزارنا پڑتا ہے۔لیکن اصل روح ان نوافل میں بھی اسی ذکر کی ہوتی ہے۔

الغرض اس طرح سالک کو خدا سے ایک قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔اور اب وہ اس قابل ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کا قرب و عرفان حاصل کر سکے لیکن یہ سب کچھ دس پانچ ماہ یا دو چار سال میں نہیں ہو سکتا۔اس مرتبہ تک پہنچنے کے لیے کافی وقت لگتا ہے۔<u>ہمارے حلقہ کے جو دوست دو چار سال اللہ اللہ کرنے کے بعد ہی شکایت کرنے لگتے ہیں کہ ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔وہ شاید قرب و عرفان باری تعالیٰ کو مذاق یا دل لگی خیال کرتے ہیں یا کوئی ایسی سستی چیز سمجھتے ہیں جو بازار سے پیسے دے کر خریدی جا سکتی ہے۔میں آپ کو یہ بتانا چاہتا</u>

ہوں کہ اگر تمام عمر محنت اور اللہ اللہ کرنے کے بعد مرتے وقت بھی یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ کیوں کہ روح کا خاصہ یہ ہے کہ جس کی محبت میں اس دنیا سے سفر کرتی ہے اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوتا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر آپ کو اس دنیا میں قرب و عرفان یا لقائے باری تعالیٰ حاصل نہ ہو سکے تو مرنے کے بعد تو ضرور یہ سب چیزیں حاصل ہو جائیں گی۔آپ کو سوچنا چاہیے کہ انسان کا ابدی گھر تو وہی ہے۔اگر وہاں ایک آدمی اللہ کے مقربین میں ہو تو پھر اس کو اور کیا چاہیے۔

سورہ واقعہ میں اشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے تین گروہ ہوں گے۔ایک بائیں والے اور ایک دائیں والے اور ایک آگے والے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بائیں والے عذاب میں مبتلا ہوں گے یعنی دوزخی ہوں گے دائیں والے عیش و آرام میں ہوں گے یعنی جنتی ہوں گے اور آگے والوں کے متعلق ارشاد ہے کہ ان کا کیا کہنا۔وہ تو آگے ہی بڑھنے والے ہیں اور وہی مقرب ہیں۔تو جو لوگ نیکی یا عبادت محض اللہ کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں کسی معاوضے اور بدلے کے خیال سے نہیں کرتے وہی مقربین میں ہوں گے اور یہ اتنی بڑی نعمت اور اتنا بلند مرتبہ ہے کہ کوئی دوسری نعمت اور کوئی دوسرا مرتبہ اس کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتا۔

تو اے برادران حلقہ! میری گزارش آپ سے یہی ہے کہ آپ نیکی کریں تو اللہ کی خوشنودی کے لیے عبادت کریں تو محض اللہ کے لیے اور محبت کریں تو اس کے واسطے۔آپ کے تمام اعمال و افعال اور جدوجہد کا مقصد وحید یہی ہونا چاہیے کہ آپ کو اللہ کا قرب حاصل ہو۔جیتے جی ہو جائے تو سبحان اللہ ورنہ مرنے کے بعد تو ضرور ہی یہ دولت میسر آ جائے۔اگر آپ کی یہ خواہش مستقل اور آپ کا ارادہ پکا رہے تو ناممکن ہے کہ آپ کو اپنی محنتوں کا ثمر نہ ملے۔اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔

نفی اثبات:

یہ تو ہوا ذکر پاس انفاس کا بیان۔دوسرا ذکر جو ہمارے سلسلہ میں کرنا پڑتا ہے وہ کلمہ لاَ اِلٰــــــہَ اِلاَّ اللہ کا ذکر ہے۔اس ذکر کو ذکر نفی اثبات اس لیے کہتے ہیں کہ لا الہ کہتے وقت دماغ کو ہر خیال

او رو سوسہ سے بالکل خالی کرلیا جاتا ہے اور الا اللہ کہتے وقت صرف اللہ کا خیال دل میں جاگزیں رکھا جاتا ہے۔ یہ ذکر آہستہ آہستہ اور بہتر یہ ہے کہ بالجہر کیا جائے۔ یہ دراصل نفی اور اثبات کی مشق کرانے کے لیے کرایا جاتا ہے۔ اس لیے جب تک ذاکر لاالٰہ پر دو چار سیکنڈ ٹھہرے گا نہیں نفی کی مشق نہ ہو سکے گی۔ اسی طرح الا اللہ کے بعد جب تک چند سیکنڈ کا وقفہ نہ ہوا اثبات کی عادت نہ پڑے گی۔ یہ ذکر بالکل تنہائی میں نہایت جمعیت خاطر کے ساتھ کرنا چاہیے۔ بہت سے آدمیوں کے ساتھ حلقہ ذکر میں بالجہر ذکر کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں لیکن اصل فائدہ تنہائی میں آہستہ آہستہ ذکر کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ پچھلے خطبوں میں سے کسی ایک میں بتا چکا ہوں کہ جب تک نفی کی مشق کافی نہ ہو عالم روحانی سے دماغ کا تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفی کی کیفیت نہ ہو تو انسان کے پانچوں حواس ظاہری اس کا تعلق دنیا اور ماحول سے قائم رکھتے ہیں۔ لیکن نفی کی حالت میں یہ حواس معطل ہو جاتے ہیں اور جب یہ حواس معطل ہو جائیں تو لاشعور بیدار ہو جاتا ہے اور لاشعور اس مادی دنیا اور روحانی دنیا کے بیچ میں ایک برزخ ہے۔ جب حواس ظاہری معطل اور لاشعور بیدار ہو جاتا ہے تو سالک کا تعلق مادی عالم سے منقطع ہو کر روحانی عالم سے جڑ جاتا ہے۔ نفی کی زیادہ مشق کرنے کے لیے ذکر نفی اثبات کے علاوہ اور اوقات میں بھی کوشش کرنی چاہیے۔ مثلاً دن میں کسی وقت جب مکمل تنہائی ہو یا رات کو سوتے وقت دماغ سے تمام خیالات نکال کر نفی کی حالت میں کچھ دیر بیٹھے رہنا یا سو جانا بہت مفید ہے۔ مگر نفی کی بہت زیادہ مشق بہت احتیاط سے کرنا چاہیے اور نفی کے وقفوں کو درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ بڑھانا چاہیے ورنہ نسیان پیدا ہونے اور بے ہوشی کے دورے پڑنے کا سخت خطرہ ہے جو کسی حالت میں بھی اچھا نہیں ہے۔ کامل نفی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انسان بھرے مجمع میں بیٹھا ہوتا ہے لیکن نہ تو اسے اپنے تن بدن کا احساس ہوتا ہے اور نہ کسی اور کی موجودگی کا۔ نہ اسے کوئی شکل دکھائی دیتی ہے نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن صرف نفی کی کیفیت پیدا کر لینا کافی نہیں' نفی کی حالت میں کسی خاص شخص یا چیز کا خیال دماغ میں پیدا کرنے اور اس خیال کو مستقلاً کچھ دیر تک قائم رکھنے کی طاقت و لیاقت کا پیدا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ یہی صحیح قسم کا ارتکاز خیال ہے اور اسی کو اثبات کہتے ہیں۔ نفی کی مثال اس سفید کاغذ کی سی ہے جو

بالکل صاف ہو اور اس پر ایک حرف بھی لکھا ہوا نہ ہو۔

اثبات کی مثال یہ ہے کہ اس سفید کاغذ پر صرف ایک نقطہ لگا دیا جائے یا ایک لفظ لکھ دیا جائے اب جو کوئی اس نقطہ یا لفظ کو دیکھے گا اس کی ساری توجہ اسی طرف مرکوز رہے گی اور کسی طرف نہ ہٹ سکے گی۔ اسی طرح جب سالک کو اچھی طرح نفی کرنے کی عادت ہو جائے تو وہ قوت ارادی سے اس نفی کے عالم میں اللہ کا تصور دماغ میں قائم کرے۔ اس طرح تصور کرنے سے سالک کو خدا کے ساتھ جو رابطہ پیدا ہو گا وہ دوسری کسی ترکیب سے نہیں ہو سکتا۔ ایسے تصور کے لیے اکثر احباب حلقہ مجھ سے یہ دریافت کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کے تو کوئی ایسا جسم نہیں جس کی مثال دنیا اور ہمارے علم میں موجود ہو۔ پھر ہم اس کا تصور کس طرح کر سکتے ہیں۔ میں ان سوالات کا بہت دفعہ جواب دے چکا ہوں اور اب یہاں بھی بیان کرتا ہوں۔

<u>پہلا طریقہ</u> تو یہ ہے کہ کسی تصور کی ضرورت ہی نہیں۔ صرف اللہ یاد ہو بغیر تصور کے۔ جو لوگ باقاعدہ پاس انفاس کرتے رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان کے دل میں قائم ہو چکی ہو ان کے لیے بغیر تصور کے اللہ کو یاد رکھنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ یہ چیز ان کو پہلے ہی سے حاصل ہے۔

<u>دوسرا طریقہ</u> یہ ہے کہ خلائے محض کا تصور کیا جائے۔

<u>تیسرا طریقہ</u> یہ ہے کہ لفظ اللہ کا تصور کیا جائے۔ ان میں سے جس طرح بھی اللہ کا اثبات ہو سکے کامیابی کے لیے کافی ہے۔

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا کی تفسیر:

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ سورہ مزمل کی متذکرۃ الصدر آیت کے پہلے ٹکڑے **وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ** کی تشریح ہے۔ اب وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا کی تفسیر بیان کی جاتی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ سب کو چھوڑ کر اللہ کے ہو جاؤ۔ یہ سلوک کی انتہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کو چھوڑ کر کہیں تنہائی میں جا بیٹھو اور ساری عمر اللہ اللہ میں بسر کر دو۔ مگر اس طرح ترک دنیا کو رہبانیت کہتے ہیں اور رہبانیت اسلام میں منع ہے۔ اگر اس آیت کا مطلب یہی ہوتا تو حضور اکرم a بھی ایسا ہی کرتے اور دنیا کو چھوڑ کر کہیں جنگل یا پہاڑوں میں جا بیٹھتے۔ لیکن حضور a کی

سیرت پاک گواہ ہے کہ حضورﷺ نے دنیا کو کبھی ترک نہیں کیا۔ بلکہ آخری دم تک دنیا کے سارے کام بخوبی انجام دیتے رہے۔ اس لیے اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کو چھوڑ کر رہبانیت کی زندگی اختیار کرو۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ قلبی و روحانی تعلق تمہارا صرف اللہ سے قائم رہے اور ساتھ ہی دنیا کے سارے کام بھی کرتے رہو۔ حلقہ کے بہت سے احباب مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ اہل دنیا کے جتنے حقوق ہیں سب پوری طرح ادا کرو۔ بیوی بچوں، ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب اور ہمسایوں بلکہ تمام مخلوق خدا سے عالمگیر محبت کرو۔

دوسری طرف کہتے ہیں کہ محبت اور دلی تعلق صرف اللہ سے رکھو۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہمارا دلی تعلق ہی کسی سے نہ ہو تو ہم اس سے محبت کس طرح کر سکتے ہیں اور جب محبت ہی نہ ہو تو اس کے حقوق کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔

اہل حلقہ کا یہ اعتراض واقعی بہت وقیع ہے اور بظاہر اس کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن اس کا صحیح جواب زبانی طور پر دیا جائے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ عمل کر کے دیکھا جائے تو سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مجھے اپنے ذاتی اور دوسرے احباب کے تجربے سے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بات بالکل ممکن ہے۔ دراصل محبت کے مدارج ہوتے ہیں۔ ایک آدمی اگر سو آدمیوں سے محبت کرتا ہے تو سب کی محبت برابر نہیں ہو سکتی۔ ہر دو آدمیوں کی محبت میں کچھ نہ کچھ کمی بیشی ضرور ہوتی ہے۔ ایک ماں کے دس بچے ہوں اور وہ سبھی سے محبت کرتی ہے۔ لیکن تمام بچوں سے اس کی محبت برابر نہیں ہوتی بلکہ ہر بچے کے ساتھ اس کی محبت میں دوسروں کی بہ نسبت کسی نہ کسی قدر کمی یا زیادتی ضرور ہوتی ہے۔ کسی بچے کے ساتھ اس کی محبت معمولی ہوتی ہے لیکن کسی سے یہ محبت عشق کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ماں باپ سب سے چھوٹے بچے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں دوسروں سے اتنی محبت نہیں کرتے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا کچھ شمار نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ہر فرد سے برابر کی محبت نہیں کرتا۔ انبیاء اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں، اس کے بعد صحابہ عظام اور پھر اولیائے کرام و قس علیٰ ہذا۔ بعینہٖ یہی حال خالق و مخلوق کے ساتھ سالک کی محبت کا ہوتا ہے۔ وہ واقعی مخلوق کے ہر فرد سے محبت کرتا ہے لیکن ہر ایک کے ساتھ اس کی محبت

کچھ کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ کمی بیشی خاص ماحول اور خاص حالات میں Association یعنی ربط وضبط اور معیت و یگانگت کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے۔ جو جتنا زیادہ ساتھ رہتا ہے، جتنی زیادہ خدمت کرتا ہے یا ہم خیال ہوتا ہے اس سے اتنی ہی زیادہ محبت ہو جاتی ہے۔ جس کے ساتھ یہ حالات و مواقع جس قدر کم پیش آتے ہیں اس سے اتنی محبت کم ہوتی ہے۔ محبت ہمیشہ اظہار ہمدردی اور خدمت سے ظاہر ہوتی ہے۔ جن لوگوں سے عمر بھر کبھی ملنا ہی نہ ہو ان کے ساتھ محبت کے اظہار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ سالک کے دل میں مخلوق خدا خصوصاً نوع انسان کی محبت کا جذبہ ہمیشہ موجزن رہتا ہے جس کا اظہار ملتے جلتے یا کسی کے حالات سنتے وقت برابر ہوتا رہتا ہے۔ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے دوسری طرف اللہ کی محبت کی آگ ہر وقت سلگتی رہتی ہے اور جب اس کو اللہ کا خیال آتا ہے یا اللہ کا نام اس کے کان میں پڑتا ہے تو وہ مخلوق کو بھول جاتا ہے اور صرف اللہ کی محبت محسوس ہونے لگتی ہے اور جب اس کو کوئی رنج یا تکلیف ہوتی ہے تو اس کا خیال رنج یا تکلیف پہنچانے والے کی طرف نہیں جاتا بلکہ یہی خیال آتا ہے کہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے۔ جب چوٹ لگتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ یا اللہ یہ سزا آپ نے مجھے کس جرم کی دی ہے۔ جب اس کو کوئی خوشی ہوتی ہے تو سجدہ شکر بجا لاتا ہے اور کہتا ہے کہ یا اللہ میں اس قابل نہ تھا یہ محض آپ کا فضل ہے۔ جب بازاروں اور محفلوں کی چہل پہل کو دیکھتا ہے تو بھی اس کو اللہ ہی یاد آتا ہے۔ باغ میں جاتا ہے ہوا اس کے جسم کو لگتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا ہی اس کو گدگدا رہا ہے۔ جب وہ سبزہ کو لہلہاتا، پرندوں کو چہچہاتا اور پھولوں کو مسکراتا دیکھتا ہے تو ان سب میں بھی اس کو خدا ہی کا حسن جہاں افروز نظر آتا ہے۔ جب مذبح میں جانوروں اور میدان جنگ میں زخمیوں کو تڑپتا اور سسکتا دیکھتا ہے تو وہاں بھی اس کو خدا کا ہاتھ ہی کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غرض مخلوق کا ہر فرد اس کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا سے اس کی آتش الفت کو بھڑکاتا رہتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب وہ مخلوق خدا کی طرف کسی کام کے لیے متوجہ ہوتا ہے تو پوری محبت سے ان کے ساتھ پیش آتا ہے اور جب اور کوئی اس کے سامنے نہیں ہوتا تو اس کا دل و دماغ صرف خدا کے ساتھ مشغول رہتا ہے۔

بقول مومن کیفیت یہ ہوتی ہے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یوں سمجھئے کہ وہ مخلوق سے جو محبت کرتا ہے اس کو اپنے خالق کی نشانی سمجھ کر کرتا ہے اس کے علاوہ سوائے خدا کے نہ کسی سے ڈرتا ہے نہ کسی قسم کی توقع رکھتا ہے۔ رنج یا خوشی ہو کچھ بھی پیش آئے وہ اس کو خدا کا عطیہ اور انعام سمجھتا ہے اور ہر حال میں راضی برضائے الٰہی رہ کر خوش اور مگن رہتا ہے۔

الغرض! یہی ہے وہ کیفیت جس کو اصطلاح تصوف میں **قطع ماسوئ اللہ** کہتے ہیں اور یہی تفسیر ہے وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلا کی۔ اس مقام تک پہنچنے کے بعد امتحانات اور آزمائشیں ختم ہو جاتی ہیں اور انعامات و اکرامات کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سالک کو کیا ملتا ہے۔ اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں کیوں کہ خدا کی نعمتیں بے شمار اور اس کا فضل ایک دریائے نا پیدا کنار ہے۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ سلوک کی ابتداء اور انتہا کی بابت تھا۔ لیکن ان دونوں کے درمیان بھی بہت کچھ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیتوں میں جابجا فرمایا ہے۔ ان سب آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صاحب مرتبہ احسان بننا چاہے تو اس کو عبادت و ذکر کے ساتھ ایک مثالی کردار بھی پیدا کرنا چاہیے جو تزکیہ اخلاق سے پیدا ہوتا ہے اور حق بھی یہی ہے کہ جب تک کسی کا اخلاق قرآن و سنت رسول اکرم ﷺ کے معیار کے مطابق نہ ہو وہ ولی اللہ تو کیا بنے گا اچھا مسلمان بھی نہیں بن سکے گا۔ اس لیے جو کوئی اللہ کا قرب و عرفان حاصل کرنا چاہے اس کے لیے اخلاق کا تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عبادت اور ذکر۔ تزکیہ اخلاق بغیر سخت کوشش اور مجاہدے کے بالکل ناممکن ہے کیوں کہ پرانی بگڑی ہوئی عادات کو دور کر کے نئی پاک اور صالح عادات پیدا کرنا اگرچہ ممکن نہیں تاہم بہت ہی دشوار بات ہے۔

تزکیۂ اخلاق:

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ آپ پر آپ کے ماں باپ، اہل وعیال، عزیز و اقارب، ہمسایوں، اہل محلّہ، اہل شہر، اہل وطن اور اہل جہاں کے بے شمار حقوق ہیں۔ ان حقوق کو اپنا فرض جان کر ادا کرنا اخلاق کہلاتا ہے۔ اب اگر آپ یہ حقوق خوشی و خوش اسلوبی سے ادا کریں تو یہ خوش اخلاقی ہے۔

لیکن اگر آپ یہ حقوق بد دلی سے بہ مجبوری و بہ کراہت ادا کریں تو یہ بداخلاقی ہے اور اگر آپ یہ حقوق ادا ہی نہ کریں تب تو آپ انسانیت کے دائرے ہی سے خارج ہیں، ہرگز انسان کہلانے کے مستحق نہیں۔ کوئی انسان اس دنیا میں دوسروں کی مدد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ بھی اپنی ضروریات زندگی کے لیے دوسروں کے دست نگر ہیں۔ پھر یہ کیا کہ آپ تو دوسروں کی مدد سے اپنی زندگی خوشگوار بنالیں لیکن خود دوسروں کی مدد نہ کریں۔ دنیا میں صرف وہی قوم اور وہی معاشرہ خوش حال اور طاقت ور بن سکتا ہے جس کے افراد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں اور ہر شخص دوسروں کی ہر ممکن مدد کر کے ان کو خوش حال اور طاقت ور بنانے میں مدد دے۔ مسلمانوں کی کمزوری اور پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے افراد گرے ہوؤں کو دو لاتیں اور لگانے اور بگڑے ہوؤں کو بالکل ہی مٹا دینے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں شاید یہ بات آپ کی نظر نہ چڑھ سکے لیکن دیہات میں جہاں آبادی تھوڑی ہوتی ہے یہ نظارے آپ اپنی آنکھ سے روزمرہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے حلقہ والوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے خاندان اور برادری میں جہاں تک ان کا دائرہ اثر ہو اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ کوشش نہایت نرمی، خوبصورتی اور محبت سے کی جائے۔ ورنہ لوگ انہی کے خلاف ہو جائیں گے اور فساد بجائے کم ہونے کے اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ اگر آپ کی کوششوں سے کسی ایک خاندان کی بھی اصلاح ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ ان شاءاللہ آپ کی نجات کا پروانہ مل گیا۔ کیوں کہ یہ خیر جاریہ ہوگی اور اس خاندان کی تقلید میں دوسرے لوگ بھی اصلاح کی طرف قدم اٹھائیں گے ورنہ خود اس خاندان کے افراد تو نسلاً بعد نسلاً خوب سے خوب تر ہوتے چلے جائیں گے۔

نفس کشی:

سلوک میں تزکیہ اخلاق کے جو طریقے رائج ہیں ان کو اصطلاح تصوف میں نفس کشی کہتے ہیں۔ **نفس کشی** کے لفظی معنی ہیں نفس کو ہلاک کرنا۔ ہلاک کرنے کا طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ نفس جو کچھ کہے اس کے خلاف کرو۔ اگر وہ کھانے کو کہے تو بھوکا رکھو۔ ٹھنڈا پانی طلب کرے تو پیاسا رکھو یا گرم پانی پلاؤ۔ سونے کو کہے تو جاگتا رکھو وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے مذاہب کے تصوف میں نفس کشی کے طریقے نا قابل یقین طور پر سخت و درشت ہیں۔ یہ لوگ اپنے جسم کو اس قدر تکلیفیں دیتے ہیں کہ اکثر اوقات جسم نکما اور دماغ بے کار ہو جاتا ہے۔ اکثر ہندو جوگی اور سادھو گرمی ہو یا سردی ہمیشہ ننگے رہتے ہیں۔جسم کی حفاظت بالکل نہیں کرتے۔ مئی اور جون کی کڑا کے دار دھوپ میں گرم اور تپتی ہوئی ریت پر پڑے جلتے بھنتے رہتے ہیں۔ سردی میں خواہ برف پڑ رہی ہو ایک لنگوٹی باندھے جنگل میں یا کسی سڑک کے کنارے سارا موسم گزار دیتے ہیں۔کئی کئی دن بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔کوئی شخص اپنا ایک ہاتھ پھیلائے برسوں کھڑا رہتا ہے یہاں تک کہ ہاتھ سوکھ جاتا ہے۔کوئی ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے اپنی ٹانگ سکھالیتا ہے۔عیسائی راہبوں میں جسم آزاری اس سے بھی کہیں زیادہ سختی سے کی جاتی ہے۔ایسے موٹے اون کے کپڑے پہننا جو بدن میں کانٹوں کی طرح چبھیں اور کئی کئی دن تک بھوکے پیاسے رہنا تو ان کی عام عادت ہے۔لیکن بعض بعض لوگ تو حد سے گزر جاتے ہیں۔مثلاً وہ اپنے جسم کو کوڑوں اور زنجیروں سے پیٹ پیٹ کر لہولہان کر لیتے ہیں۔اپنے بستروں پر کانٹے یا لوہے کی کیلیں اس طرح بچھاتے ہیں کہ نوکیں اوپر کو رہتی ہیں اور جب تک وہ لیٹے رہتے ہیں برابر چبھتی رہتی ہیں۔

دوسرے مذاہب میں بھی یہی کچھ ہے۔لیکن اسلام اس قسم کی جسم آزاری کی اجازت نہیں دیتا۔قرآن میں متعدد جگہ اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ "اپنے نفس کو ہلاکت میں مت ڈالو"۔ اسلامی سلوک میں تو کھانے پینے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔آپ بہتر سے بہتر اور نفیس سے نفیس غذائیں کھا سکتے ہیں۔ہاں بسیار خوری اور پُرخوری البتہ منع ہے۔اتنا ہرگز نہ کھانا چاہیے کہ طبیعت بھاری ہو جائے دن سستی اور کاہلی میں گزرے اور رات کو جب اللہ اللہ کرنے کا وقت آئے تو جاگنا محال ہو جائے۔کپڑوں پر بھی کوئی قید نہیں سوائے ریشمی لباس کے۔لیکن بہتر اور افضل یہی ہے کہ سلوک کے دوران سالک سادہ کھائے، سادہ پہنے اور ہر لحاظ سے سادہ زندگی گزارنے کی عادت ڈالے اور سپاہیانہ خصلت پیدا کرے ورنہ ایک تو سہل انگاری پیدا ہو گی دوسرے طبیعت میں ممکن ہے غرور وتکبر پیدا ہو جائے جو راہ سلوک کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اسلامی سلوک میں نفس کشی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی کی جو حدود مقرر کر دی ہیں ان کو قطع نہ کیا جائے بجائے خود یہ کام بھی کچھ آسان نہیں ۔اس کے لیے بھی سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ عام انسانوں میں نفس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ برائیوں کی طرف فوراً لپکتا ہے اور نیکیوں کی طرف بڑھنے میں سو حیل و حجت کرتا ہے ۔اس لیے سالک راہ طریقت کو چاہیے کہ ایسے برے ماحول اور بری صحبت سے دور بھاگے جہاں یہ اندیشہ ہو کہ نفس کسی برائی کی طرف راغب ہوگا' نیک اور خصوصاً اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھا کرے جہاں اللہ اور اس کے رسول a کا ذکر ہوتا ہو اور اچھی باتیں بتائی جاتی ہوں۔

بری صحبت آگ کی طرح ہے کہ اس میں ہاتھ ڈالو گے تو ضرور جلے گا۔ جو آدمی بری صحبت میں رہے گا اس میں برائی پیدا ہوگی۔ جو اچھی صحبت میں رہے گا اس میں خوبیاں پیدا ہوں گی ۔اس کے باوجود اگر نفس میں بری خواہش پیدا ہو تو فوراً دماغ کا رجوع پاس انفاس کے ذریعہ اللہ کی طرف کر لیجیے۔ اس طرح بھی کام نہ بنے تو وضو کیجیے اور دو چار نفل نماز ادا کیجیے اور استغفار کی دو ایک تسبیح پڑھیے ۔مقصد یہ ہے کہ کسی برے کام کا ارتکاب نہ ہونے پائے ۔یہ بات کہ دماغ میں برے خیال بھی نہ آئیں یہ مبتدیوں کے بس کی بات نہیں ۔یہ تو منتہیوں کا کام ہے اور یہ صفائی تو مرتے دم تک ہوتی رہتی ہے۔

قوتِ برداشت:

اعلیٰ ترین اخلاق پیدا کرنے کے لیے چند باتوں کی عادت ڈالنا ضروری ہے جس میں سب سے اہم چیز صبر یا قوت برداشت ہے ۔اس طاقت کے بل پر دنیاوی زندگی تو سکون و راحت سے بسر ہوتی ہے' روحانی منازل و مقامات طے کرنے کے لیے یہ اور بھی زیادہ مفید و مد ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ کا راستہ طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں زیادہ وقت اللہ کا خیال دل و دماغ میں رچا بسا رہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب کہ دل و دماغ تفکرات و تکلیفات سے متاثر نہ ہوں لیکن ایسا ہونا اگرچہ ناممکن نہیں بے حد مشکل ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ''ہم نے انسان کو تکلیفوں کے بیچ میں پیدا کیا ہے۔'' پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے اور ہر وقت نئے نئے غم و فکر کا مقابلہ کرتے ہوئے

دل ان سے کوئی اثر ہی نہ لے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مشکل ترین کام بھی "ذکر" کی بدولت آسان ہو جاتا ہے۔ ذکر سے سالک کے دل میں ایک ایسا سرور و نشہ پیدا ہوتا ہے جس کے مزے میں دل و دماغ بڑے سے بڑے فکر اور صدمے کا اثر قبول نہیں کرتے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ سے ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور ایسی لگن لگتی ہے کہ بڑے سے بڑے صدمے اور فکر کا اثر دس پانچ سیکنڈ یا زیادہ سے زیادہ دس پانچ منٹ سے زیادہ دل و دماغ پر مسلط نہیں رہنے پاتا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ چونکہ سالک ہر معاملے کو اللہ کی طرف سے سمجھتا ہے اور ہر بات میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس لیے وہ رنج و غم سے اس قدر متاثر نہیں ہوتا جس قدر عوام ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ خدا سے محبت کرتا ہے اس لیے خدا کی بھیجی ہوئی کوئی چیز بھی اس کو بری نہیں لگتی۔ علاوہ ازیں وہ قرآن پڑھتا ہے اور اس میں جو وعدے کیے گئے ہیں ان کی سچائی پر ایمان رکھتا ہے اس لیے وہ جانتا ہے کہ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے اور جو کچھ بھی بھیجتا ہے وہ اچھا ہی ہوتا ہے برا ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

"اللہ تم پر تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ تم کو پاک بنائے اور تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرے۔"

اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کسی پر مصائب یا تکالیف ڈالتا ہے تو تکلیف و آزار پہنچانے کے لیے نہیں ڈالتا بلکہ وہ اس کو اس قابل بنانا چاہتا ہے کہ اس پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرے۔ ایک سالک راہ طریقت کو چونکہ قرآن کی ہر آیت پر یقین کامل ہوتا ہے اس لیے تکلیف و مصیبت کے وقت وہ اس آیت کی روشنی میں تکلیف کی بجائے الٹا سکون حاصل کرتا ہے اور یہ یقین کر کے خوش ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تکلیف و مصیبت کے بعد ضرور کوئی اچھی سی نعمت عطا فرمائے گا۔ یہ بات تو سبھی مانتے ہیں کہ مصیبت میں خدا خوب یاد آتا ہے۔ اس لیے مصیبت اس لحاظ سے بھی اچھی ہے کہ وہ خدا کی یاد کو بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ مصائب میں سب سے بڑی مصیبت رزق کی کمی یا فاقہ کی ہے۔ سالک پر جب رزق کی تنگی ہوتی ہے یا سچ مچ ہی فاقے ہونے لگتے ہیں تب بھی وہ ہراساں نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کو یاد کر کے بے فکر ہو جاتا ہے کہ

میرا رزق آسمان میں ہے اور وہ مجھ کو ضرور پہنچایا جائے گا۔ اسی طرح وہ بیماری سے بھی نہیں گھبراتا۔ وہ جانتا ہے کہ بیماری سے گناہ ہلکے ہوتے ہیں اور خدا زیادہ یاد آتا ہے۔ اسے اطمینان ہوتا ہے کہ ہر ایک مصیبت کا وقت مقرر ہے جب وقت گزر جائے گا وہ تندرست ہو جائے گا۔ بیماری تو کیا وہ موت سے بھی نہیں ڈرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اس وقت سے نہ ایک ساعت پہلے آ سکتی ہے نہ بعد میں۔

الغرض! وہ کسی مصیبت اور تکلیف سے اپنے دماغ کو متاثر نہیں ہونے دیتا بلکہ مصائب و تکالیف میں اور بھی زیادہ اللہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے جس سے اس کو انتہائی سکون قلب حاصل ہوتا ہے اور اللہ سے اس کے تعلق اور قرب میں زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔

برادران سلسلہ! یاد رکھئے کہ ہر وہ شے جو خدا کی یاد سے غافل کر دے راہ سلوک کی رکاوٹ ہے۔ ترقی اسی وقت ہوتی ہے اور روحانی طاقت اسی وقت بڑھتی ہے جب کہ راستے کی رکاوٹوں کو قوت ارادی کی طاقت سے ٹھکرا کر دور کر دیا جائے۔ راستہ کی رکاوٹیں صرف مصائب و آلام ہی نہیں عیش و آرام اور دولت و ثروت زیادہ خطرناک رکاوٹیں ہیں۔ یہ سالک کو اللہ کی طرف سے بہت جلدی غافل کر دیتی ہیں۔ اس لیے جس کے پاس دولت و ثروت نہ ہو اس کو رنجیدہ نہ ہونا چاہیے بلکہ شکر کرنا چاہیے کہ اللہ نے اس کو ایسی مہلک آزمائش اور رکاوٹ سے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ نے دولت دی ہے ان کو ڈرنا اور ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں یہ سنہری روپہلی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اس کو خدا کے ساتھ ملنے سے باز نہ رکھیں۔ جس طرح سالک مصائب کے اثرات سے دل کو محفوظ رکھتا ہے اسی طرح دولت کا اثر بھی دل و دماغ پر ہرگز نہ ہونے دینا چاہیے۔ دولت بری شے نہیں اگر اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔ اس میں سے اگر اللہ کو قرض حسنہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ سینکڑوں گنا زیادہ کر کے واپس کرتا ہے۔ البتہ اگر اس کو لہو و لعب اور بدکاری پر اٹھایا جائے تو پھر یہ فتنہ عظیم ہے خدا کا قرب و عرفان تو بہت بڑی بات ہے۔ ڈر ہے کہ ایسے لوگوں کو جنت بھی شاید ہی ملے۔ اس لیے دولت کو برے کاموں میں ہرگز خرچ نہ کرو۔ نہ اس پر غرور د

تکبر کرنے لگو۔ ہر وقت خدا سے ڈرتے اور یہی دعا کرتے رہو کہ وہ تم کو دولت کے شر سے محفوظ و مامون رکھے اور نیک کاموں میں خرچ کرنے بالخصوص غریبوں کی مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قوت برداشت پیدا کرنے کی ایک آسان ترکیب یہ بھی ہے کہ غصہ اور نفرت کو بالکل نفی کر دیا جائے۔ غصہ ہمیشہ ایسی بات پر آتا ہے جو ناگوار ہو اور نفرت اسی چیز سے ہوتی ہے جو بری لگے۔ اس طرح کسی بات کے ناگوار ہونے یا بری لگنے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ دن میں متعدد بار ایسے واقعات ہوتے ہیں جو انسان کو ناگوار گزرتے ہیں اس لیے دن کا بیشتر حصہ جلنے کڑھنے اور غصہ کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ سکون نصیب نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کو ہر وہ بات بری لگتی ہے جو ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتی ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور وہ کوئی مفید کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس لیے سکون اور اطمینان قلب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی اس عادت کی اصلاح کرے اور کم از کم چھوٹی چھوٹی باتوں پر برا ماننا' منہ پھلانا' ناک بھوں چڑھانا اور چیں بہ جبیں ہونا چھوڑ دے۔ اس پر بھی اگر کبھی غصہ آ ہی جائے تو غصہ اتر جانے کے بعد یہ سوچنا اور غور کرنا چاہیے کہ آپ کو غصہ کرنے سے کیا فائدہ ہوا۔ بار بار غور کرنے اور سوچنے سے آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ غصہ کرنے سے فائدہ تو کچھ نہیں ہوتا' دل و دماغ البتہ پریشان ہو جاتے ہیں اور طبیعت کافی عرصہ تک بدمزہ رہتی ہے۔ یہی بات نفرت پر صادق آتی ہے۔ جن چیزوں یا آدمیوں سے آپ کو نفرت ہوتی ہے ان کا کچھ بگڑتا نہیں' خود آپ ہی کے دل و دماغ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر اس نقطہ نظر سے کافی عرصہ تک آپ غور کرنے کی عادت ڈال لیں تو بعد میں آپ کو خود اپنے اوپر ہنسی آنے لگے گی کہ کن فضول باتوں پر پریشان ہو کر خود اپنے آپ کو بے وجہ تکلیف پہنچاتے رہے ہیں۔

جب چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ آنا بند ہو جائے اور معمولی معمولی چیزوں سے نفرت جاتی رہے تو سمجھنا چاہیے کہ قوت برداشت ترقی کر رہی ہے۔ اس کے بعد بڑی بڑی باتوں پر غصہ اور نفرت کی نفی کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ نفرت کا جذبہ جاتا رہے اور صرف ناپسندیدگی باقی رہ

جائے ۔یاد رکھئے کہ غصہ جو ایک فطرتی جذبہ ہے بالکل تو نفی نہیں ہوگا تاہم کنٹرول اور قابو میں آ جائے گا۔اکثر اہل حلقہ مجھ سے کہا کرتے ہیں کبھی کبھی آپ کو بھی تو غصہ آ جاتا ہے ۔ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ غصہ صرف میری آواز اور چہرے ہی سے ظاہر ہوتا ہے میرے دل و دماغ پر غصہ کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوتا ۔بالکل اسی طرح جیسے طوفان کے وقت سمندر کی صرف سطح متلاطم ہوتی ہے نیچے تہہ پر کامل سکون ہوتا ہے ۔اگر کسی شخص کو یہ عادت پڑ جائے تو اسے حق ہے کہ ضرورت پڑنے پر غصہ کا اظہار کرلیا کرے ۔ہمارے حلقہ کے بہت سے آدمی افسر ہیں اور ان کو اپنے ماتحتوں سے کام لینا پڑتا ہے ۔اگر ماتحت نرمی سے نہ مانیں تو اس وقت اوپری دل سے ڈانٹ ڈپٹ اور غصہ کا اظہار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔میں نے تعمیر ملت میں صاف صاف تو لکھ دیا ہے کہ غصہ ایک فطرتی جذبہ ہے جو بالکل کبھی نہیں مرتا قابو میں ضرور آ جاتا ہے لیکن یہ بات اس کو بالکل نفی کرنے کی کوشش ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات جس پر غصہ قدرتاً آنا چاہیے اس پر غصہ ضرور آتا ہے لیکن وہ آپ کے دل و دماغ اور عقل کو اس قدر متاثر نہیں کر سکتا کہ آپ کوئی ناجائز یا نقصان دہ حرکت کر بیٹھیں ۔

اس تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے کوئی شخص آپ کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے آپ کو غصہ نہیں آنا چاہیے بلکہ جواباً اس کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی کا سلوک کرنا چاہیے ۔ہاں جب معاملہ آپ کی ذات سے گزر جائے اور آپ کی خاندانی ،قومی یا مذہبی عزت پر زد پڑتی ہو اس وقت غصہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔لیکن اس وقت بھی غصہ اس حد تک قابو میں رہنا چاہیے کہ کوئی غیر قانونی یا غیر شرعی حرکت ہرگز سرزد نہ ہونے پائے ۔آپ اپنے ناموس اور قومی و مذہبی عصمت و عزت کا دفاع کرنے کے لیے ہر ایسا قدم اٹھا سکتے ہیں جو شرعاً اور قانوناً جائز ہو ۔آپ روزانہ اخبارات میں ایسی خبریں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کو دو چار آنے یا دو چار روپیہ کے لیے جان سے مار ڈالا ۔اپنی مستورات کے متعلق ذرا سے شبہ پر کئی آدمیوں کو قتل کر ڈالا یا پورے خاندان کا صفایا کر دیا ۔گھر کو آگ لگا دی یا خودکشی کر لی ۔یہ سب حرکات معاشرہ کے

لیے بے حد تباہ کن ہیں اور محض اس وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ آدمیوں کو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے اور ان کی عقل ماری جاتی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اخبارات ایسی خبروں کو بڑی بڑی جلی سرخیوں سے خوب نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ شاید ان اخبارات کے ناشر یہ سمجھتے ہوں کہ اس طرح لوگوں کو عبرت ہوگی اور یہ جرائم کم کریں گے۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ نصیحت اور عبرت تو دو چار پڑھے لکھے لوگوں ہی کو ہوتی ہوگی البتہ جہلا کو ایسے جرائم کے ارتکاب پر جسارت ضرور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن مجید میں فرمایا ہے:

لاَیُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ (النساء: 148)

یعنی ''کسی بری بات کو بلند آواز سے بھی بیان نہ کرو۔''

یہ نعوذ باللہ بے کار تو نہیں فرمایا۔ سمجھنا چاہو تو موٹی سی بات ہے کہ آدمی جو کچھ سنتا ہے یا دیکھتا ہے وہی سیکھتا ہے۔ اس لیے یقینی ہے کہ بری باتیں کان میں پڑیں گی تو بری باتیں سیکھو گے' اچھی باتیں سنو گے تو اچھی باتیں سیکھو گے۔ مقصد اس تمام تقریر کا یہ ہوا کہ غصہ اور نفرت کی نفی کرنے سے قوت برداشت بڑھتی ہے جو دنیوی' دینی اور روحانی ترقی کے لیے ناگزیر اور اعلیٰ ترین کردار انسانی پیدا کرنے کے لیے ایک اہم ترین صفت ہے۔

قوت برداشت کیوں ایک اہم ترین صفت ہے؟ اس لیے کہ یہ انسان کی عقل کو ایسے نازک سے نازک موقعوں پر محفوظ اور قائم رکھتی ہے جب کہ جذبات کا تلاطم برپا ہوتا ہے۔ جن کی عقل جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے ان سے اضطراراً ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو ان کی اور ان کے خاندان کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں اور معاشرہ میں بھی فساد برپا کرتی ہیں۔ انسان کی فضیلت اور شرافت دوسری مخلوق پر صرف عقل کی وجہ سے ہے۔ اس لیے جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جائے اور اس کی عقل جاتی رہے اس وقت وہ ارذل المخلوقات ہوتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جذبات بری یا بے کار شے ہیں۔ جذبات نہ ہوں تو عمل ساقط ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ترقی اور چہل پہل نظر آتی ہے یہ سب جذبات ہی کی کارفرمائی ہے لیکن جذبات اس وقت تک

مفید اور کارآمد ہوتے ہیں جب تک عقل کی پاسبانی اور رہنمائی میں رہیں۔ مثال کے طور پر محبت ہی کے جذبے کو لیجیے۔ یہ کتنا پاک اور شریفانہ جذبہ ہے یہ نہ ہو تو دنیا میں امن وامان ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ امن وامان تو رہا ایک طرف' نوع انسانی اور دوسری مخلوقات کی پیدائش اور بقا بھی اسی جذبہ سے ہے۔ والدین خصوصاً ماں کو جو محبت اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے اسی کی وجہ سے وہ سو تکلیفیں اٹھا کر ان کی پرورش کرتی ہے۔ حیوانات میں بھی ہر مادہ اپنے بچوں کو محبت ہی کی وجہ سے پالتی ہے۔ محبت نہ ہو تو تمام مخلوق کی نسلیں تباہ ہو کر رہ جائیں۔ لیکن یہی محبت کا جذبہ اگر عقل کی رہنمائی سے محروم ہو جائے تو ایک کمینہ جذبہ بن کر رہ جاتا ہے۔ زنا جیسا جرم اور گناہ جس کا کوئی کفارہ ہی نہیں ایسی ہی حالت میں سرزد ہوتا ہے جب کہ جذبہ ہی جذبہ باقی رہے اور عقل جاتی رہے۔ زنا کے برے نتائج جو زانی اور معاشرے کو بھگتنے پڑتے ہیں ان کا خیال کرنے سے عقل مندوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جتنے قتل زنا کی وجہ سے ہوتے اور جتنے گھر اس کی وجہ سے اجڑتے ہیں اور کسی وجہ سے برباد نہیں ہوتے۔ اگر پاک بازی باقی بھی رہے تو یہی جذبہ محبت اپنی حد سے بڑھ کر عشق بن جاتا ہے اور عشق بھی جب اوسط سے زیادہ ہو جائے تو جنون اور پاگل پن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسے عشق سے نہ عاشق کو کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ محبوب کو۔ انجام رسوائی اور تباہی کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا۔

اسی طرح غیرت کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ بھی بے انتہا شریفانہ ہے اگر جذبہ غیرت نہ ہو تو انسان اپنی عورتوں کی عصمت اور اپنے خاندان اور مذہب کی عزت کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اس جذبہ کے سر سے بھی جب عقل کا سایہ اٹھا جاتا ہے تو لوگ ذرا ذرا سی فضول رسموں' بے کار باتوں اور بے بنیاد شبہات پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگتے ہیں۔ ایسی حمیت و غیرت کی ایک مثال وراثتی انتقام ہے جس میں ایک شخص اپنے باپ دادا کے قتل کا بدلہ قاتل کے بیٹے یا پوتے کو قتل کر کے لیتا ہے حالانکہ وہ بالکل معصوم اور بے گناہ ہوتے ہیں۔ ایسی غیرت کو مذہب نے الحمیة الجاهلية کے نام سے یاد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے کو اس شر سے پاک فرمائے۔ آمین

الغرض! کسی جذبہ کی تحلیل نفسی کیجیے اور کسی پہلو سے دیکھئے نتیجہ یہی نکلے گا کہ جذبات جب تک عقل کے تابع رہیں مفید اور تعمیری رہتے ہیں۔ جہاں عقل کی پاسبانی سے محروم ہوئے تخریبی اور تباہ کن بن جاتے ہیں۔ میری اس تقریر سے آپ کو یہ سیکھنا چاہیے کہ جذبات کو ہمیشہ قابو میں رکھیں اور عقل کی روشنی میں ان سے کام لیں۔ مگر یہ بھی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ صبر یعنی برداشت کی قوت آپ کے اندر بدرجہ اولٰی پیدا نہ ہو جائے۔ ان اللہ مع الصابرین کا یہی مطلب ہے کہ اللہ انہی کے ساتھ ہے جو قوت برداشت رکھتے ہیں اور عقل کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔

وقت اور وعدے کی پابندی:

اعلٰی کردار و اخلاق پیدا کرنے کے لیے اور بھی کئی صفات ضروری ہیں مگر میں یہاں صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔ اگر یہ دو باتیں پیدا کر لی جائیں تو باقی محاسن اخلاق خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ دو باتیں یہ ہیں۔ ایک وقت اور وعدے کی پابندی دوسرے انکسار۔

میں اپنے اہل حلقہ کا اکثر جائزہ لیتا رہتا ہوں اور اس وقت یہ بیان کرنے میں مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ الحمدللہ ہمارے حلقہ والوں کا اخلاق عام مسلمانوں سے کہیں افضل و اعلٰی ہے۔ میں نے اکثر آدمیوں کو ان کے اخلاق کی تعریف کرتے سنا ہے۔ خصوصاً جب ہمارا کوئی بھائی برائی کا بدلہ نیکی اور گالیوں کا جواب مسکراہٹ اور دعا سے دیتا ہے تو سننے والے یہی کہتے ہیں کہ ''سبحان اللہ اس دور میں بھی ایسے مسلمان باقی ہیں۔'' مگر ایک بات کو دیکھ کر مجھے بہت افسوس اور دکھ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اہل حلقہ میں اکثر آدمی ایسے ہیں جو وقت اور وعدے کی پابندی بالکل نہیں کرتے۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے فوجی بھائی فوجی تربیت کی وجہ سے وقت کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن وعدے کے پابند تو ان میں بھی بہت کم لوگ ہیں۔ سول والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ نہ تو وقت کے پابند ہیں نہ وعدے کے الا ماشاءاللہ۔ وقت اور وعدے کی پابندی کردار انسانی کی عمارت میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نہ ہو تو اور خوبیوں پر بھی پانی پھر جاتا ہے۔ وقت کی

پابندی سے انضباطِ عمل پیدا ہوتا ہے ۔جس کے بغیر کوئی سکیم اور کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پانچ وقت کی نماز با آواز بلند آپ کو پکار پکار کر پابندی وقت کا سبق یاد دلاتی ہے ۔لیکن جو لوگ وقت پر نماز ہی ادا نہیں کرتے ان سے کیا امید ہوسکتی ہے کہ اور کاموں میں وقت کی پابندی کریں گے۔

برادران سلسلہ! جو آدمی وقت کا پابند نہیں ہوتا وہ قدرتاً اپنے اعمال وافعال میں سست ہوتا ہے اور سستی خدا کو بہت ہی ناپسند ہے ۔وہ سست آدمیوں کے کاموں میں کبھی برکت نہیں دیتا ۔اس لیے آپ اچھی طرح دل میں بٹھا لیجیے کہ وقت کی پابندی نہ کر کے آپ اپنی دنیا کا بھی نقصان کرتے ہیں اور دین کا بھی۔

وعدے کی پابندی بھی اتنی ہی ضروری ہے ۔حلقہ کی تعلیم میں صداقت کا اختیار کرنا ایک ضروری شرط ہے اور اس پر آپ سے بیعت بھی لی جاتی ہے ۔طریقت تو حیدیہ میں جسم انسانی کے ہر عضو کی صداقت کا مفصل بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ زبان کی صداقت یہ ہے کہ کبھی جھوٹ نہ بولو۔جھوٹ ایک کبیرہ گناہ ہے ۔کبیرہ گناہ کر کے یہ امید رکھنا کہ آپ کو خدا کا قرب میسر آئے گا کس قدر قابل مضحکہ خیز بات ہے ۔ایفائے وعدہ کے متعلق بھی قرآن میں نص صریح موجود ہے ۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً (بنی اسرائیل:34)

''وعدہ پورا کیا کرو قیامت کے دن اس کی بابت پوچھا جائے گا۔''

اس نص صریح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ امید رکھنا کہ آپ ولی اللہ بن جائیں گے انتہائی خود فریبی ہے ۔تعمیر ملت اور طریقت تو حیدیہ میں یہ سب لکھا ہوا ہے لیکن آپ نہ یہ پڑھتے ہیں اور نہ وہ ۔براہ کرم دونوں کتابوں کی ایک ایک جلد لازماً اپنے پاس رکھیں اور روزانہ تھوڑا بہت پڑھا کریں اور جو لکھا ہے اس پر عمل کریں ۔

انکساری:

انکساری بھی تعمیر کردار کے لیے ایک بہت ہی اہم صفت ہے مگر جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں ۔ انکساری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اپنے آپ کو دوسروں سے ذلیل وحقیر سمجھیں ۔ایسا خیال کرنا

بھی انتہائی دنائت اور غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ایسی ذہنیت کے لوگ شرافت سے بالکل معریٰ ہوتے ہیں۔ان کا کردار کبھی بھی اعلیٰ درجے کا نہیں بن سکتا۔ایسے لوگوں میں بہت ہی کمینہ خصلتیں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ خوشامدی، چغل خور اور اول درجے کے بے غیرت ہوتے ہیں۔ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی اور جب یہ عادتیں دل میں گھر کر لیتی ہیں تو بھیک مانگنے اور چوری کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔آپ کا پہلا شرف یہ ہے کہ آپ انسان ہیں اور دوسرا شرف یہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں (بشرطیکہ آپ اسلام کی تعلیم پر عمل بھی کرتے ہوں) ان دو شرافتوں کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھنا کسی طرح بھی جائز و مناسب نہیں۔

انکساری یہ بھی نہیں ہے کہ آپ لوگوں سے بات کرتے وقت مسمسا سا منہ بنالیں اور آنکھیں جھکا کر عاجزی سے بات کریں اور جس سے باتیں کر رہے ہیں اس کو اپنے سے حقیر و ذلیل سمجھتے ہوں۔یہ تو ظاہر داری بلکہ ریا کاری ہے۔

انکساری تو یہ ہے کہ آپ کے دل میں غرور و تکبر بالکل نہ ہو۔دل سے دوسروں کی عزت کریں۔خاطر داری اور تواضع سے پیش آئیں اور کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے دوسروں کی دل شکنی ہوتی ہو۔غرور و تکبر انسان کو دوسروں کی نظر سے گرا دیتا ہے اور لوگ کسی ظاہری لالچ یا خوف سے اس کی تعریف ہی کیوں نہ کریں دل سے اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کو پڑھ کر شاید آپ کے دل میں اعتراض پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ ہم نے تم میں سے بعض آدمیوں کو دوسرے آدمیوں پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں پر خدا نے ہم کو فضیلت دی ہے ان کو ہم اپنے سے حقیر و ذلیل کیوں نہ سمجھیں۔یہ خیال اور اعتراض بالکل غلط ہے۔کسی کو حقیر و ذلیل سمجھنا اور بات ہے لیکن کسی کو اپنے سے کمتر یا برتر جاننا بالکل دوسری بات ہے۔فضیلت کی بہت سی چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں۔مثلاً جسمانی طاقت، خوبصورتی، دولت، منصب، علم، حکومت، بزرگی اور القاو غیرہ۔تو ان چیزوں میں اگر آپ کو کسی پر کسی کو آپ پر فضیلت حاصل ہے تو اس قسم کی فضیلت کو ضرور ماننا چاہیے اور جتنی کسی کو فضیلت حاصل ہو اتنا ہی اس کا

ادب اور پاس ولحاظ کرنا چاہیے اور جن چیزوں میں اللہ نے آپ کو دوسروں پر فضیلت عطا فرمائی ہے اس کا صحیح احساس وعرفان بھی آپ کو ہونا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر اگر آپ کسی سے اس کا ذکر بھی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ عین منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس کا فائدہ آپ کو اسی حالت میں ہوسکتا ہے جب کہ آپ ان باتوں پر عمل کریں ورنہ اس کان سننے اور اس کان اڑا دینے سے تو کبھی بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔

آیئے اب دعا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اخلاق حسنہ کی دولت سے مالا مال فرمائے اور صراط مستقیم پر چلائے۔ آمین

خادم الخدام

عبدالحکیم انصاری

لاہور، 24 اپریل 1965ء

خطبہ......5

16-4-1966

کو آٹھویں سالانہ اجتماع پر بمقام نوشہرہ ورکاں ضلع گوجرانوالہ ارشاد فرمایا

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ............السلام علیکم

کیا یہ خوشی اور مسرت کی بات نہیں کہ ہم میں سے بہت سے بھائی آج پورے ایک سال بعد پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہیں تا کہ سال بھر میں جو میل کچیل دل پر جم گیا ہے اس کو صاف کر کے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے اپنی محبت اور اپنے روابط کو پھر استوار اور تازہ کریں۔ کیا یہ وقت اللہ کی حمد و ثنا اور شکر گزاری کا نہیں جس نے پھر یہ موقع عطا فرمایا' ہے اور ضرور ہے۔ لہٰذا آیئے پہلے حمد و ثنا کریں اور اس کا شکر بجا لائیں پھر رسول کریم ﷺ پر درود بھیجیں کہ حضور ﷺ ہی کے صدقہ اور توسل سے یہ سب کچھ ہم کو عطا کیا گیا ہے۔

گزشتہ سال ہمارا اجتماع لاہور میں ہوا تھا۔ اس موقعہ پر چوہدری جلال الدین صاحب نے اس سال کا اجتماع نوشہرہ ورکاں میں منعقد کرنے پر اس قدر خلوص و دل گیری سے اصرار کیا کہ انکار کرتے نہ بن پڑا اور اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ 1966ء کا اجتماع نوشہرہ ورکاں میں ہو گا۔ اور اسی لیے آج ہم سب یہاں موجود ہیں۔ میں چوہدری صاحب اور ان کے رفقائے کار کا دلی شکریہ اپنی اور پورے حلقہ توحیدیہ کی طرف سے ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان سب کو دین اور دنیا دونوں میں ہر لحاظ سے کامیاب فرمائے۔ آمین۔ ساتھ ہی میں تمام شرکائے جلسہ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تشریف آوری سے اجتماع کو رونق بخشی۔

برادران حلقہ! آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں خوشی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارا حلقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اور میں مجبور ہوں کہ اس خوشی کے موقع پر کچھ غم کی خبریں بھی آپ کو سناؤں۔

پہلی خبر تو یہ ہے کہ پچھلے سال عین اجتماع سے ایک دن پہلے میری اہلیہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ دوسری خبر یہ ہے کہ ہمارے حلقہ کے ایک بہت ہی نیک اور صالح نوجوان اور ہمارے بہت ہی پیارے بھائی محمد لطیف کمانڈو نے ہم سب کو اور اپنے ضعیف والدین اور بیوی بچوں کو داغ مفارقت دیا۔ ان کے علاوہ لاہور کے جناب محمد یعقوب بھٹی کے والد' پشاور کے منظور الحق صاحب

۔کے والد ڈرگ روڈ کے سارجنٹ علی کے والدین اور بشیر مرزا اور عنایت مرزا کے والد صاحب نے انتقال فرمایا۔ میں اپنی اور اپنے حلقہ کی طرف سے ان سب متوفیان کی رحلت پر اظہار غم و تعزیت کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب متوفیان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

برادران حلقہ! یہ ہمارا آٹھواں سالانہ اجتماع اور پانچواں خطبہ ہے۔ پہلے خطبہ سے چوتھے خطبہ تک میں نے یہ التزام کیا تھا کہ وہ تصوف وسلوک کی ابتدا سے انتہا تک مسلسل ہوں تا کہ طالبان تصوف وسلوک سب کو ملا کر پڑھنے سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ پانچواں خطبہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔اس خطبہ میں میں نے راہ سلوک کی رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے۔اور یہ بتایا ہے کہ ان پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔جو لوگ ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں چاہتے اور واقعی راہ سلوک کو مکمل کرنا چاہتے ہیں اور جو رکاوٹیں اس راہ میں پیش آتی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے جد وجہد کرنے اور کچھ تکلیفیں اٹھانے کے لیے تیار ہیں وہ یقیناً اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں گے ان شاءاللہ العزیز۔

میری رائے میں یہ خطبہ سب سے زیادہ اہم ہے کیوں کہ ذکر اور عبادت تو ہر شخص شروع کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے اور شیخ کامل کی توجہ سے اس کو ذکر وغیرہ میں لطف بھی آنے لگتا ہے۔گرمی، سرور اور نشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔لیکن جب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور رکاوٹ زیادہ سخت ہو تو گھبرا کر ذکر وغیرہ چھوڑ دیتا ہے یا کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ اس کا دماغی سکون ختم ہو جاتا ہے اور ذکر میں وہ لذت نہیں آتی جو پہلے تھی۔اس موقع پر ہزاروں سالکان راہ طریقت میں سے دو چار ہی مرد میدان ہوتے ہیں جو ثابت قدم رہتے ہیں ورنہ باقی سب میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ایسے موقع پر کئی ایسے آدمی بھی ہوتے ہیں جو پیر سے مدد چاہتے ہیں کہ یا تو وہ رکاوٹوں کو اپنی کرامت سے دور کر دے یا خود ان میں اپنی ہمت باطنی اور توجہ سے اتنی طاقت پیدا کر دے کہ وہ رکاوٹ پر غالب آجائیں۔لیکن کوئی پیر کامل ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں کرتا بلکہ ان کو رکاوٹ پر غالب آنے کا صرف راستہ بتا دیتا ہے۔وہ مدد کیوں نہیں کرتا؟ اس کی

وجہ یہ ہے کہ اس طرح پیر کی مدد سے جو لوگ سلوک طے کرتے ہیں ان میں ان کی اپنی ذاتی طاقت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے پاؤں پر خود کبھی کھڑے نہیں ہوتے۔ ہمیشہ پیر کے کندھے کا سہارا لے کر چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا ہے سب پیر ہی کا ہوتا ہے۔ اس لیے جب کبھی پیر کی طرف سے مدد نہیں ملتی یا پیر فوت ہو جاتا ہے تو ان کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور وہ کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

موٹی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی سا بڑا کام بھی بغیر سخت محنت اور مجاہدے کے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دنیوی امور میں تو منزل مقصود کا علم ہوتا ہے اور اس تک پہنچنے کے ذرائع بھی ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص ان ذرائع تک دسترس حاصل نہ کر سکے اور جو لوگ محنت اور عقل سے ان ذرائع کو حاصل کر لیتے ہیں وہ سو فی فیصد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن سلوک میں یہ بات نہیں ہے۔ سلوک کی آخری منزل اور مقصد خدا کا قرب، دیدار اور معرفت حاصل کرنا ہے۔ لیکن خدا نہ تو دکھائی دیتا ہے، نہ سمجھ میں آ سکتا ہے، نہ اس تک پہنچنے کے ذرائع ہی سالک کے علم میں ہوتے ہیں۔ اس لیے منزل مقصود تک پہنچنا اس وقت تک محال ہوتا ہے جب تک کوئی سچا رہنما اور رہبر نہ ہو۔

اور رہنما اور رہبر صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو خود منزل مقصود تک پہنچ چکا ہو اور راستہ کے اتار چڑھاؤ اور پیچ و خم سے خوب واقف ہو۔ لیکن ایسے رہنما اور رہبر سے بھی پورا فائدہ وہی اٹھا سکتے ہیں جو سچے طالب ہوں۔ جن کی طلب اس قدر پختہ اور شدید ہو کہ منزل و مدعا تک پہنچنے کے لیے ہر طرح کی تکالیف خندہ پیشانی سے اٹھا سکیں اور کتنی ہی مصیبتیں پڑیں ان کے عزم و استقلال میں کمی نہ آئے۔

راہِ سلوک کی رکاوٹیں:

(۱)..... **پہلی رکاوٹ** جو راہ سلوک میں پیش آتی ہے۔ طلب کی خامی اور کمی ہے۔ یوں سمجھنے کو تو ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ میری طلب صادق اور میرا عزم راسخ ہے لیکن یہ اس کی بھول ہوتی ہے۔ طلب صادق کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ راہ کی کسی دشواری کو خاطر میں نہ لائے اور ہمیشہ آگے ہی

بڑھتا رہے۔میدان جنگ میں غازیوں اور مجاہدوں کا خیال کرو۔ان کا مقصد دشمن کے مورچوں پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔اس کے لیے جب وہ حملہ کرتے ہیں تو اگر چہ میدان میں گولوں اور گولیوں کا مینہ برستا ہوتا ہے اور ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں ہوتی جہاں گولیاں نہ برس رہی ہوں۔لیکن جب وہ ارادہ کر لیتے ہیں تو اسی مینہ میں آگے بڑھتے ہیں۔گرتے ہیں' زخمی ہوتے ہیں' شہید ہوتے ہیں لیکن ان کے قدم پیچھے نہیں ہٹتے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے مورچوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اس کی توپوں کو خاموش کر دیتے ہیں۔یہ گولے اور گولیاں تو نظر آتی ہیں لیکن راہ سلوک کے مجاہد کو جن گولے اور گولیوں کی بارش میں گزرنا پڑتا ہے وہ نظر نہیں آتیں۔صرف محسوس ہوتی ہیں یا سمجھ میں آ سکتی ہیں۔اس لیے اگر ارادہ اٹل اور طلب نا قابل شکست نہ ہو تو یہ لوگ چار چھ قدم ہی چل کر اپنے مورچوں میں واپس آ جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں۔اس لیے جب تک طلب کامل اور عزم راسخ نہ ہو کسی کو بھی اس راہ پرخطر میں قدم نہیں رکھنا چاہیے ورنہ وہی مثل ہو گی کہ

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

(۲)......**دوسری رکاوٹ** یہ ہے کہ سالک کو پیر کامل سے مرید ہونے کے باوجود اس سے والہانہ عقیدت نہ ہو یا وہ اس کی اطاعت یا ادب کرنے میں کمی کرے۔ان تین باتوں کے متعلق تعمیر ملت اور طریقت توحیدیہ میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اور کسی خطبہ میں بھی غالباً بیان کیا گیا ہے۔اس لیے یہاں بہ خوف طوالت زیادہ بیان نہیں کر سکتا۔صرف اتنا کہتا ہوں یہ تین باتیں قصر سلوک کی بنیاد ہیں۔اگر ان میں ذرا بھی قصور ہوا تو یہ قصر فلک بوس کسی وقت بھی زمین پر گر کر مٹی میں بدل جائے گا۔سچی عقیدت یہ ہے کہ پیر کے کمال میں ذرا سا شبہ بھی کبھی دل میں نہ آنے پائے اور اس کے متعلق کسی برائی کا گمان بھی نہ ہو۔عقیدت میں پیر سے محبت کا امتزاج بھی بے انتہا ضروری ہے۔خشک عقیدت سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔اطاعت یہ ہے کہ پیر کا ہر حکم خواہ وہ بہ امتثال امر ہو یا بہ سبیل تذکرہ آنکھ بند کر کے خوشی سے پورا کیا جائے خواہ اس کے منافع اور مصالح سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ادب یہ ہے کہ پیر خواہ موجود ہو یا غائب اس کا تھوڑا سا خوف اور زیادہ

سے زیادہ محبت وعزت دل میں موجود رہے۔ مرید اس کی کوئی ذراسی برائی بھی کانوں سے نہ سن سکے اور ایسی جگہ سے فوراً دور چلا جائے۔ پیر کی موجودگی میں بات زیادہ نہ کرے اور بات کرے تو آواز بلند نہ ہو۔ ہنسنا، قہقہے لگانا، پیر کی مجلس میں پاؤں پسار کر بیٹھنا یا لیٹ جانا سخت بے ادبی ہے۔ پیر سے زیادہ سوالات کرنا بھی ادب کے خلاف ہے۔ پیر اگر بے تکلفی سے بھی پیش آئے تو خود ہرگز بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ الغرض کوئی بات بھی تمیز و تہذیب کے خلاف نہ ہونی چاہیے۔

(۳)...... **تیسری رکاوٹ ماحول** ہے۔ ماحول سے مراد اپنا گھر، ہمسائے، محلّہ اور وہ لوگ جن کی صحبت میں سالک رہتا ہے۔ اگر گھر میں ہر وقت شور و غل اور لڑائی جھگڑا رہتا ہو تو سالک کو وہاں سکون کے ساتھ ذکر کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ محلے کے لوگ اگر بداخلاق ہوں، لڑتے جھگڑتے ہوں اور گالیاں بکتے ہوں تو ان کا اثر بھی ضرور پڑتا ہے اور ذکر و عبادت سے جو تھوڑا بہت سکون ملتا ہے وہ زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کی صحبت میں سالک رہتا ہے اگر وہ بدچلن، بداخلاق اور بدخو ہوں تو سالک ان سے بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اگر وہ سالک اللہ کے راستہ پر کامیابی سے چلنا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے اور ممکن ہو تو وہ محلّہ اور گھر بھی بدل دے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو کسی مسجد وغیرہ میں ایسا گوشہ عافیت دریافت کرے جہاں ذکر سکون سے ہو سکے۔ ذکر جب پختہ ہو جاتا ہے تو گھر اور محلّہ وغیرہ کے مخالف حالات کا اثر سالک کی طبیعت پر نہیں پڑتا بلکہ خود اس کا اثر لوگوں پر پڑنے لگتا ہے۔ لیکن جب تک ذکر پختہ نہ ہو اور اس کا اثر سالک کی رگ و پے میں نہ سما جائے اس کو مخالف ماحول سے دور رہنا ہی لازم ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جس بات، جس چیز یا جس آدمی کی وجہ سے اس کے ذکر اور خدا کی یاد میں ذرا سا بھی مخالف اثر پڑتا ہو اس کو چھوڑ دے اور یہ یاد رکھے کہ نہ اس دنیا میں کوئی کسی کے کام آتا ہے نہ آخرت ہی میں کچھ مدد کر سکتا ہے۔ یہ صرف خدا کی ذات ہی ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے۔ خدا ہی اس دنیا میں اس کی مدد کرتا ہے اور خدا ہی مرنے کے بعد اس کے ساتھ ہوگا اور اس کی مدد کرے گا۔

(۴)...... **چوتھی رکاوٹ عسرت و غربت** ہے۔ آمدنی کم ہے اہل و عیال کثیر ہیں پھر برادری

اور کنبہ کی لغو اور خلاف اسلام وانسانیت رسوم جن میں خرچ نہ کرو تو ناک کٹتی ہے۔ یہ فضول رسمیں پوری کرنی ہی پڑتی ہیں خواہ قرض لینا پڑے۔ رشتہ داروں اور ملنے والوں میں کئی امیر بھی ہوتے ہیں جو اچھا کھاتے' اچھا پہنتے ہیں۔ موٹروں میں پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کڑھنا اور رنج کرنا۔ بچوں اور بیوی کی شکایات کہ ہمارے پاس یہ نہیں ہے' وہ نہیں ہے فلاں کے پاس تو سب کچھ ہے۔ ہمارے لیے بھی ایسا مکان لو۔ ایسے ہی کپڑے اور زیور وغیرہ بناؤ وغیرہ وغیرہ۔ یہ رکاوٹ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر سالک اس پر غالب نہ آ سکے تو پھر وہ کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس رکاوٹ کا علاج قناعت ہے۔ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے تم کو دے رکھا ہے اس پر تمہارا دل خوش رہے۔ کبھی شکایت کا جذبہ پیدا نہ ہو بلکہ جذبات شکر و سپاس سے تم ہمیشہ مسرور رہو۔ بظاہر یہ بات بالکل ناممکن نظر آتی ہے کہ غربت و نکبت میں بھی انسان ایسا ہی رہے جیسے دولت و ثروت میں رہتا ہے۔ لیکن فکر صحیح اور مشاہدہ وسیع سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ بات ناممکن تو کیا کچھ زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔ جن لوگوں کی طلب صادق اور ارادہ پکا ہوتا ہے وہ بہت آسانی سے ان تمام پریشانیوں پر قابو پا لیتے ہیں۔ حضور رسول کریم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ غریبی ہی حضور ﷺ کا طرۂ امتیاز تھی۔ اصحاب کبار میں زیادہ تر غریب ہی تھے۔ اصحاب صفہ تو سب کے سب ہی نہایت غریب اور مسکین تھے۔ اولیائے کرام میں لاکھوں ایسے گزرے ہیں جن کو کئی کئی دن میں ایک وقت پیٹ بھر کھانے کو نہ ملتا تھا۔ پھر ان کے پاس نہ مکان تھا' نہ اچھا لباس' مگر یہی وہ لوگ تھے جو آسمان ولایت پر مہر درخشاں بن کر چمکے۔ وہ سب انسان تھے۔ آپ بھی انسان ہیں۔ جو کچھ انہوں نے کیا آپ بھی کر سکتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جو لوگ غربت اور مفلسی کی تکالیف کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں ان کی طلب صادق نہیں ہوتی۔ مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بڑے طالب صادق ہیں۔ ہمارے دوستوں میں سے کئی ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ اگر میں اکیلا ہوتا اور بیوی بچے نہ ہوتے تو یہ سب مصیبتیں برداشت کر لیتا۔ مگر ان کو کیا کروں۔ ان کی تکالیف مجھ سے نہیں دیکھی جاتیں۔ مگر ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اگر تم اکیلے ہوتے اور یہ تکالیف بہ طیب خاطر برداشت کر لیتے تو کمال ہی کیا تھا۔ یہ تو ہر شخص کر سکتا

ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تو تمہاری آزمائش ہی اس طرح کرنی تھی کہ بیوی بچوں کی تکالیف دیکھو اور تمہارے پائے ثبات میں لغزش نہ ہو اور میدان طلب میں اسی طرح ڈٹے رہو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ افسوس یہ سب بہانے ہیں طلب صادق کا ان لوگوں میں نام و نشان بھی نہیں۔ خود بھی دھوکے میں ہیں اور اپنے شیخ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو میں یہی مشورہ دوں گا کہ فقر کا نام بھی نہ لیں۔ صرف نماز روزہ کرلیا کریں۔ اور گھر بیٹھے چین سے دنیا داری کی زندگی بسر کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا ان کی غربت و نکبت امارت سے بدل جائے گی۔

قرآن پاک میں اس قسم کی تکلیفوں اور دوسری مصیبتوں کا علاج یہ بتایا گیا ہے کہ نماز اور صبر سے مدد لو۔ یعنی نماز قائم رکھو اور جو مصیبت پڑے خوشی سے برداشت کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم اپنی حالت پر خوش نہیں ہو تو پھر ایسا کرو کہ فضا میں ایک رسی لٹکاؤ اور پھانسی کھا کر مر جاؤ اور پھر دیکھو کہ (کیا مرنے کے بعد) تمہاری تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔ نعوذ باللہ کتنی بڑی اور شدید وعید ہے۔ اگر کوئی آدمی صرف اسی پر اچھی طرح غور کرے تو خدا کی قسم کتنی ہی تنگی و ترشی ہو وہ اس کو خاطر میں نہ لائے گا اور ہمیشہ خوش رہے گا۔ پھر قرآن میں یہ بھی ہے کہ اللہ نے کسی کو نپا تلا رزق دیا ہے اور کسی کو بے حساب عطا فرمایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس کسی کے پاس جو کچھ ہے خدا کی مرضی سے ہے۔ تو اے سالکان راہ خدا تم خدا کی مرضی پر خوش کیوں نہیں رہتے اور اس کی مرضی کو اپنی مرضی کے تابع کیوں کرنا چاہتے ہو۔

اس سال کے دعوت منشور میں جو آیت سرورق پر دی گئی ہیں اس کو غور سے پڑھو۔ اگر تم اللہ سے دوستی کرنے گھر سے نکلے ہو اور اس کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو تربیت کے لیے طرح طرح کی آزمائشوں میں ضرور مبتلا کیے جاؤ گے۔ اگر یہ بات تم کو پسند نہیں تو جاؤ اپنی ایڑیوں پر الٹے واپس لوٹ جاؤ۔ اللہ کا قرب یا اس کی لقاء اور معرفت شب برأت کا حلوہ نہیں ہے۔

عسرت و غربت سے بدل ہو جانے کا ایک علاج حضور رسول کریم ﷺ نے یہ بھی بتایا ہے کہ ''جب تم کو اپنی غربت و زبوں حالی کی شکایت ہو تو اپنے سے کمتر لوگوں پر نظر کرو۔'' تم کو لاکھوں آدمی ایسے نظر آئیں گے جو تم سے بھی کہیں زیادہ مفلوک الحال اور محتاج ہیں۔ ان کی حالت سے

عبرت حاصل کرو۔اور خدا کا شکر بجالاؤ کہ تم بڑے آرام میں ہو۔

سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "میں دمشق میں تھا اور میرے پاؤں میں جوتے نہ تھے ننگے پاؤں پھرنے سے سخت زحمت ہوتی تھی اور دل میں سے یہ شکایت اٹھتی تھی کہ اللہ نے مجھے ایک جوڑا جوتا بھی نہیں دیا۔اسی حال میں ایک مرتبہ دمشق کی جامع مسجد میں گیا تو دیکھا وہاں ایک شخص مسجد کے فرش پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے دونوں پاؤں ندارد ہیں۔یہ دیکھ کر مجھے سخت عبرت ہوئی اور میں نے کہا کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے دو پاؤں تو دے رکھے ہیں جن سے میں چل پھر لیتا ہوں۔یہ غریب تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہے۔" مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد سعدی صاحب کو ننگے پاؤں پھرنے میں کبھی تکلیف محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ تکلیف دراصل محض ایک خیالی شے ہے جو اپنی حالت کا مقابلہ اپنے سے بہتر لوگوں کی حالت سے کرنے سے محسوس ہوتی ہے۔ اس کے سوائے تکلیف کے اور کوئی معنی نہیں ہیں۔ عسرت و غربت سے ایک اور بہت بڑا عیب انسان میں پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام ہے احساس کمتری۔یہ ایک ایسی لعنت ہے جو انسان کو ایک سیکنڈ بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔سب سے بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ انسان کو خود یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔جو بچے اپنے ماں باپ یا بزرگوں کو دوسرے لوگوں کی خوشامد اور خدمت کرتے دیکھتے ہیں یا اپنے والدین اور بڑے بھائیوں سے پٹتے رہتے ہیں یا جن کے دلوں میں اپنے متمول رشتہ داروں اور پڑوسی بچوں کے اچھے کھلونے، کپڑے، عمدہ مکانات دیکھ کر یہ امنگیں اٹھتی ہیں کہ یہی چیزیں ہمارے پاس بھی ہوں۔وہ جب اپنے ماں باپ سے کسی چیز کی فرمائش یا ضد کرتے ہیں اور جواب میں ڈانٹ ڈپٹ سنتے اور مار کھاتے ہیں تو ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ان کی تمنائیں کچلی جاتی ہیں۔حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور وہ گلاب کے اس پودے کی طرح مرجھا کر رہ جاتے ہیں جس کو پانی نہ ملا ہو۔وہ جب بڑے ہوتے ہیں تو بظاہر ان تمام باتوں کو بھول جاتے ہیں لیکن یہ تاثرات ان کے لاشعور میں موجود ہوتے ہیں اور ان کے کردار پر برابر اثر کرتے رہتے ہیں۔اب دو صورتیں واقع ہوتی ہیں یا تو وہ غم و الم، حسرت و ارمان اور یاس و نا امیدی کا مجسم مرقع بن کر ہمیشہ کے لیے قنوطی بن جاتے ہیں اور دنیوی مراتب و

مناصب حاصل کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں کرتے یا چند خارجی محرکات و ہیجانات سے متاثر ہو کر اپنی جھوٹی نمود و نمائش، شیخی، خود پرستی اور خود نمائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اب وہ دوسروں پر اپنی فضیلت کا طرح طرح سے اظہار کرتے ہیں۔ اپنی تعریفیں خود اپنے منہ سے کرتے اور اپنی فرضی بڑائیاں خود بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی اپنی قوم اور ذات کی بڑائی جتاتا ہے، کوئی بیس پشت پہلے کے آباؤ اجداد کے مناصب و مراتب کا ڈھنڈورا پیٹ کر دوسروں کو مرعوب کرنا چاہتا ہے اور کوئی اپنے علم و فضل کی دھاک بٹھاتا ہے۔ اگر اتفاقاً ان میں سے کوئی شاعر ہو جائے تو خدا کی پناہ۔ وہ تو اقبال و غالب کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کوئی سننا چاہے نہ چاہے وہ اپنا کلام سناتا اور داد چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ ملنے والوں کو راستہ چلتے سڑک پر روک کر زبردستی غزل خوانی کرنے لگتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ اس کے لچر پوچ کلام کی ضرور داد دی جائے۔ ایسے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص اتفاقاً عربی، فارسی یا انگریزی کی دس پانچ کتابیں الٹی سیدھی پڑھ لے تب تو کہنا ہی کیا۔ ارسطو اور افلاطون کی بھی شامت آ جاتی ہے۔ وجہ بے وجہ، موقع بے موقع جہاں چار آدمی جمع ہوئے یہ ان کو لیکچر جھاڑنے اور اپنی فضیلت کا رعب بٹھانے لگتا ہے۔ سننے والے لحاظ و مروت اور خوش خلقی کی وجہ سے اس کی باتیں سنتے اور بعض اوقات داد بھی دیتے ہیں۔ لیکن اس طرح یہ لوگ اور بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ وہ ان بزرگوں کو بھی اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں جو حقیقی معنوں میں اچھے شاعر اور واقعی عالم و فاضل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ احساس کمتری کے شکار ہمیشہ اپنے متعلق خوش فہمی اور جہل مرکب میں مبتلا رہتے ہیں اور کبھی بھی صحیح معنوں میں ایک بڑا آدمی اور عظیم انسان نہیں بن سکتے۔

اس مہلک مرض کا صرف یہی علاج ہے کہ ان لوگوں پر ان کی صحیح ذہنی، علمی اور اخلاقی حالت کو واضح کر دیا جائے۔ لیکن جو شخص ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ اس سے لڑ پڑتے ہیں اور اس کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔ روحانی طور پر ان کا علاج صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ کافی عرصہ تک اپنے شیخ کی صحبت میں رہیں۔ اس کی ہر بات کو بے چون و چرا صحیح مان لیں اور وہ جو کچھ حکم دے اس پر اندھوں کی طرح عمل کریں۔ لیکن ان کا اصل علاج تو اس طرح

ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ان سے بے پناہ اور سچی محبت کرے اور جب وہ اس کی محبت کا یقین کرنے لگیں اور اس اپنا حقیقی خیر خواہ سمجھنے لگیں تو رفتہ رفتہ ان کی خامیوں اور عیبوں کو بالواسطہ طریقے سے ان پر ظاہر کرے۔ ان شاء اللہ ان کی اصلاح ہو جائے گی۔

(۵)...... **پانچویں رکاوٹ دولت وثروت ہے۔** اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دو طرح سے آزماتا ہے۔ ایک مفلسی اور مصیبتیں دے کر دوسرے دولت اور آرام وآسائش دے کر۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت وثروت کی آزمائش مفلسی اور غربت کی آزمائش سے کہیں زیادہ کٹھن اور دشوار ہے۔ مفلسی اور غربت میں تو قدرتاً اللہ یاد آتا ہے اور انسان سب طرف سے مایوس ہو کر اللہ ہی کی طرف جھکتا اور اسی سے مدد مانگتا ہے۔ جب کہ مال و دولت کی فراوانی اور عیش و آرام کی زندگی میں انسان سرے سے خدا کو بھول ہی جاتا ہے۔ دولت مند انسان گناہوں کے تمام اسباب نہایت آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ پھر اس کے گرد بہت سے خوشامدی اور مفت خورے جمع ہو جاتے ہیں جن کا فائدہ ہی اس میں ہے کہ اس کے لیے گناہوں کے ساز و سامان مہیا کریں مثلاً شراب' جوا' زنان بازاری وغیرہ۔ چوبیس گھنٹے خرافات یا روپیہ کمانے کے مشاغل میں گزرتے ہیں۔ خدا کو یاد کرنے کی فرصت اسے کہاں نصیب ہوتی ہے۔ جب حالت یہ ہو اور ہر گھڑی ہر وقت بات بات پر آمَنَّا وَصَدَّقْنَا اور جی حضور کہنے والے موجود ہوں تو کبر و غرور کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ اب وہ عام انسانوں کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ دوسری طرف مزید دولت کمانے کی دھن میں وہ طرح طرح کے ناجائز وسائل بھی اختیار کرتا اور دن بدن گناہوں اور بداخلاقی کے جال میں جکڑا چلا جاتا ہے۔ دنیا کی ہوا و حرص میں جھوٹ بولنا' لوگوں کو دھوکے دینا اور دوسروں کا مال غصب کرنا اس کی عادت بن جاتا ہے۔ اب بتایئے کہ ایسے آدمی کو روحانیت اور بزرگی بھلا کیسے مل سکتی ہے۔ اگر خدائے رحیم و کریم دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں آگ کے عذاب ہی سے بچا لے تو یہ محض اس کا فضل و کرم ہی ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ نے جہاں غربت و نکبت سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا علاج یہ بتایا ہے کہ تم اپنے سے کمتر اور زیادہ مفلوک الحال لوگوں پر نظر رکھو وہاں امارت وثروت کی برائیوں سے بچنے کا

طریقہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے سے برتر اور اپنے سے زیادہ دولت مند لوگوں کو دیکھو اور ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مال و دولت کے لحاظ سے تو تمہاری کوئی خاص حیثیت ہی نہیں۔ ہزاروں لاکھوں آدمی تم سے کہیں زیادہ دولت مند ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی زندگی نہایت پاک و صاف اور ہر عیب سے مبرّا ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ تمہارے دل میں جو کبر و غرور ہے وہ ختم ہو جائے اور تم نیک انسان بن جاؤ۔ دولت و ثروت کی خرابیوں سے بچنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ تم خوشامدیوں، چاپلوسوں اور مفت خوروں کی صحبت سے بچو اور ان کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دو۔ جس دن سے اس کرہ ارض پر تمدن کی بنیاد پڑی ہے اس دن سے آج تک دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم کا لٹریچر اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو ہر جگہ تم کو یہی نظر آئے گا کہ اس قسم کے بدقماش، حاشیہ نشین اور شوربہ چٹ لوگ امراء کے گرد صرف اپنی ذاتی منفعت کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں ہوتا جو نیکی کی راہ دکھائے یا مصیبت کے وقت کام آئے۔ دولت کی برائیوں سے محفوظ رہنے کے لیے دوسرا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ اچھے، نیک اور صالح آدمیوں کی صحبت میں بیٹھو۔ کسی کامل بزرگ کی خدمت میں حاضری دیتے رہو تا کہ جو خامیاں پیدا ہوں ان کا ازالہ ہوتا رہے اور دل پر جو زنگ لگا ہے وہ صاف ہو جائے۔ تیسرا قدم یہ ہے کہ غصہ اور نفرت کی نفی کرنے کی برابر کوشش کرتے رہو۔ خلق خدا سے محبت اور غریب انسانوں کی خدمت کرو۔

اسلام دولت کمانے اور سونے چاندی کے انبار جمع کرنے کو منع نہیں کرتا لیکن وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ تم یہ دولت اپنے ذاتی عیش و آرام کے لیے جمع نہ کرو۔ بلکہ خدا کے لیے قوم کی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے جمع کرو۔ اس روپیہ میں سے تم زکوٰۃ نکالو۔ غریب اقربا، یتیموں اور محتاج افراد کی تکالیف کو دور کرنے کے لیے خرچ کرو اور اس طرح دولت کو غرباء پر صرف کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اللہ کو قرض حسنہ دو" تو جو لوگ اس نیت سے دولت جمع کرتے ہیں اور اسی طرح خرچ بھی کرتے ہیں وہ تو خیر ہی خیر کرتے ہیں اور ثواب ہی ثواب کماتے ہیں۔ اس دولت سے ملکی دفاع کے لیے بڑی بڑی فوجیں کھڑی کرو، ان کے لیے جدید ترین قسم کے آلات اور

ہتھیاروں کو بنانے کے لیے کارخانے قائم کرو۔ ہمارے امراء اور صنعت کاروں کو یاد رکھنا چاہیے اور ہر وقت یاد رکھنا چاہیے کہ جب ملک پر کوئی دشمن قبضہ کرتا ہے تو اس ملک کے امیروں کی بھی سب دولت چھین لیتا ہے۔ ان کا عیش و آرام مٹی میں مل جاتا ہے اور وہ ذلیل و خوار اور کوڑی کوڑی کے لیے محتاج ہو جاتے ہیں۔

(٦)......**چھٹی رکاوٹ جذبات ہیں!** انسان میں بیسیوں قسم کے جذبات پیدا کیے گئے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اچھے جذبات پر عمل کرے اور برے جذبات کو کچل کر رکھ دے۔ برے جذبات کو قابو میں رکھنے اور کچلنے کے لیے صرف قوت ارادی اور قوت برداشت پیدا کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور طاقتور بنانے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم میں صرف دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ غصہ کو بالکل نفی کر دو، دوسرے یہ کہ کسی سے نفرت نہ کرو۔ اس کے متعلق ''تعمیر ملت''، ''طریقت توحیدیہ'' اور پچھلے سال کے خطبے میں کافی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ لہٰذا اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ حلقہ کے جو احباب اس پر عمل کرتے ہیں وہی اس کے فوائد کو سمجھ سکتے ہیں لیکن جو بار بار بتانے اور سمجھانے کے باوجود عمل نہیں کرتے ان کو اب پھر وہی بتانا اور کہنا ضیاع اوقات ہے۔ مندرجہ بالا رکاوٹوں کے علاوہ دو اور رکاوٹیں قابل ذکر اور قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے ایک غرور ہے دوسری غلط فہمی۔

(٧)......**ساتویں رکاوٹ (غرور):** انسان جب کوئی اچھا کام کرتا ہے یا کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتا ہے تو اس کو فطرتاً ایک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے قدرے ممتاز محسوس کرتا ہے۔ اس جذبہ کو فخر کہتے ہیں۔ فخر کا جذبہ ہر انسان میں فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو کوئی انسان بڑے بڑے کارنامے انجام نہ دے سکتا۔ نہ مجبوروں اور محتاجوں کو مدد دیتا۔ میں نے ایک چھوٹی سی آٹھ سال کی بچی کو دیکھا کہ ایک دن جب وہ سکول سے آئی تو بہت خوش تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا اور بات بات میں کھلی جاتی تھی۔ میں نے پوچھا آج کیا بات ہے بہت خوش نظر آتی ہو۔ کہنے لگی آج میں نے ایک بہت ہی اچھا کام کیا ہے۔ میرے پوچھنے پر بتایا

کہ سکول سے چھٹی ملنے پر جب میں گھر آ رہی تھی تو چوراہے پر ایک عورت کو دیکھا جو بہت ہی بوڑھی، کمزور اور اندھی تھی۔ اس کی بغل میں ایک گٹھڑی اور ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ بار بار سڑک کی طرف بڑھتی لیکن پھر واپس ہو جاتی۔ میں نے پوچھا "اماں کیا بات ہے" کہنے لگی بیٹا سڑک کے پار جانا چاہتی ہوں مگر بھیڑ بہت ہے۔ میں نے گٹھڑی ہاتھ میں لی اور لاٹھی پکڑ کر سڑک کے پار پہنچا دیا۔ اس نے کہا بیٹا میرا گھر نزدیک ہی ہے اگر وہاں تک پہنچا دے تو بڑا احسان ہوگا اس پر میں نے اس کو اس کے گھر کے دروازے تک پہنچا دیا۔ اس بڑھیا نے مجھے اتنی دعائیں دیں کہ آج تک کسی نے بھی نہیں دیں۔ اسی وجہ سے آج میرا دل بہت خوش ہے۔

میں یہ سطور لکھ ہی چکا تھا کہ پوسٹ مین ڈاک لایا۔ سب سے پہلا خط جو کھولا تو اس میں ہو بہو یہی مضمون تھا۔ یہ خط حلقہ کے ایک دوست نے بھیجا تھا۔ لکھا تھا کہ "آج ایک نیک کام کیا جس سے دل بہت خوش ہوا۔ میں سائیکل پر آ رہا تھا دور سے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی سفید پوش ایک ہاتھ میں سامان اٹھائے جا رہا ہے۔ لیکن اٹھا نہیں پاتا۔ کبھی ایک ہاتھ میں لیتا ہے کبھی دوسرے میں۔ میں نے سائیکل روک لی۔ سلام کیا۔ سامان اٹھایا اور اسے منزل تک پہنچا دیا۔ بڑی دعائیں دیتا تھا۔" دیکھنے میں یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن جن کو ان باتوں پر خوشی ہوتی ہے وہی بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیتے ہیں۔

فخر صرف نیک اور بڑے کاموں پر ہی نہیں ہوتا اور بھی بہت سی باتوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ذات پات پر، اپنے وطن، قوم، قبیلے اور خاندان کی شرافت اور عزت پر یا اپنے خاندان کے کسی معزز اور مشہور آدمی پر۔ مثلاً بنو ہاشم اس بات پر یقیناً فخر کر سکتے ہیں کہ ان کے خاندان میں حضور اکرم ﷺ پیدا ہوئے، یا سادات حضور اکرم ﷺ کی آل ہونے پر، یا ہم مسلمان سرور کائنات ﷺ کی امت ہونے پر، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یاد رکھیے یہ جذبہ اسی وقت تک فخر کہلاتا ہے جب تک کہ احساس عزت و مسرت کی حدود میں رہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہی یہ بجائے خیر کے شر بن جاتا ہے۔ مثلاً جب کوئی اپنے لباس، مکان، حسب نسب، منصب یا دولت پر اترانے اور شیخی مارنے لگے تو یہ فخر نہیں کہلائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اگر تمہاری کوئی چیز تم سے چلی جائے تو اس پر رنج نہ کرو اور اگر تم کو کوئی اچھی شے میسر آ جائے تو اس پر اتراؤ نہیں اور شیخی نہ مارو ۔اللہ شیخی خوروں اور اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔''

اب اگر کوئی اترانے اور شیخی مارنے سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ جائے تو یہی کبر و غرور کہلائے گا جو بہت ہی بڑی بدی ہے ۔شیطان کو اس کے کبر و غرور ہی نے قیامت تک کے لیے لعنت میں گرفتار کرایا ہے ۔فخر 'اتراہٹ اور غرور میں یہ فرق ہے کہ فخر میں تو دل میں خوشی اور اللہ کے تشکر کا جذبہ ہوتا ہے' اتراہٹ میں اپنی نمود و نمائش منظور ہوتی ہے اور غرور میں اپنی برتری اور دوسروں کی کمتری اور رذلت و حقارت کا خیال ہوتا ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے ۔غرور طاقت جسمانی' علم' حسن صورت' دولت' منصب' حسب نسب' عبادت اور روحانی طاقت وغیرہ پر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ کم علمی' تنگ نظری اور فقدان غور و تفکر ہوتی ہے ۔مغرور آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جو چیز اس کے پاس ہے وہ اور کسی کے پاس نہیں ۔اس لیے وہ اپنے آپ کو افضل و برتر اور دوسروں کو حقیر و ذلیل اور کمتر جانتا ہے ۔مزے کی بات یہ ہے کہ وہ جس چیز پر غرور کرتا ہے اسی کے خیال میں مگن رہتا ہے ۔یہ نہیں سوچتا کہ اس چیز کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سی نعمتیں اور خوبیاں ہیں جو دوسروں کے پاس ہیں لیکن اس کے پاس نہیں ہیں ۔مثال کے طور پر ایک پہلوان کو اپنی جسمانی طاقت پر غرور ہے اس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ بلاشبہ میرے پاس جسمانی طاقت تو ہے لیکن نہ علم ہے' نہ دولت ہے' نہ جاہ و منصب ۔پھر میں صرف طاقت جسمانی پر کیوں غرور کروں ۔یہی حال دوسروں کا ہے کہ ہر ایک کے پاس ایک دو چیزیں ہیں ان کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور بہ فرض محال کسی کے پاس اگر سب نعمتیں موجود ہوں تب بھی اس کو یہ غور کرنا چاہیے کہ یہی نعمتیں اس سے کہیں زیادہ دوسروں کے پاس موجود ہیں پھر غرور کس بات کا ۔مگر یہ لوگ اس طرح کبھی نہیں سوچتے اگر کچھ دن اس انداز سے غور کریں تو بہت جلد اس بیماری سے نجات مل جائے ۔

اب خاص طور پر ان لوگوں کا ذکر کروں گا جن کو اپنی **روحانی طاقت پر غرور** ہو جاتا ہے ۔یہ میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ روحانی طاقت پر غرور ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کی طلب صادق نہیں

ہوتی اور جو بے علم اور کم ظرف ہوتے ہیں اور جو جاہل اور ناقص صوفیوں کی بے سروپا روایات ہی کو حاصل تصوف اور کمال سلوک خیال کرتے ہیں اور محض اس مقصد سے بیعت ہوتے ہیں کہ جلدی سے فقیر بن کر لوگوں کو مرید کرنے لگیں اور ان سے نذرانہ وغیرہ لے کر عیش کریں۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی کہ تصوف وسلوک کا مقصد و منتہا ذات باری تعالیٰ کا قرب و مشاہدہ اور معرفت ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے بڑا وقت اور بے انتہا سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ان میں کئی آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو بیعت ہوئے اور ذکر و عبادت کرتے ہوئے دو چار ماہ بھی نہیں گزرنے پاتے کہ ان کا پیانہ چھلکنے لگتا ہے۔اب وہ لوگوں کو دکھانے اور ان پر رعب جمانے کے لیے جا و بے جا' موقع بے موقع ہر جگہ اپنی عبادت کا ذکر کرتے اور ''اللہ ہو'' کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔یہ لوگ انتہائی طور پر جاہل ہوتے ہیں۔اس لیے ان کو سمجھانا اور راہ حق دکھانا بہت مشکل ہے۔ان کا شیخ تو چونکہ ہر وقت ان کے ساتھ نہیں رہتا اس لیے اصلاح نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ ان کے پیر بھائی جو ان کے ساتھ رہتے ہیں یہ ان کا فرض ہے کہ ان کو سمجھائیں اور صحیح راستہ دکھائیں۔پھر اگر کوئی مان جائے تو سبحان اللہ۔ورنہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اور قرآن کی اس آیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے صبر کر لینا چاہیے کہ ''تمہارا کام صرف پہنچانا (صحیح تعلیم دینا) ہے ہدایت دینا یا گمراہ رکھنا اللہ کا کام ہے۔''

دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو کہ عبادت و ذکر پوری کوشش سے جاری رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان میں جذب و حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔عالی ظرف اور تعلیم یافتہ لوگ تو اس کو خاطر میں بھی نہیں لاتے' لیکن جاہل اور کم ظرف اسی جذبہ و حرارت کو سلوک کا کمال سمجھ لیتے ہیں اور اگر ان کو کچھ روحانی مناظر یا روحیں نظر آنے لگیں یا کشف و کرامات کی طاقت پیدا ہو جائے تب تو پوچھنا ہی کیا۔اب یہ لوگ اپنے آپ کو واقعی کامل و اکمل سمجھ لیتے ہیں۔عوام پر اپنی بزرگی ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔عوام تو رہے ایک طرف ان کو تو یہ اپنے سے کمتر بلکہ حقیر و ذلیل سمجھتے ہی ہیں یہ تو سچ مچ کے بزرگوں کو بھی نہیں گانٹھتے اور ان کے منہ آتے ہیں۔جہاں سنتے ہیں کہ کوئی بزرگ موجود ہے وہیں پہنچ کر ان پر توجہ کرتے اور جتاتے ہیں کہ ہم

بھی بزرگ ہیں اور جس کو اپنے سے کم طاقت ور پاتے ہیں اس سے روحانی کشتی لڑنے لگتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا شیخ کامل نہ ہو تو ان کا بہت ہی برا حال ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی ان کا واسطہ کسی ایسے جلالی فقیر سے پڑ جاتا ہے جو ان کی ساری شیخی کرکری کر دیتا ہے اور ان کی ساری لُٹیا پُنجیا چھین چھان کر دنیا کی خاک چھاننے کو چھوڑ دیتا ہے۔ بعض تو اس صدمہ سے پاگل ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی اصلاح بھی بہت مشکل ہے۔ اصلاح کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ وہ اپنے شیخ کی بات مانیں اور اس کے کہنے سے یہ یقین کر لیں کہ اب تک جو کچھ ان کو ملا ہے اس کی منازل سلوک میں کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ لیکن ان کو کشف قبور اور روحانی مناظر دیکھنے کا ایسا چسکا پڑ جاتا ہے کہ وہ اپنے شیخ کی بھی نہیں سنتے۔ بلکہ کئی تو ایسے ہوتے ہیں جو شیخ کو بھی روحانیت میں اپنے سے نیچا سمجھتے ہیں۔ ان کی اصلاح سے بھی مایوس ہو جانا اور ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔

جو لوگ اس مقام تک خیر و عافیت سے پہنچ جائیں یعنی ان میں حرارت وجذب بھی کافی پیدا ہو جائے، کشف وکرامات کی طاقت بھی آ جائے، غصہ میں بھی کمی ہو جائے، غرور ونفرت اور دوسرے کبیرہ نقائص بھی جاتے رہیں وہ ان شاء اللہ ضرور فائز المرام ہوں گے اور ان کو خدا کا قرب ولقا ضرور میسر آئے گا۔ ان بزرگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ناسوت وملکوت طے کر کے جبروت تک پہنچ گئے ہیں۔ جو ایک نہایت اعلیٰ مقام اور بڑا مرتبہ ہے۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جبروتی بزرگوں میں بھی کچھ غصہ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس کو لوگ ''جلال'' کہتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ بزرگ ''جلالی'' کہلاتے ہیں۔ جبروت سے آگے لاہوت ہے۔ یہاں پہنچنے اور اس کو طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طبیعت اور اخلاق میں بے انتہا نرمی، شگفتگی اور لطافت پیدا کی جائے اور چھوٹی سے چھوٹی اخلاقی کمی کو بھی دور کر دیا جائے۔ صاحب جلال ہونا کچھ اچھی بات نہیں۔ ہم کو ہر بات میں حضور نبی کریم ﷺ کی عادات وخصائل اور اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا چاہیے۔ یاد رہے کہ حضور اکرم ﷺ سراپا جمال تھے اور اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ کو رحمت للعالمین کا خطاب عطا فرمایا ہے۔

لاہوت سے آگے ہاہوت ہے اور پھر ہو ہے۔ یہاں صور واشکال غائب ہو جاتی ہیں اور

صرف وہ بزرگ ہی یہاں پہنچ سکتے ہیں جن کا قلبی تعلق دنیا سے اتنا بھی نہ رہے جتنا ایک رائی کا دانہ۔اسی کو قطع ماسویٰ اللہ کی تکمیل کہنا چاہیے اور یہ بات صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں بالکل فنا کر دیا جائے۔مگر لاکھوں طالبان صادق میں سے بھی چند نفوس ہی یہاں تک پہنچ پاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اللہ کے فضل وکرم سے ہوتا ہے۔اس سے آگے لطائف امر ہیں اور یہ مقامات مخصوص ہیں صرف عارفان حق کے لیے۔

حلقہ کے اکثر احباب بجا طور پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کس مقام پر ہیں۔تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کو خواب میں یا نیم خواب کی حالت میں ان مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے یا یہ بشارت دی جاتی ہے کہ تم فلاں مقام طے کر کے فلاں مقام پر آگئے ہو۔جن کو نہ بشارت دی جائے نہ کچھ نظر آئے ان کے مقام کا تعین ان کے اخلاق کی پاکیزگی سے ہوتا ہے۔ان کو خود غور کرنا چاہیے کہ بیعت ہونے سے پہلے ان کا اخلاق کیسا تھا اور اب کیسا ہے۔ملکوت میں پہنچ کر اخلاق عام انسانوں کی بہ نسبت بہت اچھا ہو جاتا ہے۔گناہوں سے دل محترز رہتا ہے۔ذکر میں لطف آتا ہے اور خدا کی یاد اور محبت دن بدن زیادہ ہوتی جاتی ہے اور دنیاوی تفکرات و مکروہات کا دل و دماغ پر اثر کم ہونے لگتا ہے۔جبروت'لاہوت'ہاہوت اور ہو کا حال پیچھے بیان ہو چکا ہے۔اگر خود اندازہ نہ ہو سکے یا تسکین نہ ہو تو شیخ سے دریافت کر کے اس کی بات پر یقین کر لینا چاہیے۔لیکن سب سے اچھا تو یہ ہے کہ آپ اس چکر میں نہ پڑیں اپنا کام کرتے رہیں۔آخر میں خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

(۸)......**آٹھویں رکاوٹ غلط فہمی ہے**۔یہ ایک مبتدی سے لے کر منتہی تک سب ہی کو ہو سکتی ہے۔مبتدی کی غلط فہمیاں تو اس کا شیخ رفع کر سکتا ہے مگر منتہی کی غلط فہمی تو خدا کے دور رکیے ہی دور ہوتی ہے۔لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غلط فہمی اپنے بس کی بات نہیں اس لیے گناہ نہیں ہے اور اس کی وجہ سے کوئی سالک اپنی منزل سے گرا نہیں کرتا۔یہ دوسری بات ہے کہ آگے ترقی نہ کر سکے۔غلط فہمی پر مواخذہ بھی نہیں ہوگا۔مرنے کے بعد اس کو اپنی غلط فہمی معلوم ہو جائے گی اور باقی منازل اس کی روح طے کرے گی۔یہ غلط فہمیاں ان گنت قسم کی ہو سکتی ہیں۔اس لیے ان سب کو ضبط تحریر میں لانا

ممکن نہیں ہے۔تاہم چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔عقل مند انسان انہی سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

مبتدیوں کی غلط فہمیاں تو صرف یہ ہوتی ہیں کہ ان میں سوز وحرارت پیدا ہو جاتی ہے۔کچھ نظر آنے لگتا ہے۔یا کشف وکرامات کی طاقت آ جاتی ہے تو وہ علم نہ ہونے کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ "ہم کامل ہو گئے" لیکن اس قسم کی غلط فہمیاں شیخ حلقہ یا کوئی اور بزرگ بڑی آسانی سے دور کر دیتا ہے۔مشکل تو ان لوگوں کو پیش آتی ہے جو مقام ھو یا لطائف عالم امر سے واسطہ پڑنے پر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔چند بزرگوں کو ابتدا ہی میں جذب وحرارت اور کرامات صادر ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ یہ جذب وحرارت ہی خدا کی ذات ہے جو ہمارے بدن میں حلول کر گئی ہے اور چونکہ کشف وکرامات اسی حالت جذب ہی میں زیادہ سرزد ہوتی ہیں اور بہت سے خوارق عادات بھی اسی وقت ان کے صرف کہہ دینے سے ظہور میں آ جاتے ہیں۔اور جب یہ جذب کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ معمولی آدمی رہ جاتے ہیں اور کوئی کرامت نہیں دکھا سکتے۔اس لیے ان کا یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ یہ خود خدا ہی تھا جو اس وقت ان کے جسم میں حلول کر گیا تھا۔حالانکہ حلول کا عقیدہ الحاد ہے اور تمام صوفیائے کرام اور علمائے عظام اس بات پر متفق ہیں کہ حلول کا عقیدہ رکھنے والا ملحد ہے۔لیکن یاد رکھیے کہ حلول کے عقیدہ کو غلط فہمی کی وجہ سے اپنے دل میں رکھنا تو زیادہ نقصان دہ نہیں اور اس سے رجعت نہیں ہوتی لیکن حالت صحو میں لوگوں کے سامنے اس عقیدے کو بیان کرنا اور اس پر اڑے رہنا بہت بڑا گناہ ہے کیوں کہ اس طرح عامۃ المسلمین کے عقائد خراب ہوتے اور ان کے ایمان میں خلل آتا ہے۔

یہ تو تھی مبتدیوں کی مثال۔منتہیوں کی ایک مثال یہ ہے کہ جب وہ ھو میں پہنچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی صورت اور شکل موجود نہیں لیکن عالم مثال اور عالم مادی میں جو کچھ پیدا ہوتا اور ظہور میں آتا ہے وہ سب اسی مقام ھو سے وہاں تک مدارج تنزلات طے کرتا ہوا پہنچتا ہے تو وہ لطائف عالم امر سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ھو کو خدا کی ذات خیال کر لیتے ہیں۔میرے شیخ جناب مولانا کریم الدین احمد فرماتے تھے کہ وہ جب ھو عدم، نفس اور عقل کے لطائف طے کر کے لطیفہ روح میں پہنچے اور یہ لطیفہ ان پر کھلا تو وہ غلطی سے روح کو ذات باری تعالیٰ سمجھ بیٹھے اور تقریباً

ایک سال تک اسی کو سجدے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دستگیری فرمائی۔ جنگل بیابان میں ایک مجذوب بزرگ ملا۔ اس نے کہا کہ تو تو کافر ہے۔ روح کو سجدے کرتا ہے۔ جب مولاناؒ نے اس سے گفتگو کرنا چاہی تو بجائے گفتگو کرنے کے اس مجذوب نے مولاناؒ کے منہ پر تھپڑ مارا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ تھپڑ کا لگنا تھا کہ حقیقت مجھ پر روشن ہو گئی اور جس غلط فہمی میں مبتلا تھا میں نے اس سے توبہ کی اور آگے منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ مجھ کو خود دوران سلوک ایک ایسی ہی غلط فہمی ہوئی۔ یعنی جب میں عدم میں پہنچا اور میں نے معلوم کیا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی رنگ نہ بو، نہ جسم نہ صفت۔ تو میں نے اس کو ذات باری تعالیٰ سمجھا اور تقریباً دو سال اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا اور آگے بڑھنے کی کوشش کو ترک کر دیا۔ حالانکہ ابھی سارا عالم امر اور سوادعرش طے کرنا تھا۔ لیکن آخر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا۔ میرے ایک دوست کے ذریعے ایک مجذوب نے مجھ کو پیغام بھیجا کہ "او سینما والے یہ تو دریائے نیل ہے۔ اس پر عوج بن عنق کی ہڈی کا پل ڈال اور دوسرے کنارے پر چلا جا کہ اصل ملک تو وہیں سے شروع ہوتا ہے۔" مجذوب کی یہ بڑ سنتے ہی مجھے القاء ہوا کہ دریائے نیل سے مراد عدم ہے اور عوج سے مراد اوج ہے۔ یعنی تو عدم میں ہے اس کے اوج پر پہنچ جا تو پھر دوسرے ملک یعنی عالم امر میں داخل ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ عقل مند طالب اسی سے سب کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

آیئے اب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا کے مسلمانوں پر رحم کرے اور ان کو ایمان کامل دے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو کفار و مشرکین کے مقابلہ کی طاقت دے اور ان پر فتح کامل عطا فرمائے۔ حلقہ توحیدیہ کے سب بھائیوں کو دین اور دنیا دونوں میں کامیاب اور سرخرو کرے اور اپنے پیارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کے صدقہ میں اپنے قرب، لقاء اور معرفت سے سرفراز فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

خادم الخدام

عبدالحکیم انصاری

نوشہرہ درکاں، 16 اپریل 1966ء

خطبہ......6

7-4-1967

کونویں سالانہ اجتماع پر بمقام لاہور ارشاد فرمایا

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلۂ توحیدیہ..........السلام علیکم

اللہ کے مہر و کرم اور عنایات و نوازشات کا شکر کس منہ سے ادا کیا جائے کہ اس نے یہ دن دکھایا کہ ہم سب پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے تا کہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر نظر کریں اور دل و دماغ کو دنیوی آلائشوں سے پاک صاف کر کے اور اپنے اخلاق و قلوب کا تزکیہ و تصفیہ کر کے پھر ایک ولولہ تازہ کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جائیں اور اپنی اصلاح و فلاح کے لیے جوش و خروش سے کام کر کے ایک حیات نو حاصل کریں۔ اس لیے آیئے سب سے پہلے اللہ کی گونا گوں مہربانیوں کا شکر ادا کریں اور حمد و ثنا بجا لائیں اور اس کے بعد حضور تاجدار مدینہ ﷺ پر درود و سلام بھیجیں۔

امابعد!

اب میں اپنی اور پورے حلقۂ توحیدیہ کی طرف سے میاں محمد علی زاد اللہ عمرہ اور ان کے رفقائے کار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی پرخلوص دعوت پر ہمارا یہ جلسہ ایک دفعہ پھر لاہور میں ہو رہا ہے۔ اس موقع پر محمد علی صاحب اور ان کے رفقائے کار نے اپنے مہمان بھائیوں کو آرام پہنچانے کے لیے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا اجر عظیم عطا فرمائے اور دین و دنیا میں ان سب کو مراتب اعلیٰ عطا فرمائے۔ آمین۔ اس کے ساتھ ہی میں ان تمام پیارے بھائیوں اور مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جو اطراف و اکناف پاکستان سے تکلیف اٹھا کر اور کئی ضروری کام ادھورے چھوڑ کر محض اللہ کی خوشنودی کے لیے تشریف لائے ہیں۔ پیارے بھائیو! میں آپ سب کو خلوص دل کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ قادر و توانا آپ کی تمام دلی تمنائیں بر لائے اور خوش و خرم رکھے۔ آمین یارب العالمین

برادران سلسلہ! خطبہ شروع کرنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ چند منٹ یاد رفتگان کے لیے صرف کیے جائیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے سال سالانہ جلسہ ختم ہونے کے دو چار دن بعد ہی ہمارے حلقہ کے ایک بہت ہی اچھے اور بزرگ بھائی ہم سب کو داغ مفارقت دے کر اللہ کے پاس

چلے گئے ۔میری مراد بخشیش الٰہی صاحب مرحوم ومغفور سے ہے ۔یہ حلقہ کے سر برآوردہ بھائیوں میں سے تھے ۔ملک صاحب نے حلقہ کی خدمت 8،10 سال تک نہایت خلوص' تندہی اور جوش و خروش سے کی۔کراچی کے حلقہ میں ہمارے ارکان کی تعداد دوسرے حلقوں سے کافی زیادہ ہےاور یہ فرق ملک صاحب کی ان تھک کوششوں کی وجہ سے ہےصرف تعداد ہی نہیں بلکہ جن لوگوں کی تربیت ملک صاحب نے کی تھی انہوں نے روحانی اور اخلاقی ترقی بھی خاصی کی ہے۔ ملک صاحب کےعلاوہ اور کئی بھائیوں کے والدین اوراعزاواقربا نےبھی اس سال داعی اجل کولبیک کہا ہے۔آیئےان سب کے لیےخصوصاً حافظ فضل الرحمٰن صاحب کی اہلیہ محترمہ کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کواپنے جوار رحمت میں جگہ دےاوران کے پس ماندگان کوصبر عطا فرمائے ۔آمین

برادران سلسلہ! یہ ہمارا نواں سالانہ اجتماع اور چھٹا خطبہ ہے۔پچھلے پانچ خطبوں میں میں نے وہ تمام امور بہت سادہ اورآسان زبان میں صاف صاف بیان کر دیئے ہیں جو قرب ومعرفت باری تعالیٰ کے لیےضروری ہیں ۔یہ خطبہ لکھنے سے پہلے میں نے کئی دن غور کیا کہ اب کیا لکھوں ۔لیکن کوئی نئی یا خاص بات یاد نہ آئی ۔اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خطبہ میں حلقہ کی تکوین وتدوین کا کچھ حال بیان کروں ۔اورحلقہ کی تکوین سے اب تک طالبان راہ طریقت کے متعلق جو کچھ تجربات ہوئے ہیں ان پر روشنی ڈالوں ۔اس طرح ہر وہ شخص جواس خطبہ کوغور سے سنے گااور گھر جا کرغور سے پڑھے گااس کواپنی غلطیاں اور خامیاں بہت اچھی طرح معلوم ہو جائیں گی اور وہ چاہے گاتوان کو دورکر کےصراط مستقیم پر گامزن ہوجائے گااوراپنی مرادپائے گا۔جو نہ چاہے گا نامراد رہے گا۔لیکن میں اپنے فرض رہنمائی وراہبری سے بری الذمہ ہوجاؤں گا۔وَمَا عَلَيْنَا اِلاَّ الْبَلاَغ

بیعت کا آغازاور سلسلہ کی تنظیم:

محبان عزیز! میں نے بیعت کا سلسلہ 1950ء سےشروع کیااور بخدا بالکل مجبوری کے عالم میں شروع کیا۔ورنہ میں پیر بن کرمنظر عام پرآنے کوسخت ناپسند کرتا تھا۔لیکن ہوا یہ کہ تقسیم ہند کے بعد قیام کراچی کے دوران جولوگ میری صحبت میں رہتے تھےان میں سے اکثر حضرات میں وہ روحانی آثار پیدا ہو گئے جوایک سالک میں باقاعدہ بیعت ہونے کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں ۔

جب ان لوگوں میں سوز و جذب پیدا ہوا اور سرور نشہ رہنے لگا تو خواہ مخواہ طلب اور زیادہ ہوئی اس پر انہوں نے اصرار شروع کیا ان کو با قاعدہ بیعت کر لیا جائے تا کہ وہ منازل سلوک طے کر کے اپنی مراد کو پہنچیں۔ یہ کل پانچ سات آدمی تھے لیکن سبھی میرے نہایت عزیز اور بے تکلف دوست تھے۔ کئی ماہ تک میں انکار اور ان کے روز افزوں اصرار کا مقابلہ سختی سے کرتا رہا لیکن آخر کار ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

1954ء تک ارکان سلسلہ کی تعداد چالیس پچاس سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن جنوری 1955ء میں جب میں مستقل طور پر بنوں آ گیا تو چند ہی مہینوں میں یہ تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ 1956ء کے آخر میں ضرورت محسوس ہوئی کہ حلقے کی با قاعدہ تنظیم کی جائے۔ چنانچہ یہ قاعدہ بنایا گیا کہ جس مقام پر کم از کم 5 آدمی سلسلہ میں شامل ہو جائیں وہیں حلقہ قائم کر دیا جائے اور انہی پانچوں میں سے ایک کو ان کا انچارج مقرر کر دیا جائے۔ پشاور میں چونکہ ارکان حلقہ کی تعداد بہت تھی اس لیے تجربتہً پہلا حلقہ دینی قائم کیا گیا اور ملک بخشش الٰہی مرحوم کو حلقہ کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں دوسرے شہروں میں بھی اسی طرح حلقے قائم ہوتے چلے گئے۔ تنظیم کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتے ہوئے کئی باتیں منکشف ہوئیں اور میں نے ان کو سلسلہ کے دستور میں شامل کر دیا۔ سب سے **پہلی بات** یہ خیال میں آئی کہ دوسرے سلسلوں کے مشائخ جو بہت سے خلیفہ بنا دیتے ہیں یہ کچھ اچھی اور مفید بات نہیں ہے۔ اس سے یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ مریدوں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ ہر ایک خلیفہ کا مزاج، عادت، علم اور اخلاق چونکہ دوسرے سے کسی نہ کسی قدر مختلف ہوتا ہے اس لیے ان کے حلقوں کا رنگ اور طریقہ کار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اس طرح شیخ حلقہ کی جماعت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور ان ٹکڑیوں میں وہ ارتباط، ہم رنگی و ہم آہنگی باقی نہیں رہتی جو ایک جماعت کی مضبوط تنظیم اور طاقت کے لیے پہلی اور ضروری شرط ہے۔ اس لیے میں نے اس طریقے کے بجائے سلسلہ توحیدیہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب تک بھی یہ سلسلہ قائم رہے اس کے شیخ کا صرف ایک ہی خلیفہ ہوا کرے گا اور وہی اس کا جانشین بھی ہوگا۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو ابتدائے اسلام

میں یہی طریقہ رائج تھا جو خلفائے راشدین تک قائم رہا۔اس طریقہ میں ایک دقت بھی پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اہل سلسلہ کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو شیخ سلسلہ بنفسہ ان سب کی تربیت کماحقہٗ نہیں کر سکتا۔اس لیے میں نے یہ طریقہ کار بنایا کہ جہاں کہیں اور جیسے جیسے ضرورت ہو کچھ احباب کو جو قابل اور اہل ہوں مجاز مقرر کر دیا جائے جو اپنے پیر بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا فرض ادا کریں۔چنانچہ اب یہی طریقہ سارے پاکستان کے توحیدی حلقوں میں رائج ہے۔

تنظیم کے لیے دوسری ضروری شرط یہ ہے کہ جماعت کی تمام چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور جماعت کے تمام افراد میں باہمی ربط و ضبط اور اتنی محبت ہو کہ ایک فرد کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو پوری جماعت کا ہر فرد اس کو اسی طرح محسوس کرے جس طرح کہ وہ شخص کر رہا ہے جس پر یہ مصیبت پڑی ہے۔اس درجہ کا ربط و ضبط پیدا کرنے اور اس کو قائم رکھنے کے لیے میں نے یہ طریقے بنائے ہیں۔

سلسلہ میں باہمی محبت اور ربط و ضبط کے طریقے

ا۔ ہفتہ وار حلقہ:

ہفتہ وار حلقہ محض اسی لیے قائم کیا گیا ہے کہ ایک شہر کے سب بھائی ہفتہ میں کم از کم ایک دن تو آپس میں مل بیٹھیں۔اپنی کہیں، دوسروں کی سنیں اور اگر کسی بھائی پر کوئی مصیبت پڑی ہو تو اس کو سب مل کر دور کرنے کی کوشش کریں یا اگر کسی بھائی کو کوئی خوشی کا موقع میسر آیا ہو تو سب مل کر اس کی خوشی کو دوبالا کریں۔ایسے موقعوں پر اگر ساتھ کھانے پینے کا بھی کچھ بندوبست ہو جائے تو سبحان اللہ۔میرے خیال میں تو ہر شخص یہ جانتا ہوگا کہ اس قسم کی صحبتوں اور خصوصاً دعوتوں کی شرکت سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور ارتباط باہمی کو ترقی ہوتی ہے۔ایسی مجلسوں کے لیے تو عام لوگ ناچ رنگ، گانے بجانے اور کھیل تماشوں کا اہتمام کرتے ہیں۔لیکن آپ خود غور کریں کہ جہاں کہیں ایسی صحبتوں میں اللہ اور اس کے رسول a کا ذکر خیر ہو اور اللہ کے نام پر لوگ اکٹھے ہوں تو ان مجلسوں کی خیر و برکت کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔مگر افسوس کہ ہمارے حلقے کے بہت سے احباب اس نکتہ پر بالکل غور نہیں کرتے۔بہت سے تو ایسے ہیں جو صرف میرے یا دوسرے پیر

بھائیوں کے دکھانے کو محض رسماً شریک ہو جاتے ہیں۔لیکن ان سے بھی عجیب تر وہ بھائی ہیں جو اس ہفتہ واری حلقہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس میں شریک ہونے کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ بس ہم نے ذکر اللہ کا حق ادا کر دیا۔میرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ گھر پر روزانہ ذکر نہیں کرتے۔ہفتہ کے ہفتہ ذکر کر لینے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ایسے لوگوں کو روحانیت کا کوئی حصہ نہیں ملے گا۔روحانی ترقی تو انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو بتائے ہوئے طریقے کے مطابق روزانہ ذکر کرتے ہیں اور ہفتہ وار حلقوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

۲۔ عام میل ملاقات:

حلقہ کے بھائیوں کو چاہیے کہ ہفتہ وار حلقہ ذکر کے علاوہ اور دنوں میں بھی جہاں کہیں اور جب کبھی ممکن ہو میل ملاقات کی صحبتیں گرم کیا کریں اور جتنی بھی زیادہ دیر تک ممکن ہو ایک دوسرے کی صحبت میں بیٹھیں۔چونکہ ان صحبتوں میں لغو اور فضول باتیں نہیں ہوں گی۔صرف اللہ اور رسول ﷺ کا ذکر اور دوسری نیک اور مفید باتیں ہوں گی تو اس سے باہمی ربط وضبط کے علاوہ روحانی طاقت بھی بڑھے گی۔افسوس ہے کہ حلقہ کے اکثر لوگ اپنے پیر بھائیوں کی صحبت میں بیٹھنے کا کوئی التزام نہیں کرتے۔یہ لوگ بدنصیب ہیں ان کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کن کن دنیوی اور روحانی نعمتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

۳۔ خط وکتابت:

شیخ حلقہ اور اپنے پیر بھائیوں سے خط وکتابت کرنے اور ان سے اپنے نجی کاموں میں مشورے لینے اور ممکن امداد طلب کرنے سے بھی ربط وضبط قائم رہتا اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔☆مگر افسوس ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اتنی بات تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ سلسلہ میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔ظاہر ہے کہ شیخ سلسلہ ان میں سے ہر ایک کو یاد نہیں رکھ سکتا اور جو آدمی یاد ہی نہ ہو اس کے لیے دعا کیسے ہو سکتی ہے اور خاص فیض کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے۔ہمارے حلقہ میں بھی بہت سے آدمی ایسے ہیں جو مرید ہونے کے بعد سے پھر کبھی ملے

☆.....آج کل موبائل کے ذریعے رابطہ بھی خط کا اچھا نعم البدل ہے۔

ہی نہیں ۔ مجھے نہ ان کا نام یاد ہے نہ صورت ۔ بتایئے میں ان لوگوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں ۔خدا جانے یہ لوگ حلقہ کی تعلیم پر عمل بھی کرتے ہیں یا نہیں' ہاں ایک بات ضرور ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو فوراً خط لکھتے ہیں اور خط میں ایک دو نہیں بلکہ پوری فہرست لکھ دیتے ہیں کہ اس کام کے لیے دعا کیجیے اور اس کام کے لیے دعا کیجیے ۔ یہ مشکل آسان فرمایئے' یہ عقدہ حل کیجیے اور وہ پریشانی دور فرمایئے ۔ غالباً یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے مرید ہو کر پیر صاحب پر بڑا احسان کیا ہے اور پیر ہی اس بات کا واحد ذمہ دار بلکہ ٹھیکیدار ہے کہ وہ کچھ کریں نہ کریں پیر ان کی دنیا اور دین کے تمام کام خود انجام دے ۔ بعض آدمی کہتے ہیں کہ ''اچھا تو صرف یہ بتا دیجیے کہ یہ کام ہو گا بھی یا نہیں اور ہو گا تو کب تک ہو گا ۔'' گویا کہ پیر قادر مطلق ہے کہ ان کی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور عالم الغیب بھی ہے جو بتا سکتا ہے کہ فلاں کام ہو گا بھی یا نہیں اور ہو گا تو کب تک ہو گا ۔

یاد رکھیے ! اپنے مرشد سے اس قسم کے سوال کرنا اس کی انتہائی تذلیل و توہین ہے ۔ ایک طرف تو یہ لوگ مرشد کو قادر مطلق مان کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ۔ دوسری طرف اس کو ارشاد کی گدی سے اتار کر فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے نجومی یا پامسٹ کے برابر لا بٹھاتے ہیں ۔ ''تعمیر ملت''، ''طریقت توحیدیہ'' خطبوں اور ذاتی خطوں میں میں نے تو بار بار یہی لکھا ہے اور تقریروں میں ہزاروں بار یہی کہا ہے کہ مجھ میں مطلق یہ طاقت نہیں کہ تمہارے بگڑے کام بنا سکوں' تمہاری تقدیر بدل سکوں یا تمہاری مشکلیں آسان کر سکوں ۔ میں تو خود ایک عاجز انسان ہوں ۔ مجھ پر خود ساری عمر مصیبتیں پڑتی رہیں مگر کسی ایک کو بھی دور نہ کر سکا ۔ ہاں یہ میں ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہارے لیے دعا کر دوں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمہیں خدا اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے ہدایت کے راستے کی نشان دہی کر دوں تا کہ اس راستہ پر کچھ عرصہ ثابت قدمی سے چلنے کے بعد خود تمہارے دلوں میں وہ بات پیدا ہو جائے کہ تمہاری دعائیں قبول ہونے لگیں اور جو قبول نہ ہوں ان پر تم کو صبر آ جائے ۔ افسوس کہ یہ لوگ اس بات کی قدر ہی نہیں جانتے اور میرا کہا بالکل نہیں مانتے ۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مجھ سے تو بیسیوں ایسی باتوں کی فرمائش کی جاتی ہے جن کا پورا کرنا میرے اختیار میں نہیں صرف خدا کے اختیار میں ہے اور خود ان دو چار باتوں پر بھی عمل نہیں کرتے

جو میں نے انہی کے فائدے کے لیے ان کو بتائی ہیں اور جن کا کرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔ آمین

۴۔ سالانہ اجتماع:

یہ اجتماع بھی اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ جن بھائیوں کو کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوتا ہو وہ یہاں مل کر ایک دوسرے کے اور نزدیک ہو جائیں اور یہ ملاقات ازدیادِ محبت کا باعث ہو۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہاں بھی اکثر بھائی صرف انہی دوستوں سے ملتے اور تین دن تک انہی کی صحبت میں رہتے ہیں جن کو وہ پہلے سے ہی عزیز رکھتے ہیں۔ اس لیے میں سب بھائیوں کو خاص طور پر ہدایت کرتا ہوں کہ یہ خطبہ ختم ہونے کے بعد سے اجتماع کے ختم ہونے تک ہر ایک آدمی نئے نئے بھائیوں سے ملے اور زیادہ وقت انہی کی صحبت میں گزارے۔ اس بات کا تو میں گمان بھی نہیں کر سکتا کہ ہمارے حلقہ میں کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا جو اپنے سے غریب یا کم علم بھائی سے ملنے میں عار محسوس کرتا ہو۔ پھر بھی میری ہدایت یہی ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بھائیوں سے ملو جو تم سے مرتبۂ علم یا دولت میں کمتر ہیں۔ اس سے تین فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ اگر تمہارے اندر غرور کا کوئی شمہ بھی ہے تو ختم ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ غریب بھائی امیروں اور عالموں سے ملنے میں جو جھجک محسوس کرتے ہیں ان کی اس جھجک اور احساس کمتری کا خاتمہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ ہر ایک کے دل میں محبت کا چراغ اور زیادہ منور ہو جائے گا جو اس حلقہ کی تعلیم کا ایک خاص مقصد ہے۔

۵۔ ماہوار فنڈ:

ویسے تو یہ فنڈ غریب اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کے لیے قائم کیا گیا ہے لیکن غور کریں تو اس کی وجہ سے بھی حلقہ کے ساتھ رابطہ اور تعلق قائم رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جو لوگ فنڈ میں حصہ لیتے ہیں وہ نہ صرف ثواب کماتے ہیں بلکہ ظاہر ہے کہ ان کو حلقہ کی فلاح و بہبود کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور رہتا ہے۔ برخلاف اس کے جو لوگ نہ تو ذکر اذکار کرتے ہیں نہ ہفتہ وار حلقوں میں شریک ہوتے ہیں نہ فنڈ ہی میں حصہ لیتے ہیں ان کی بابت کس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حلقہ میں شامل ہیں۔ میں تو ان لوگوں کو حلقہ کا کارکن ہی نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بیعت ہونے کے بعد کوئی

روحانی یا دنیوی فائدہ نہیں ہوتا۔

الغرض یہ ہیں وہ طریقے جو میں نے حلقہ کے بھائیوں میں ربط وضبط اور تعلق قلبی پیدا کرنے کے لیے بنائے ہیں۔اگر ان طریقوں کے علاوہ کسی بھائی کے ذہن میں ازدیادارتباط وتنظیم کا کوئی اور طریقہ موجود ہو یا آئندہ سمجھ میں آئے تو اسے چاہیے کہ مجھ کو بتادے یا لکھ دے میں بہت ممنون ہوں گا۔اب میں حلقہ کی تعلیم کا سرسری سا حال بیان کر کے یہ بتاؤں گا کہ حلقہ کے احباب نے اس پر کہاں تک عمل کیا ہے۔

سلسلے کے عقائد:

حلقہ کی تنظیم کے وقت تک مجھے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اس حلقہ کا کوئی نیا نام رکھنا چاہیے اور تعلیم کو آسان کردینا چاہیے۔میں نے خود سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کا سلوک طے کیا تھا اور جو لوگ حلقہ میں شریک ہوتے تھے ان کو بھی یہی کہتا تھا کہ ہم نقشبندی ہیں۔مگر جب ہم نے حلقہ کی تنظیم شروع کی تب یہ خیال آیا کہ حلقہ کی تنظیم اور تعلیم موجودہ زمانہ کے حالات ومقتضیات کے مطابق ہونی چاہیے ورنہ کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوسکے گا۔آپ جانتے ہیں کہ پہلے جتنے بھی سلسلے موجود ہیں ان سب میں اس قدر زیادہ اوراد ووظائف پڑھنے کو بتائے جاتے ہیں کہ اگر انسان ان کو پوری طرح ادا کرے تو حصول معاش کے لیے وقت ہی نہیں بچتا۔اس کے ساتھ ہی نفس کشی کے لیے اتنے سخت مجاہدے اور ریاضتیں ضروری ہیں کہ اس زمانہ کے نازک مزاج اور نحیف الجثہ لوگ کسی طرح بھی برداشت نہیں کرسکتے۔میں نے ضروری سمجھا کہ سلوک کو قابل عمل بنانے کے لیے اسے مختصر اور آسان کیا جائے۔اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ پرانے مروجہ سلسلوں میں اپنے پیروں اور فوت شدہ بزرگوں کے مزاروں کی عزت اس قدر مبالغے سے کی جاتی ہے کہ وہ پرستش کی حد تک پہنچ گئی ہے جو قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔باوجود ازیں اگر کوئی سالک روحانیت حاصل بھی کر لے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی نسبت اپنے شیخ یا کسی فوت شدہ بزرگ سے قائم ہوجاتی ہے۔یہ لوگ حضور اکرم a تک بھی نہیں پہنچ پاتے 'خدائے برتر وتوانا کا تو ذکر ہی کیا ہے۔اور تو اور خود میں نے جب سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک طے کرلیا۔یعنی لطائف کھل گئے

اوران کے دوائر کی سیر کر لی اور مجھے خلافت مل گئی تو میں نے اپنے مرشد جناب مولانا کریم الدین احمد e سے عرض کیا کہ قبلہ میں تو اس غرض سے بیعت ہوا تھا کہ مجھ کو خدا کا قرب اور معرفت یا قسمت میں ہو تو دیدار حاصل ہو جائے وہ تو کچھ بھی نہ ہوا اور یہ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ تو میرے نزدیک کچھ بھی نہیں۔تو انہوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور فرمایا کہ سلسلہ کے سلوک میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔خدا کی طلب ہے تو صبر کرو۔قسمت میں ہے تو کوئی سامان ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ حلقہ کی تنظیم کرتے وقت یہ سب حالات میرے پیش نظر تھے اور یہ سب باتیں میرے ذہن نشین تھیں۔کئی ماہ تک دن رات غور وفکر کرتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔مگر کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔یکا یک ایک دن بجلی کی طرح ایک خیال دماغ میں آیا کہ سلسلہ کا نام تو حیدیہ رکھنا چاہیے اور تعلیم کی اساس و بنیاد خالص توحید پر ہونی چاہیے۔اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ القاء تھا یا محض خیال مگر طبیعت اس پر جم گئی کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔چنانچہ میں نے پہلے ''تعمیر ملت'' لکھی اور اس میں توحید باری تعالیٰ پر خاصے مدلل اور مسکت انداز میں بحث کی اور اس کے فوائد ایسی روشن دلیلوں سے ثابت کیے کہ شاید کوئی آنکھوں کا اندھا ہی ان سے انکار کر سکے۔اس کے بعد میں نے ''طریقت توحیدیہ'' تحریر کی اور اس میں حلقہ کی تعلیم اور تنظیم صاف صاف قلم بند کر دی اور توحید کے متعلق اپنے عقائد کھول کھول کر بیان کر دیئے لیکن افسوس کہ دوسرے تو رہے الگ خود میرے اپنے حلقہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو خالص توحید کو نہیں مانتے۔دوسروں سے تو مجھے کوئی غرض نہیں کوئی کچھ بھی مانا کرے۔میرے پاس دوسروں سے بحث مباحثہ کرنے بلکہ لڑنے جھگڑنے کے لیے فالتو وقت ہی نہیں۔بقول اکبرالٰہ آبادی

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مگر اپنے حلقہ والوں سے تعرض کیے بغیر تو کسی طرح بھی نہیں رہ سکتا۔اگر میں اتنا بھی نہ کروں تو حلقہ توحیدیہ قائم کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔آج میری زندگی میں جب میرے حلقہ میں کچھ مشرک گھس آئے ہیں تو میرے مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

یہ لوگ اللہ کے سوائے اور بھی چند ہستیوں کو قادروتوانا مانتے ہیں۔ان کا قول ہے کہ اولیاء اللہ بھی انسان کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔جس کو چاہیں بنا سکتے ہیں اور جس کو چاہیں بگاڑ سکتے ہیں۔بس یہی بات شرک ہے۔اگر وہ یوں مانیں کہ یہ طاقت صرف اللہ ہی کو ہے کہ وہ لوح محفوظ پر اپنے لکھے ہوئے کو مٹا کر جو چاہے لکھ سکتا ہے اور وہ اپنے کسی مقبول بندے کی دعا سے کبھی کبھی ایسا کر بھی دیتا ہے تو یہ لوگ شرک سے بھی بچ جائیں اور اولیاء اللہ کی بزرگی اور عظمت بھی قائم رہے۔سورہ رعد میں ارشاد ہوتا ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتَابِ (الرعد:39)

یعنی ''اللہ جو چاہتا ہے لوح محفوظ سے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اس میں باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔''پس اگر یہ لوگ یوں مانیں کہ اپنے کسی پیارے بندے کی دعا سے اللہ تعالیٰ لوح محفوظ یعنی تقدیر کے لکھے کو مٹا بھی دیتا ہے تو بتائیے اس میں کیا قباحت ہے۔

نور و بشر کا مسئلہ:

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضور سرورکائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام بشر نہیں خدا تھے (نعوذ باللہ) یعنی اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی شکل میں خود اس زمین پر نازل ہوا تھا کہ اپنے گمراہ بندوں کو ہدایت کرے۔چنانچہ ان کا قول ہے کہ احد اور احمد ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔احد یعنی اللہ میم کا برقعہ اوڑھ کر احمد بن کر زمین پر آیا۔قرآن میں ایک نہیں دو نہیں بیسیوں آیتیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حضور ﷺ بشر تھے۔احادیث میں بھی بیسیوں حدیثیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے بشر ہونے کا بین ثبوت ہیں۔لیکن جب قرآن اور احادیث کے علی الرغم کوئی اپنی ضد پر اڑا رہے تو ایک حق پرست کے پاس سوائے خاموشی کے اور کیا جواب ہو سکتا ہے۔چنانچہ سورہ کہف میں ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (الکہف:110)

''ان سے کہہ دیجیے کہ بے شبہ میں تم ہی جیسا آدمی ہوں البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل:93)

”کہہ دیجیے کہ سبحان اللہ میں تو آدمی ہوں لیکن رسول ہوں۔“

سورۃ بقرہ آیت نمبر 151 میں ہے کہ

اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنكُمْ

”ہم نے تم میں ہی سے تمہارے پاس ایک رسول بھیجا“ الخ۔

سورۃ یونس آیت 49 میں ہے

قُل لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلاَ نَفْعًا

”کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے ذاتی فائدے اور نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔“

سورۃ جن آیت 21 میں ہے:

قُلْ اِنِّيْ لا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلا رَشَدًا

”کہہ دیجیے میرے ہاتھ میں نہیں تمہارا برا بھلا یا راہ پر لانا۔“

سورۃ اعراف آیت 188 میں ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلاَ ضَرًّا

”کہہ دیجیے کہ میں تو مالک نہیں اپنی جان کے برے بھلے کا بھی۔“

سورۃ انعام آیت 50 میں ہے:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ

”کہہ دیجیے کہ نہ میرے پاس خزانے ہیں اور نہ میں غیب دان ہوں نہ میں فرشتہ ہوں۔“

سورۃ زمر آیت 30 میں ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ

”اے پیغمبر تم بھی مر جاؤ گے اور یہ بھی مر جائیں گے۔“

الغرض بے شمار آیتیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حضورﷺ بشر ہیں۔ ان تمام آیات کے علاوہ سورہ اخلاص میں کس قدر صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (اخلاص:3) ”نہ اس

نے کسی کو جنا ہے نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے۔" اب دنیا جانتی ہے کہ حضور ﷺ تو حضرت بی بی آمنہؓ کے شکم مبارک سے پیدا ہوئے تھے۔ اس پر بھی کوئی اپنی ضد پر اڑا رہے تو اس کا کیا علاج۔ یہ تو تھا قرآن۔ کتب احادیث میں بھی ایسی بے شمار حدیثیں ہیں مثلاً بخاری اور ترمذی میں ہے کہ حضور ﷺ کو بھوک کی شدت اسی طرح محسوس ہوتی تھی جس طرح عام آدمیوں کو محسوس ہوتی ہے۔ بیہقی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کو بچھو نے کاٹا تو اس پر اسی طرح دم کیا گیا جس طرح عام آدمیوں کو کیا جاتا ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ حضور ﷺ کو زہر کھلایا گیا تو اس کا اثر ویسے ہی ہوا جیسے کہ عام آدمیوں پر ہوتا ہے۔ بخاری ہی میں ہے کہ حضور ﷺ زخمی ہوئے اور حضور ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے تو حضور ﷺ کے خون نکلا اور حضور ﷺ کو اسی طرح تکلیف محسوس ہوئی جیسے کہ عام آدمیوں کو ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ بیمار بھی ہوئے۔ حضور ﷺ نے کئی نکاح بھی کیے اور آپ ﷺ کے اولاد بھی ہوئی۔ پھر یہ کہ حضور ﷺ نے عام آدمیوں کی طرح رحلت فرمائی اور دفن کیے گئے۔ کیا یہ سب آیتیں اور حدیثیں انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ انہی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کا جسم اطہر مادہ کا بنا ہوا نہ تھا بلکہ نور کا بنا ہوا تھا۔

مندرجہ بالا آیات اور احادیث اس عقیدے کا بھی بطلان کرتی ہیں مگر جب کوئی ان آیات و احادیث پر غور ہی نہ کرے تو میں اور آپ اس کا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ نہ نور کے اصلی معنی سے واقف ہیں نہ ظلمت کے۔ ظاہر بین آنکھوں کو جو نور اور اندھیرا نظر آتا ہے یہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں۔ اگر واقعی یہ لوگ ان الفاظ کے لفظی معنی ہی لیتے ہیں تو بھی غلطی پر ہیں۔ مگر ان کو اپنی غلطی اس لیے نظر نہیں آتی کہ وہ غور وفکر نہیں کرتے۔ اگر وہ ذرا بھی غور کریں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ غلطی پر ہیں۔ دیکھیے یہ لوگ جو حضور اکرم ﷺ کے مقدس ومطہر جسم کو نور مانتے ہیں تو یقیناً خدا کا نور ہی مانتے ہوں گے۔ ایسا نور تو ہرگز نہ مانتے ہوں گے جیسا کہ جلتی ہوئی دیا سلائی کا نور یا موم بتی کا چراغ یا بجلی کے بلب کا' یا اس سے بھی بڑھ کر ستاروں' چاند اور سورج کا نور۔ اب اگر یہ غور کریں تو ان کو معلوم ہو کہ ہر بڑے اور تیز نور کے سامنے اس سے چھوٹا اور کمتر نور مدہم یا بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ مثلاً جس کمرے میں مٹی کے تیل کا چراغ یا 15 کی پاور کا بلب جل رہا ہو وہاں

اگر ہزار کینڈل پاور کا بلب روشن کر دیا جائے تو مٹی کے تیل والے چراغ اور 15 نمبر کے بلب کی روشنی بالکل ہی غائب ہو جائے گی حالانکہ وہ وہیں موجود ہوگی ۔اب اس نا قابل تر دید ثبوت کی روشنی میں غور کیجیے کہ اگر حضورﷺ کا جسم خدا کا نور تھا تو اس نور کے سامنے دن کے وقت سورج کی اور رات کے وقت چاند کی روشنی ماند کیوں نہیں پڑ جاتی تھی اور مزید برآں یہ کہ خود حضورﷺ کو رات کے وقت چراغ روشن کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی تھی ۔سورج اور چاند تو خدا کی بہت ہی ادنیٰ مخلوق ہیں پھر اس مادی مخلوق کا نور خود خدا کے نور کی موجودگی میں ماند نہ پڑے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے ۔

میں خود نبی کریمﷺ کو نور سمجھتا ہوں لیکن ان معنوں میں نہیں جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ۔میرا اور ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اور یہ امر واقعہ بھی ہے کہ حضورﷺ کی بعثت سے پہلے یہ دنیا کفر و گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھری ہوئی تھی ۔خدائی تعلیم جو پچھلے پیغمبروں کے ذریعہ نازل کی گئی تھی مسخ یا غائب ہو چکی تھی' انسان انسان کو کھا رہا تھا ۔ہر زبردست کمزوروں پر ظلم اور سختیاں کرنا اپنا حق سمجھتا تھا ۔برائی بھلائی میں کوئی تمیز نہ تھی ۔شراب' جوا' چوری' قتل' زنا اور دختر کشی تفریحات کا سامان تھیں ۔دجل وفریب' مکر و ریا اور جور و جفا کے جھکڑ چل رہے تھے ۔غریب انسان بادشاہوں' امیروں اور حاکموں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کسی جائے پناہ کے لیے مارے مارے سرگرداں و پریشاں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے لیکن کوئی ماویٰ وملجا دکھائی نہ دیتا تھا ۔کہیں سر چھپانے کی جگہ نظر نہ آتی تھی ۔یہ حال تھا کہ ایک سرزمین غیر ذی زرع کے مرکز یعنی مکہ مکرمہ کے ایک مبارک گھر سے آفتاب ہدایت کا نور چمکا ۔مخالف عناصر نے بہت مقابلہ کیا' بہت زور مارا' کفر وشرک کی گھنگھور گھٹائیں اٹھیں اور ظلم وستم کی آندھیاں چلیں کہ اس نور ضیا بار کی روشنی کو آگے نہ پھیلنے دیں ۔لیکن سب مٹ گئیں' دب گئیں اور فنا ہو کے رہ گئیں ۔رفتہ رفتہ' آہستہ آہستہ تمام مشرق ومغرب اس نور لازوال کی ضو پاشیوں سے چمکنے دمکنے لگا' جگمگا اٹھا ۔امن وامان' عدل وانصاف اور اخوت ومساوات کی صبح روشن طلوع ہوئی ۔امیروں اور ظلم وستم کے علمبرداروں کی گردنیں جھک گئیں یا توڑ دی گئیں ۔غریبوں کو جائے پناہ اور ماویٰ وملجا میسر آیا ۔دنیا

نے اطمینان کا سانس لیا اور سب اپنے اپنے کام میں لگ کر تہذیب وترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔

اس نور جہاں تاب سے صرف ممالک مشرق وسطی ہی منور نہ ہوئے بلکہ باقی دنیا کا کوئی بھی ملک ایسا نہ رہا جہاں اس کی روشنی نہ پہنچی ہو اور جو اسلام کی تعلیم وتہذیب اور مسلمانوں کے اخلاق اعلیٰ سے متاثر و متمتع نہ ہوا ہو۔ (دنیا جانتی ہے کہ اس وقت یونان کے بوسیدہ فلسفے اور روما کے ظالمانہ قوانین جہاں بانی کے سوا یورپ کے کسی ملک میں بھی حق وانصاف، عدل ومساوات، امن و امان اور علم واخلاق کا نام ونشان نہ تھا)۔ یہ سب باتیں انہوں نے مسلمانوں ہی سے سیکھیں۔ آج بھی ان ممالک کے قصر ترقی کی بنیادیں کھود کر دیکھی جائیں تو آپ کو وہاں اسلامی تعلیم وتہذیب اور اسلامی اخلاق کے جواہر ریزے ہی چمکتے دمکتے نظر آئیں گے۔

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ نور وظلمت یا اجالے اور اندھیرے کی خاصیت کیا ہے؟ نہیں سوچا تو اب سوچئے۔ آپ میں اکثر حضرات کو اکثر یہ اتفاق ہوتا ہو گا کہ رات کے وقت اپنے مکان یا کمرے میں داخل ہوں تو وہاں گھپ اندھیرا ہوتا ہے اور آپ کو مطلق دکھائی نہیں دیتا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ کون سی چیز بے ضرر اور کس چیز سے ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے۔ مگر جونہی آپ بلب کا سوئچ دباتے ہیں کمرے میں نور پھیل جاتا ہے اور آپ کو سب چیزیں صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں اور آپ ان چیزوں سے بچ کر نکل جاتے ہیں جن سے ٹھوکر لگ سکتی تھی۔ اب ایک ایسی رات کا تصور کیجیے جو سخت اندھیری ہے اور آپ جنگل بیابان میں چلے جا رہے ہیں۔ چاند کی آخری تاریخیں ہیں۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا۔ دو قدم آگے کی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ کچھ نظر نہیں آتا کہ آگے کھائی ہے یا کھڈ یا کوئی ٹیلہ۔ خاردار جھاڑیاں ہیں یا نوکیلے پتھر، سامنے دس قدم پر کوئی اژدہا پڑا ہے یا کوئی خونخوار درندہ چھپا ہوا گھات لگائے بیٹھا ہے۔ سوچئے اور خوب سوچئے کہ اس وقت آپ کا کیا حال ہو گا۔ آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی اور اس سیاہ رات کے طویل گھنٹوں میں کتنا سفر کر سکیں گے۔ اب غور کیجیے کہ کافی عرصہ تک یونہی ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے چلتے رہنے کے بعد مطلع مشرق پر آثار سحر نمودار ہوئے سپیدہ صبح نے شاہ خاور کے برآمد ہونے کی خوشخبری سنائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اجالا ہو گیا۔ اب آپ کو نہ

صرف اپنے گرد و پیش بلکہ حد افق تک ہر چیز صاف نظر آنے لگی ۔ آپ کو دکھائی دینے لگا کہ کون سی چیز مضرت رساں ہے' کون سی بے ضرر اور کون سی مفید ۔ اب آپ مفید چیزوں سے فائدہ اٹھاتے' بے ضرر چیزوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرتے اور مضرت رساں چیزوں سے دامن بچاتے پوری تیز رفتاری سے چلنے لگے اور بامراد و شاد کام منزل مقصود پر پہنچ گئے ۔ یہی حال کفر و اسلام کا ہے ۔ کفر ظلمت و اندھیرا ہے اور اسلام روشنی و نور ۔ کافر مطلق نہیں جانتا کہ اس کائنات کا اور خود اس کا اپنا کوئی خالق ہے جو اس کے مرنے کے بعد اس سے نیکی و بد اعمالی کی پرسش کرے گا اور ان پر جزا و سزا دے گا ۔ کافر کو قطعاً معلوم نہیں کہ برائیوں سے اس کی روح کمزور' بیمار اور مفلوج ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد سخت تکلیف اٹھاتی ہے ۔ لیکن اسلام کا نور قلب میں داخل ہوتے ہی خیر و شر اور خوب و زشت ہر انسان کو ایسے صاف صاف نظر آنے لگتے ہیں جیسے دوپہر کا چمکتا ہوا سورج ۔ سوچو کہ یہ کتنی وقیع بات ہے جس کے معلوم ہو جانے سے ایک آدمی کی دنیوی زندگی بھی سدھر جاتی ہے اور آخرت میں بھی وہ کامیاب رہتا ہے ۔ اب غور کرو کہ اس نور اسلام کا منبع اور مخزن کون ہے اور کہاں ہے ۔ یہ ہمارے نبی مکرم ﷺ کی ہی ذات پرانوار ہے ۔ اسی ذات سے یہ نور اس دنیا میں پھیلا ہے اور قیامت تک باقی رہے گا ۔ غالباً اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہمارے حضور ﷺ کن معنوں میں نور ہیں اور حقیقتاً نور ہیں ۔ لیکن یہ خیال کہ حضور ﷺ بشر نہ تھے اور حضور ﷺ کا جسم مبارک مادی نہیں بلکہ خالص نور تھا تو یہ خیال چونکہ قرآن' احادیث اور امر واقعہ کے خلاف ہے اس لیے محض طفلانہ ہے ۔ پڑھے لکھے آدمی ایسی باتیں نہیں کیا کرتے ۔

اب میرا روئے سخن حلقہ کے ان احباب کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا اور جن کو سمجھانے کے لیے یہ سب کچھ لکھنا پڑا ۔ آپ لوگوں کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں ۔ یا تو آپ اپنے ان مشرکانہ عقائد سے بصدق دل توبہ کریں یا ہمارا حلقہ چھوڑ کر کسی ایسے حلقے میں شامل ہو جائیں اور ایسے شیخ سے بیعت کر لیں جو آپ کا ہم عقیدہ ہو ۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا' زبان سے کچھ کہتے رہے اور دل میں وہی عقیدہ رکھا تو جان لیجیے کہ آپ اول درجے کے منافق ہیں جو کافروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں ۔ کافر میں کم از کم یہ خوبی تو ہے کہ اپنے عقیدہ کفر کا صاف صاف اقرار کرتا ہے چھپاتا

نہیں ۔یاد رکھئے منافق کا انجام بہت ہی دردناک اور عبرت انگیز ہوا کرتا ہے ۔وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلاَغ

برادران حلقہ! یہ تو تھیں ہمارے حلقے کے بنیادی عقیدے کی باتیں' اب دوسری باتوں پر بھی کچھ روشنی ڈالنا اور تبصرہ کرنا ضروری ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ میں نے تحریر و تقریر میں یہ بات ہزاروں بار کہی ہے کہ مجھے حلقہ کی تعداد بڑھانا ہرگز منظور و پسند نہیں ۔میں تو یہ چاہتا ہوں کہ حلقہ میں کم سے کم آدمی ہوں لیکن وہ سب کے سب عقیدے کے لحاظ سے پکے مسلمان اور توحیدی ہوں اور اعمال واخلاق کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مومن ۔لیکن افسوس ہے کہ بار بار کی تاکید و تنبیہ کے باوجود ہمارے کئی خادمان حلقہ نے محض تعداد بڑھانے کے لیے بہت سے جاہل اور نا اہل لوگوں کو حلقہ میں شامل کرلیا ہے اور یہی لوگ تکلیف و فساد کا باعث ہوتے ہیں۔دراصل ان لوگوں کو خدا کی طلب تو ہوتی نہیں محض رسماً مرید ہو جاتے ہیں یا پھر اس خیال سے حلقہ میں شامل ہوتے ہیں کہ دنیا سدھر جائے گی ۔ایسے نا اہل لوگوں کی درآمد کو روکنے کے لیے ہی میں نے یہ طریقہ مقرر کیا ہے کہ جو کوئی حلقہ میں شامل ہونا چاہے پہلے اس کو طالب بنا کر حلقہ کی تعلیم سکھا دی جائے اور برس دو برس دیکھا جائے کہ وہ کچھ کرتا ہے یا نہیں اگر وہ پکا ثابت ہو' اس میں کچھ آثار روحانیت پیدا ہو جائیں اور اس کے اخلاق کی اصلاح ہو جائے تب اس کو بیعت کرلیا جائے ورنہ نہ کیا جائے ۔اس قاعدے پر سختی سے عمل نہیں کیا گیا ۔اس لیے بہت سے آدمی حلقہ میں ایسے گھس آئے جو اب دردسر بنے ہوئے ہیں ۔تاہم میں خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ہمارے حلقہ میں اب بھی اسی فیصد آدمی اخلاق کے لحاظ سے اور پچیس فیصد آدمی اخلاق و روحانیت کے لحاظ سے نہایت اچھے اور پکے ہیں ۔مگر میری دلی خواہش یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد جو روحانی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے بلند مرتبہ ہوں سو فیصد ہونی چاہیے ۔اس لیے میں اپنے حلقہ کے خادموں اور مجازین کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کو حلقہ میں شامل کرتے وقت بہت ہی احتیاط سے کام لیں ۔جلدی بیعت نہ کرائیں اور اس وقت تک طالب ہی رہنے دیں جب تک کہ وہ ہمارے معیار پر پورے نہ ہو جائیں ۔

نماز میں سستی:

میں نے جہاں تک غور کیا ہے حلقہ کے ستر اسی فیصد آدمی نماز روزے کے خوب پابند ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو تہجد بھی پڑھتے ہیں اور نفی اثبات کا ذکر علی الصبح کرتے ہیں۔لیکن بیس تیس فیصد ایسے بھی ہیں جو نماز باقاعدہ نہیں پڑھتے۔اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کئی کئی ہفتہ نماز نہیں پڑھتے۔ اول الذکر کا کیا کہنا ان پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو نماز کا اور زیادہ شوق عطا فرمائے اور ان کی نمازوں کو اپنے تقرب کا ذریعہ بنائے۔آمین۔لیکن افسوس ہے ان کی حالت پر جو نماز باقاعدہ نہیں پڑھتے یا عرصہ دراز تک ناغہ کر دیتے ہیں۔ان لوگوں کو طریقت تو حید یہ غور سے پڑھنی چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ نماز باقاعدہ پڑھنے سے ہی انسان پکا مسلمان بنتا ہے اور جو پکا مسلمان ہی نہ ہو وہ لاکھ ذکر کرے مومن کس طرح بن سکتا ہے اور درجہ احسان پر کس طرح فائز ہو سکتا ہے۔نماز نہ پڑھنے والوں میں سے اکثر آدمیوں کے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں۔ان میں وہ لکھتے ہیں کہ ''مجھ کو نماز پڑھنے میں سخت سستی و کاہلی محسوس ہوتی ہے۔اس واسطے ناغہ ہو جاتا ہے۔'' یا یہ کہ ''ڈیوٹی کی وجہ سے نماز نہیں ہو سکتی'' یا یہ کہ ''نماز میں دل نہیں لگتا'' اور ایسی باتیں لکھنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''آپ دعا کریں کہ میں نماز باقاعدہ پڑھا کروں'' میں ان لوگوں کو ہمیشہ یہ جواب دیتا ہوں کہ نماز کے لیے سستی اور کاہلی وغیرہ کا عذر بالکل مسموع نہیں ہو سکتا۔نماز ایک اختیاری شے ہے۔ اختیاری شے کے لیے دعا نہیں کی جاتی۔آپ سستی و کاہلی وغیرہ کے باوجود نماز پڑھیں۔رفتہ رفتہ عادت ہو جائے گی۔آپ باقاعدہ نماز پڑھنے لگیں گے اور دل بھی لگنے لگے گا۔میں ان حضرات سے پھر کہتا ہوں کہ براہ مہربانی مجھ کو ایسی اختیاری باتوں کے لیے دعا کے واسطے نہ لکھا کریں خود کوشش کریں۔دعا البتہ میں کر بھی دیتا ہوں لیکن جس چیز کی آپ کو دل سے رغبت اور خواہش ہی نہ ہو اس چیز کے لیے دوسروں کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔دعا تو ان چیزوں کے لیے قبول ہوتی ہے جن کی آپ کو دل سے خواہش ہو اور وہ باوجود کوشش بسیار میسر نہ آئیں۔

عبادت و اذکار:

روزے کے متعلق جہاں تک مجھے علم ہے تقریباً سبھی رکھتے ہیں سوائے چند آدمیوں کے جو شرعاً معذور رہوں۔زکوٰۃ اور حج کا مجھے علم نہیں کہ ہمارے حلقہ میں کن کن لوگوں پر فرض ہے۔صرف

تین چار آدمی ہیں جو ہر سال زکوٰۃ کا کچھ حصہ فنڈ میں دیتے ہیں۔ حج کی بابت مجھے مطلق علم نہیں کہ کس کس پر فرض ہے۔ بہرحال جن لوگوں پر یہ دونوں چیزیں فرض ہوں ان کو ضرور یہ فرض ادا کرنا چاہیے۔ اس سے خدا ان کے مال و دولت میں بہت برکت دے گا اور آخرت میں سرخرو فرمائے گا۔ جو لوگ یہ فرض ادا نہ کریں گے مرنے کے بعد اللہ ان سے پوچھے گا اور وہ سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے۔

اب رہے **اذکار یعنی پاس انفاس اور نفی اثبات کا ذکر** تو وہ اس قدر آسان ہیں کہ ان کے لیے مطلق وقت درکار ہی نہیں ہوتا۔ پاس انفاس تو آپ دن اور رات میں جس وقت بھی خالی ہوں اسی وقت کر سکتے ہیں، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے۔ بتائیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اب اس سے زیادہ آسان ترکیب تو میں بتا نہیں سکتا۔ رہا نفی اثبات تو میں نے بتایا ہے کہ وہ دس یا زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کرنا کافی ہے۔ اگر آپ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے پندرہ بیس منٹ بھی خرچ نہیں کر سکتے تو پھر یقین کر لیجیے کہ آپ کا سلوک کبھی کامیابی سے طے نہیں ہو سکتا اور آپ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ عجیب بات ہے کہ اگر آپ کو لاہور سے پشاور یا کراچی جانا ہو تو اس کے لیے کتنا اہتمام کرتے ہیں۔ ٹیکسی منگاتے ہیں اس پر سٹیشن جاتے ہیں وہاں ٹکٹ خریدتے ہیں پھر گھنٹوں ریل میں بیٹھے رہتے ہیں تب منزل مقصود پر پہنچتے ہیں۔ مگر خدا تک پہنچنے کے لیے دس پندرہ منٹ بھی خرچ نہیں کر سکتے۔ شرم آنی چاہیے۔

کمزور قوتِ ارادی کا علاج:

بات دراصل یہ ہے کہ سستی و کاہلی اور دل نہ لگنا تو بہانے ہیں ان لوگوں کو خدا کی طلب ہی نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو محض رسماً حلقہ کے خدام کی بے پروائی سے حلقہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جن کو طلب تو ہو لیکن قوت ارادی اس قدر کمزور ہو کہ سستی و کاہلی پر غالب نہ آ سکیں۔ ان لوگوں کو قوت ارادی کے طاقتور بنانے کی ایک ترکیب بتا سکتا ہوں۔ اگر وہ کوشش کریں گے تو کامیابی یقینی ہے۔ ترکیب یہ ہے کہ آپ کسی چھوٹی اور معمولی سی بات کو جس کا کرنا آپ کے لیے بہت ہی آسان ہو اپنے اوپر لازم کر لیں اور وقت مقررہ پر اس کو

ضرور کرلیا کریں ۔جب اس کی عادت ہو جائے تو اس سے کچھ مشکل سی بات کو اسی طرح اپنے اوپر لازم کر کے انجام دیتے رہیں اور یونہی رفتہ رفتہ آسان باتوں سے مشکل باتوں کی طرف بڑھتے اور کرتے رہیں ۔اس طرح ایک دن وہ آئے گا جب مشکل سے مشکل بات بھی آپ کو بالکل آسان معلوم ہوگی اور اس کو سرانجام دینے میں آپ کو ذرا بھی تکلیف یا دقت نہ ہوگی ۔اس بات کو زیادہ واضح اور قابل فہم بنانے کے لیے دو ایک مثالیں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔اس طرح آپ اس ترکیب کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔

مثلاً آپ یہ بات اپنے اوپر لازم کرلیں کہ جب سونے لگیں تو کسی معمولی چیز مثلاً کرسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر کسی خاص جگہ پر رکھ دیا کریں تب سوئیں ۔اب آپ روزانہ کرسی کو اٹھا کر اسی خاص جگہ پر رکھ دیا کریں یہاں تک کہ آپ کو اس کی عادت ہو جائے یعنی بغیر ارادہ کیے عادتاً ایسا کرنے لگیں ۔اس کے بعد آپ اس کام کو چھوڑ کر کوئی ذرا مشکل کام اپنے اوپر لازم کرلیں ۔مثلاً یہ کہ جب تک آپ اپنے کمرے یا صحن میں پورے سو قدم گن کر ٹہل نہ لیں اس وقت تک ہرگز نہ سوئیں ۔جب یہ بھی ہو جائے تو گھڑی دیکھ کر پورے دس یا پندرہ منٹ ٹہلنا یا کچھ پڑھنا لازم کر لیں ۔یہ بھی ہو جائے تو پھر یہ لازم کرلیں کہ روزانہ وضو کر کے سویا کریں ۔یہ بھی ہو جائے تو وضو کے بعد دو نفل پڑھنا بھی لازم کرلیں ۔اس کے بعد دنیا کے کاموں میں سے کوئی مشکل سا کام منتخب کریں اور دو چار سال یونہی کرتے رہیں ۔آخر میں آپ دیکھیں گے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے آپ کی قوت ارادی اتنی طاقتور ہو جائے گی کہ دنیا کا کوئی کام آپ کے لیے مشکل نہ رہے گا ۔مگر شرط یہی ہے کہ آپ دل سے یہ سب کچھ کرنا چاہتے ہوں اپنے آپ کو دھوکا نہ دے رہے ہوں ۔

مجاہدہ،مومن کا گھر جنت کا نمونہ:

ذکر اذکار وغیرہ کا بیان کافی ہو چکا ۔اب **مجاہدہ** کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری ہے ۔تو مجاہدے کی بابت میں نے آپ کو صرف یہ بتایا ہے کہ دو چیزیں چھوڑ دیجیے اور دو اختیار کر لیجیے ۔یعنی غصہ اور نفرت چھوڑ دیجیے اور ان کی جگہ عالمگیر محبت اور صداقت یعنی حق کو اختیار کر لیجیے ۔ان کا مفصل بیان تو آپ نے ''تعمیر ملت'' اور ''طریقت توحیدیہ'' میں پڑھ ہی لیا ہوگا ۔یہاں تو صرف یہ بتانا

ہے کہ ہمارے اہل حلقہ نے ان باتوں پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ چنانچہ میں یہ بات کسی قدر وثوق بلکہ فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں اہل حلقہ کی اکثریت نے کمال کر دکھایا ہے۔ یعنی حلقہ کے بیس پچیس فیصد آدمی ایسے ہیں جنھوں نے غصہ کو بالکل نفی کر دیا ہے یعنی غصہ پر قابو پالیا ہے۔ (دیکھئے تعمیر ملت) ساٹھ ستر فیصد آدمی ایسے ہیں جن کا غصہ بہت ہی کم ہو گیا ہے صرف دس بارہ فیصد آدمی ایسے ہیں جن کا غصہ بالکل کم نہیں ہوا۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو حلقے کی تعلیم پر مطلق عمل نہیں کرتے۔ ان لوگوں سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ لیکن جن کا غصہ کم ہو چکا ہے اور وہ واقعی اس کو نفی کرنا چاہتے ہیں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ غصہ نفی کرنے کی مشق ان کے اپنے گھر میں ہی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غصہ عام طور پر اپنے سے کمزور اور اپنے دست نگر لوگوں ہی پر آتا ہے۔ اپنے سے بڑے اور طاقت ور لوگوں پر تو غصہ صرف انہی کو آ سکتا ہے جو بالکل ہی پاگل ہوں۔ تو آپ کو بھی غصہ اپنی بیویوں اور بچوں پر ہی آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی مرتبہ آپ کو غصہ آئے اتنی ہی مرتبہ آپ کو غصہ کم کرنے کی مشق کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ اس لیے آپ یہ مشق گھر ہی سے شروع کریں اور اپنی بیویوں اور بچوں پر غصہ نہ کیا کریں۔ اگر آپ ان کی اصلاح کے لیے ان پر غصہ کرنا بجا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ <u>اصلاح تو صرف پیار و محبت اور مصلحت و حکمت سے ہی ہو سکتی ہے۔ سختی اور غصہ سے تو کام اور بگڑ جاتا ہے۔</u> دیکھئے مسلمان کے گھر کو نبی کریم ﷺ نے حرم فرمایا ہے۔ حرم میں کیا ہوتا ہے؟ نہ کوئی کسی کو قتل کر سکتا ہے' نہ مار پیٹ کر سکتا ہے' نہ سخت آواز ہی سے بول سکتا ہے۔ تو حرم کہنے سے حضور اکرم ﷺ کا مطلب یہی ہے کہ ایک مسلمان کے گھر میں کامل سکون' اطمینان' مسرت' خوشی اور امن و امان ہونا چاہیے۔ ایسے گھر جنت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ جنت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ یہی فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "جو لوگ جنت میں ہوں گے وہ وہاں کسی طرح کی بکواس نہیں سنیں گے۔" (سورۃ الغاشیہ) سورہ واقعہ میں ہے کہ "وہاں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے نہ گالی گلوچ"۔ سورہ نساء میں ہے کہ "وہ وہاں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے۔ نہ جھوٹ اور خرافات۔" غور کیجیے کہ جہاں بکواس تک بھی نہیں ہوگی وہاں لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ کا بھلا کیا کام۔ ویسے بھی غور کیجیے کہ جس گھر میں مار

پیٹ اور لڑائی جھگڑا رہتا ہو وہاں بچے کیسے اٹھیں گے۔ وہ ڈرے سہمے' چڑچڑے، بد اخلاق' کم حوصلہ یا ایک جملہ میں یوں کہیے کہ شرافت سے بالکل عاری ہوں گے اور بڑے ہو کر بھی ذلیل و حقیر ہی رہیں گے اور اس کی ذمہ داری ماں باپ پر ہوگی۔ بلکہ باپ پر زیادہ ہوگی کیوں کہ باپ عام طور پر تعلیم یافتہ' جہاندیدہ اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں تو بیویوں کی سو فیصدی اصلاح کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر چاہیں کہ مار پیٹ اور لڑائی جھگڑے سے اصلاح کر لیں تو یہ ناممکن ہے۔ مفصل بیان کے لیے تعمیر ملت دیکھیئے۔

کچھ لوگ حلقہ میں ایسے بھی ہیں جو غصہ کے علاوہ بیویوں سے نفرت بھی کرتے ہیں یا ان کو پسند نہیں کرتے۔ یہ بہت ہی ناسمجھ لوگ ہیں۔ نفرت اگر صورت و شکل سے ہے تو یہ بات شادی سے پہلے دیکھنے کی تھی۔ شادی کے بعد اور خصوصاً کئی سال بعد نفرت پیدا ہو جانا عجیب سی بات ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بات خود مردوں کے چلن کی خرابی اور اوباشی کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ نفرت اگر عورت کی عادتوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے تو اس کی بابت میں ابھی بتا چکا ہوں کہ عادتوں کی اصلاح کی زیادہ ذمہ داری مرد پر ہی عائد ہوتی ہے۔ صبر' محبت اور حکمت و مصلحت سے کام لیا جائے تو عورت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا کچھ بھی دشوار نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی حدیث ہے کہ "عورت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے اس کی خلقت ہڈی کی طرح ٹیڑھی ہے۔ اس کو زیادہ نہ دباؤ ورنہ ٹوٹ جائے گی۔" دیکھیئے کتنا حکمت آموز کلام ہے۔ اب اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔ بہر حال اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا گھر جنت کا نمونہ ہو تو اس کے لیے آپ کو خوب محنت کرنی پڑے گی۔ صرف سوچتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کو صبر کرنا ہوگا۔ خود اپنی بری عادتیں بدلنی پڑیں گی' غصہ کو نفی کرنا ہوگا اور یہ جو کچھ بھی آپ کریں گے اس سے خود آپ ہی کو فائدہ ہوگا۔ دماغ و دل کو راحت ملے گی۔ اطمینان قلب حاصل ہوگا جس کی وجہ سے آپ کے دنیوی کام آسان ہو جائیں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ غصہ اور نفرت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا میرے خیال میں ایک طالب صادق کے لیے کافی زیادہ ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی اصلاح کرنا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے اگر اس

سے ہزار گنا زیادہ بھی لکھا جائے تو بھی فضول ہے۔

عالمگیر محبت اور صداقت:

اب ایک نظر اس بات پر بھی ڈالنی چاہیے کہ اہل حلقہ نے عالمگیر محبت اور صداقت وحق کو اختیار کرنے میں کیا کچھ کیا ہے تو جہاں تک محبت کا سوال ہے میں کافی مطمئن ہوں لیکن اختیار حق کے معاملہ میں ہمارے حلقہ کی اکثریت ابھی بہت پیچھے ہے۔اس میں ترقی کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔"طریقت تو حیدیہ" میں میں نے لکھا ہے کہ جہاں محبت اور حق کا مقابلہ آن پڑے تو محبت کو قربان کر دو اور حق پر ڈٹ جاؤ خواہ اس میں کیسی ہی تکلیف اٹھانی پڑے۔محبت ایک میٹھی چیز ہے اور اس کے اختیار کرنے میں مزہ ہی مزہ ہے۔لیکن "حق" کڑوا ہوتا ہے اور اس کو اختیار کرنا مشکل ہے۔تاہم محبت کے مقابلہ میں اگر حق کو اختیار نہ کیا جائے تو یہ نظام عالم دو دن میں تباہ ہو جائے۔اس لیے آپ کو حق پر چلنے اور قائم رہنے کی بھی سخت کوشش کرنی چاہیے۔لیکن اس میں آپ کو اس بات کا بہت خیال رکھنا چاہیے کہ آپ حق پر ہیں بھی یا نہیں۔اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ ایک بات کو حق سمجھتے ہیں حالانکہ وہ حق نہیں ہوتی اور آپ غلطی کر بیٹھتے ہیں۔مثلاً آپ کا افسر یا شیخ حلقہ آپ کو حکم دیتا ہے جو آپ کو ناجائز معلوم ہوتا ہے'اس وقت آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہیے۔ایسے وقت پر آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ انسان جب کسی ادارے میں داخل ہوتا ہے تو قدرتاً یا حقیقتاً وہ یہ عہد کرتا ہے کہ اس ادارے کے تمام قوانین وقواعد پر عمل کرے گا (سوائے ان لوگوں کے جو شامل ہی جاسوسی اور بغاوت پھیلانے کے لیے ہوئے ہوں) اس طرح وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے کہ اپنے سربراہوں کا ہر حکم مانے گا۔پس جب کبھی متذکرہ بالا قسم کی الجھن پیش آئے تو اس کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ اس کے لیے "حق" یہ ہے کہ اپنے سربراہوں کا حکم مانے۔یہ حکم غلط ہے یا صحیح'اس کی ذمہ داری اس پر نہیں بلکہ اس کے سربراہوں اور حکم دینے والوں پر ہے۔ دراصل یہ فلسفہ اخلاق کا ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔اس چھوٹے سے خطبہ میں اس پر سیر حاصل بحث ناممکن ہے۔اس لیے جس کسی بھائی کو شوق ہو مجھ سے زبانی گفتگو کر کے سمجھ سکتا ہے۔
میرا خیال ہے کہ حلقہ کی تنظیم وتعلیم پر کافی تبصرہ ہو گیا۔جو لوگ واقعی کچھ کرنا اور فائدہ اٹھانا

چاہتے ہیں ان کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک بات اور بتانی ہے اور وہ یہ کہ جس کسی نے غصہ جیسے دیو کو زیر کرلیا تو اس کی قوت ارادی اتنی طاقتور ہو جاتی ہے کہ وہ باقی برائیوں کو بھی دور کرسکتا ہے۔ اس لیے ہر طالب صادق کا فرض ہے کہ وہ خود اپنی خامیوں اور برائیوں پر نظر رکھے اور قوت ارادی کی مدد سے ان کو دور کرے۔ ان شاء اللہ وہ منزل مقصود پر بخیر وخوبی پہنچ جائے گا۔

آیئے اب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ اور توسل سے ہمارے حلقہ کے ہر آدمی کو صراط المستقیم پر قائم رکھے۔ دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے سرفراز کرے اور اپنا قرب و دیدار عطا فرمائے۔ ہم سے خلق خدا کی خدمت وہدایت کا کام لے اور ہمارا انجام بخیر کرے۔ آمین یا رب العالمین

بندہ ناچیز

عبدالحکیم انصاری

لاہور، 7 اپریل 1967ء

خطبہ......7

13-4-1968

کو دسویں سالانہ اجتماع پر بمقام لاہور ارشاد فرمایا

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ............السلام علیکم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو پورے ایک سال بعد پھر ایک جگہ اکٹھا ہونے کی توفیق عطا فرمائی اور ایک سال تک زندہ رکھا' صحت دی اور ایک ایسے اجتماع میں شریک ہونے کے قابل کیا جس کی نظیر شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہے۔ آپ نے مذہبی' سیاسی' معاشرتی اور شادی بیاہ کے کئی اجتماعات میں شرکت کی ہوگی اس لیے آپ اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ جو لطف و سرور اس مبارک اجتماع میں آتا ہے اور جو سوز و ساز اور کیف و گداز یہاں ملتا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دنیوی محفل میں نہیں ملتا۔ ایسا پاک ماحول کہاں میسر ہوتا ہے جہاں آنکھیں ہر طرح کی زشت و بدروئی کی طرف سے بے بصر' صرف حسن و خوبی کے جلوے دیکھتی ہیں۔ جہاں کان ہر قسم کی لغو بیانی اور بدکلامی کی طرف سے بند' صرف نغمات لاہوتی اور اصوات سرمدی سنتے ہیں۔ جہاں زبانیں ہر نوع کی بدگوئی اور غیبت و بہتان طرازی کی طرف سے گنگ' صرف حمد و ثناء کے ترانے گاتی ہیں۔ جہاں دل و دماغ ہر برے خیال اور عناد و فساد کے تمام ناپاک جذبات سے یکسر خالی' شراب عشق و محبت کے نشہ میں چور دیدار یار کی تمنا میں دنیا و مافیہا سے بالکل غافل و سرمست ہیں۔

الغرض! اس اجتماع میں ہر طرف خلوص ہی خلوص اور محبت ہی محبت ہے۔ پھر ایسے اجتماع میں شرکت کی توفیق عطا کرنے والے رحیم و کریم آقا کا شکر ہم کیوں نہ ادا کریں۔ حق تو یہ ہے کہ جتنا بھی شکر ادا کیا جائے اور جتنی بھی حمد و ثنا کی جائے کم ہے۔

خدائے قادر و قیوم کے شکر کے بعد میں اپنی اور تمام حلقہ توحیدیہ کی طرف سے عزیزم میاں محمد علی صاحب زاد اللہ عمرہٗ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی پر خلوص محبت اور ایثار کی وجہ سے ہمارا یہ اجتماع اس دفعہ پھر لاہور میں ہی ہو رہا ہے۔ حسب سابق اس مرتبہ بھی اجتماع کا سارا بار میاں محمد علی صاحب نے خود ہی اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو دین اور دنیا کی ہر نعمت لازوال سے مالا مال

فرمائے۔آمین۔اجتماع کے انتظام اور اہتمام میں خصوصاً محمد قاسم صاحب اور چوہدری جلال الدین صاحب اوران کے رفقائے کار نے اپنے مہمان بھائیوں کو آرام پہنچانے کے لیے جس خلوص ومحبت سے تکلیفیں اٹھائی ہیں،میں ان سب کاشکریہ ادا کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ان سب کواس کا اجرِعظیم عطافرمائے۔آمین۔آخر میں ان تمام دوستوں اور مہمانوں کا بھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور خلوص دلی کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہوں جو دوردراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے محض اللہ اوراس کے پیارے حبیب ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔خدائے بزرگ وبرتر آپ سب کواپنے اپنے مقاصد دلی میں کامیاب اور بامراد فرمائے اور دین ودنیا میں آپ سب کو مراتب اعلیٰ عطافرمائے۔اپنی اور اپنے محبوب ﷺ کی محبت کے نور سے آپ کے قلوب کو جگمگا دے اور ان لوگوں پر بھی جو بوجہ مجبوری شریک نہیں ہو سکے اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے۔آمین

برادران حلقہ!آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں خوشی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ہمارا حلقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور میں مجبور ہوں کہ اس خوشی کے موقع پر کچھ غم کی خبریں بھی آپ کو سناؤں۔

پہلی خبر تو یہ ہے کہ ابھی چند دن پیشتر ہمارے ایک نہایت پرہیزگار اور مجسمہ اخلاق وکردار عزیز ترین دوست اور ''گلزار چشت'' کے سدا بہار مہکتے ہوئے پھول جناب سید حامی الدین صاحب ہمیں داغ مفارقت دے کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔مرحوم نے اپنے پیچھے ایک مجموعہ اوصاف وفاشعار بیوہ اور پانچ کم سن بچے چھوڑے ہیں۔اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خود ان سب کی دستگیری وسرپرستی فرمائے اور مرحوم کو اپنا قرب عطا کرے۔آمین۔دوسری اندوہناک خبر یہ ہے کہ ہمارے بنوں کے حلقہ کے جواں سال اور باغ وبہار شخصیت کے مالک جناب محمد نواز بھٹی نے بھی اسی سال اپنے پیچھے متعدد لواحقین کو چھوڑتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔تیسری خبر کراچی کے معمر بزرگ جناب قمرالدین صاحب کے وصال کی ہے اور چوتھا زخم جو احباب حلقہ کے جگر گوشوں کی جدائی کی صورت میں موت کے ظالم پنجہ نے لگایا ہے ان میں سرفہرست جناب اصغر مرزا صاحب کے چودہ سالہ لخت جگر اور جناب حافظ اللہ بخش و ڈاکٹر عبدالصمد غزنوی کے گلستانوں کی

پہلی کلیاں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ جناب خادم حسین صاحب کے حقیقی بھائی' فلائٹ سارجنٹ رشید صاحب کے والد' جناب خضر حیات صاحب کے والد' مولوی محمد یعقوب صاحب کی والدہ' عبدالحق صاحب کی بیگم' جناب عبدالستار خان صاحب کے دو چچا زاد بھائی اور ایک بہن۔ محمد یونس بٹ صاحب کا بھانجا اور جناب آفتاب احمد خان صاحب کے ماموں اور کئی بھائیوں کے قریبی رشتہ دار بھی اسی سال اللہ کو پیارے ہوئے۔ میں اپنی اور تمام اہل حلقہ کی طرف سے ان سب کی وفات پر اظہار تعزیت وہمدردی کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین!!

آیئے! ہم سب ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

سلسلہ توحیدیہ کی تعلیم کے اہم نکات

برادران سلسلہ! علم تصوف کے طالب علم عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ ان کو اس قدر زیادہ پڑھنے اور کرنے کو بتایا جاتا ہے کہ جس کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ پیٹ بھرنے کے لیے دنیوی کام کریں یا آخرت سنوارنے کے لیے اللہ اللہ۔ میں نے جب دائرہ تصوف میں قدم رکھا اور سلوک شروع کیا تو میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ حضرت صاحبؒ نے مجھے پانچ ہزار مرتبہ پاس انفاس اور لاتناہی نفی اثبات کرنے کو بتایا۔ اس کے علاوہ تہجد' دوسرے نوافل اور درود شریف کا ورد علیحدہ تھا۔ میں رات بھر جاگتا تھا مگر اوراد پورے نہ ہو سکتے تھے تو مجبوراً دن میں پورا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو مرتبہ امتحان میں فیل ہوا۔ ملازمت کے دوران اس سے بھی زیادہ دشواری پیش آئی۔ بہر حال سلوک طے کرنے تک مجھ کو یہ تجربہ ہو گیا کہ <u>خدا سے تعلق زبان سے ذکر کرنے کی کثرت پر اس قدر منحصر نہیں ہے جس قدر دل سے اس کو ہر وقت یاد رکھنے اور اخلاق کا تزکیہ کرنے پر منحصر ہے</u>۔ چنانچہ جب میں نے سلسلہ توحیدیہ کی بنیاد ڈالی تو ذکر' فکر اور تزکیہ اخلاق کے لیے مجاہدے کے تمام طریقوں میں ایسی تبدیلیاں کر دیں جو زمانہ حاضرہ کے مزاج اور آج کل کے

انگریزی تعلیم و تربیت یافتہ لوگوں کے لیے موزوں اور آسان ترین ہیں اور ہر شخص جو طالب راہ حق ہو نہایت آسانی سے دنیا کے سارے کام کرتے ہوئے ان پر عمل کر کے فائز المرام ہو سکتا ہے۔ یہ باتیں میں پہلے بھی بہت دفعہ بتا چکا ہوں لیکن آج ذرا وضاحت سے بیان کروں گا۔

1.....مختصر ترین اوراد و اذکار:

پہلے سلسلوں میں اوراد و وظائف ہزاروں بار نہیں بلکہ لاکھوں بار پڑھنے کو بتائے جاتے تھے۔ چنانچہ بعض بزرگ سورہ اخلاص سوا لاکھ مرتبہ بیس یا چالیس دن میں ختم کرایا کرتے تھے۔ کم از کم ایک ہزار مرتبہ درود شریف روزانہ ہر نماز کے بعد اکتالیس مرتبہ الحمد شریف گیارہ سو مرتبہ یا مغنی گیارہ مرتبہ سورہ مزمل شریف اکتالیس مرتبہ سورہ یاسین شریف اور اس کے علاوہ بے شمار نوافل۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ جو شخص اتنا پڑھے اور پھر کھانا نہ کھائے متواتر روزے رکھے اس کی صحت کس طرح بحال رہ سکتی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ نعوذ باللہ یہ باتیں فضول تھیں مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ آج کل جب کہ حصول معاش کے لیے دن رات میں کم از کم بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے پرانے زمانے کے اوراد و وظائف پڑھنا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اس لیے میں نے صرف یہ طریقہ بتایا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں جب بھی تم کوئی دماغی کام نہ کر رہے ہو اور خالی الذہن ہو ہر سانس سے **اللہ اللہ کرتے رہو** اور اللہ کی یاد سے غفلت نہ برتو۔ یہی طریقہ قرآن پاک میں بھی بتایا گیا ہے۔ دوسری چیز **نفی اثبات** کا ذکر ہے جس کے لیے میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ کسی حالت میں بھی پندرہ منٹ سے زیادہ نہ کیا جائے۔ اب آپ بتائیں کہ اس سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے اور اس سے اپنی محبت کے رشتے استوار کرنے کا اور کوئی آسان طریقہ ممکن ہے؟

2.....مجاہدہ:

پہلے زمانے کے بزرگ اپنے مریدوں کو نفس کشی کے لیے بھوکا رہنا برسوں پیدل سفر کرنا بھیک مانگنا پاخانہ صاف کرنا اور محلوں میں جھاڑو دینا بتاتے تھے۔ آج کے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کو یہ کچھ بتایا جائے تو کون ہے جو کرنے کو تیار ہو گا۔ اس کے بجائے میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ **غصہ اور نفرت کو نفی کر دو** اور اس کی جگہ **عالمگیر محبت** اور ہر کام میں حق پر عمل کو اپنے اوپر فرض کر

لو۔اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔تعمیر ملت اور طریقت توحیدیہ میں پڑھ لیجیے۔

3......انکساری'خودداری کے ساتھ:

دوسرے سلسلوں میں انکسار پیدا کرنے کے لیے یہ بتایا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تمام مخلوق سے ذلیل وحقیر سمجھو۔ظاہر ہے کہ اس سے انسان کی خودی اور خودداری بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اس کی وہ تمام امنگیں مر جاتی ہیں جو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ایک معاشرے اور قوم کو زندہ'باعزت' باغیرت اور متحرک بالعمل بنانے کے لیے قدرت کی طرف سے فطرتاً پیدا کی گئی ہیں۔ہمارے سلسلہ میں یہ تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ یہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنی کسی چیز پر غرور نہ کرو کیوں کہ اس سے آئندہ کے لیے طلب ختم ہو جاتی ہے۔بلکہ ہم یہ بتاتے ہیں کہ تم نہ اپنے آپ کو ذلیل وحقیر سمجھو نہ کسی دوسرے کو ٔہم سب خدا کی مصنوعات ہیں۔خدا کی کسی صنعت سے نفرت کرنا یا اس کو ذلیل سمجھنا خود خدا کی توہین ہے۔ہم دراصل یہ کہتے ہیں کہ تم اس قصہ میں ہی نہ پڑو کہ کون ذلیل ہے اور کون بزرگ و برتر ہے اور اگر تم کو ایسا کرنا ہی پڑے تو قرآن کی اس آیت کی کسوٹی پر پرکھو کہ

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ (الحجرات:13)

"جو شخص جس قدر زیادہ متقی ہے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک شریف اور بزرگ ہے۔"

4......قبر پرستی اور پیر پرستی سے اجتناب:

دوسرے کئی سلسلوں میں پیروں کی اس قدر عزت کی جاتی ہے جو عبادت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔مریدوں سے نہ صرف زندہ پیروں بلکہ وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں کو سجدے کرائے جاتے ہیں۔ان کو مافوق الفطرت خیال کیا جاتا ہے۔ان سے منتیں مانگی جاتی ہیں اور کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ہم قرآن پاک اور احادیث وسنت کی روشنی میں اس بات کو شرک اکبر جانتے ہیں۔تعمیر ملت میں بیسیوں آیتیں اس بات کے ثبوت میں میں نے تحریر کر دی ہیں جس کو ہر وقت پیش نظر رکھتے ہوئے توحید باری تعالیٰ کے عقیدے پر پورے استحکام سے ڈٹے رہیے۔تاہم میں آپ کو یہ ہدایت کرتا ہوں کہ جو لوگ قبر پرستی وغیرہ کرتے ہیں ان سے الجھنے یا بحث کرنے کی آپ کو ہرگز اجازت نہیں

ہے ۔ان کا دین ان کے لیے ہے اور تمہارا دین تمہارے لیے ۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا کہ یہ لوگ جن باتوں پر جھگڑتے ہیں قیامت کے دن ان کو معلوم ہو جائے گا کہ سچا کون تھا ۔دوسری بات یہ کہ جھگڑنے اور بحث کرنے سے سوائے وقت ضائع کرنے اور دلوں میں بدمزگی پیدا کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ بحث سے کوئی شخص بھی اپنا عقیدہ نہیں بدلا کرتا ۔حتی کہ کافر بھی باوجود عقلاً مان لینے کے بت پرستی ترک نہیں کرتے ۔ ہمارے سلسلہ میں پیر کی بابت صرف تین باتیں بتائی جاتی ہیں:

ا۔عقیدت

۲۔ادب

۳۔فرمانبرداری

عقیدت کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے مرشد کو سچا' خدا رسیدہ اور رشد و ہدایت کا اہل سمجھتے ہو۔ ادب عقیدت کا ایک لازمی جزو اور انسانی شرافت کی ایک ضروری نشانی ہے۔ "با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب'' کا مقولہ غلط نہیں ہے ۔ دنیاوی محفلوں میں بھی بے ادب انسان دوسرے لوگوں کے دل میں اپنے متعلق کوئی اچھی رائے پیدا نہیں کرسکتا تو بزرگوں کی مجلس میں وہ لوگوں کے دلوں میں اپنا کوئی اچھا مقام کیسے پیدا کرسکتا ہے ۔فرمانبرداری اس لیے ضروری ہے کہ جس راستہ پر تم چل رہے تم اس سے قطعاً ناواقف ہو۔لیکن تمہارا مرشد جو اس راستہ کو طے کر چکا ہے اس کے تمام پیچ وخم سے خوب واقف ہے ۔اگر تم اس کے کہنے کے مطابق اندھوں کی طرح عمل نہ کرو گے تو یقیناً کسی کھڈ میں گر کر تباہ و برباد ہو جاؤ گے ۔ ہمارے حلقہ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن کو خدا نے نور بصیرت عطا فرمایا ہے وہ دیکھ سکتے ہیں۔

5......دنیا وروحانیت میں بلند مرتبے کے حصول کی تعلیم :

ہمارے سلسلہ میں رہبانیت اور دنیا سے نفرت وحقارت کی تعلیم مطلق نہیں دی جاتی کیوں کہ یہ قرآن پاک کی تعلیم اور حضور ﷺ کی سنت کے بالکل خلاف ہے بلکہ روپیہ کمانے اور دنیوی قدر و منزلت اور عزت و مرتبہ حاصل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اس طرح جس سے غرور بالکل

پیدا نہیں ہوسکتا اور یہ جو کچھ بھی کمایا اور پیدا کیا جاتا ہے وہ سب قوم، ملک اور خلق خدا کی خدمت کے لیے ہوتا ہے۔

6......آخری مقصد:

دوسرے سلسلوں کی معراج اور آخری منزل کشف و کرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلے میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

7...... ہر وقت عمل:

ہمارے سلسلہ میں سستی اور بے کاری سے بچنے کے لیے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی عمل میں مصروف رہو اور کچھ نہ کر سکو تو تعلیم میں ترقی کرو اور ایم اے تک امتحانات پاس کرتے چلے جاؤ۔ یا کوئی ٹیکنیکل کام اور ہنر سیکھو۔ چنانچہ اس وقت ہمارے بھائیوں میں کم از کم ڈیڑھ سو آدمی ایسے ہیں، جنہوں نے بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی وغیرہ کے امتحانات پاس کیے ہیں اور آج ہزاروں روپیہ مہینہ کما رہے ہیں۔

8...... جماعتی تنظیم اور سلسلے سے محبت:

ہمارے سلسلہ میں جماعتی تنظیم اور اجتماعی زندگی باقی سب جماعتوں سے کہیں زیادہ محکم اور مستحکم ہے۔ ہمارے ہاں وہ دقیانوسی طریقہ ختم کر دیا گیا ہے کہ ایک شیخ لاتعداد خلیفہ بنا کر اپنے حلقہ کو وسیع کر لے اس طرح اس پیر کی جماعت لاتعداد ٹکڑیوں میں بٹ جاتی ہے اور چونکہ ان خلفاء کے ماحول، اخلاق، ذہنیت اور علمیت وغیرہ میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے اس لیے شیخ سلسلہ کی حقیقی تعلیم بجنسہ کسی ٹکڑی میں بھی باقی نہیں رہتی اور ان ٹکڑیوں کا باہمی ربط ختم ہو کر جماعت کی روح فنا ہو جاتی ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی شخص خواہ کتنی اچھی جماعت بنائے اور وہ خواہ کتنا ہی عالم و فاضل اور خدا رسیدہ ہو ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری بھی صحت اب جواب دے رہی ہے۔ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے کل حاضر ہونا پڑ جائے یا کچھ اور برس لگ جائیں۔ اس لیے میں

آپ سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر آپ کی رائے میں ہماری جماعت اور ہمارا حلقہ انسانی اصلاح کے لیے ایک مثالی حلقہ ہے اور معاشرے کی اصلاح میں کوئی خاص کردار ادا کرسکتا ہے تو آپ اب میری بجائے جماعت سے محبت کرنا اور جماعت کو زیادہ سے زیادہ عزیز رکھنا سیکھیں۔ اس کے لیے آپس میں بے انتہا محبت اور زیادہ سے زیادہ ایثار کی ضرورت ہوگی۔ اگر آپ نے ان دو باتوں پر عمل کیا تو ان شاء اللہ آپ کا حلقہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گا اور عام مسلمانوں کے اخلاق کو سدھارنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دے گا۔

محبان عزیز! آپ کو معلوم ہے کہ میں گزشتہ ماہ نومبر سے ہائی بلڈ پریشر اور دیگر بے شمار عوارض کی وجہ سے مسلسل علیل چلا آ رہا ہوں اور اس طویل علالت کے باعث نقاہت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ذرا سا بھی پڑھنے، لکھنے یا بولنے چالنے سے دماغ چکرانے لگتا ہے اور سانس پھول جاتا ہے۔ لہٰذا آج کی صحبت میں مجھے آپ سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ خلوص و محبت کے ساتھ حلقہ کی تعلیم پر پوری پابندی سے عمل کرتے ہوئے پہلے کی نسبت اور زیادہ شوق اور جوش سے عمل کرو، عمل کرو اور عمل کرتے رہو۔ اپنی اور دوسرے مسلمانوں کی اصلاح کرو۔ دنیوی ترقی کے لیے نئی نئی راہیں نکالو اور ان پر عمل کرو۔ خلق خدا کی خدمت کرو۔ سب کے ساتھ محبت سے پیش آؤ۔ کتنی ہی تکلیفیں اور مصیبتیں آن پڑیں مایوس اور اداس مت ہو۔ ہمت نہ ہارو، ہمیشہ خوش رہا کرو۔ دل میں اللہ کو بسائے رکھو اور ہاتھ پاؤں، آنکھوں، کانوں اور زبان کو خدمت خلق میں لگائے رکھو۔ یہی دائمی مسرت اور حقیقی زندگی کا راز ہے۔ مرتے دم تک کام کرتے رہو اور خدا کی یاد میں مر جاؤ۔ تمہیں کیا خبر یہ کتنا بڑا کام ہے اور مرنے کے بعد اس کا کیا انعام ملے گا۔

اب میں آپ سے صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج تک آپ کو جو کچھ بتایا جا چکا ہے وہ سب قرآن اور احادیث رسول کریم ﷺ سے ہے۔ میری اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کا ایمان کامل ہے تو آپ ان باتوں کو افسانہ یا کہانی نہ سمجھیں گے بلکہ ایک ٹھوس حقیقت جان کر ان پر عمل کریں گے بشرطیکہ آپ اپنی بہبودی اور بہتری کے دل سے طالب ہوں اور دین و دنیا کی نعمتوں سے اپنی جھولیاں بھرنا چاہتے ہوں۔ اگر آپ ان پر ایمان کامل رکھتے ہوئے بھی عمل نہ

کریں تو پھر آپ سے زیادہ بدقسمت اور کون ہو سکتا ہے۔

اب آخر میں ایک نہایت ضروری بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی بیماری کے پیش نظر اور حلقہ توحیدیہ کے استحکام اور بہبود کے خیال سے ابھی سے اپنا ایک خلیفہ اور جانشین مقرر کر دیا ہے۔ صاحب موصوف جن کی تقرری کا اعلان اسی مجلس میں کیا جائے گا وہ روحانی مراتب اور اخلاقی بزرگی میں مجھ سے کسی طرح کم نہیں۔ اس لیے میں آپ سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر آپ کو میری دی ہوئی تعلیم سے محبت ہے تو آپ سب کو میرے اس حکم کی تعمیل میں آج ہی کے جلسہ میں صاحب موصوف کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرنا ہو گی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ نہ صرف میری زندگی میں بلکہ میرے مرنے کے بعد بھی پوری خوشی اور خلوص کے ساتھ حلقہ کو مستحکم سے مستحکم تر بنانے میں صاحب موصوف کے ساتھ پورا پورا تعاون فرمائیں گے۔ جزاک اللہ

آیئے اب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا کے مسلمانوں پر رحم کرے' تمام ممالک اسلامیہ کو آپس میں اتحاد و اتفاق عطا فرمائے اور کفار و مشرکین کا مقابلہ کرنے کی زیادہ طاقت دے کر ان پر فتح کامل عطا فرمائے۔ ہمارے وطن عزیز پاکستان کو داخلی و خارجی استحکام' بقاء' سلامتی' امن اور خوشحالی بخشے۔ اللہ تعالیٰ حلقہ توحیدیہ کے تمام بھائیوں کو دین و دنیا کی دولتوں سے مالا مال کرے۔ اپنی راہ پر مزید خلوص اور جوش سے چلنے کی توفیق دے۔ اپنی اور اپنے محبوب ﷺ کی محبت کے نور سے ہمارے قلوب کو جگمگا دے۔ ہمیشہ صراط المستقیم پر قائم رکھے اور اپنے پیارے رسول ﷺ کے صدقے میں یہ ہمت دے کہ ہم اپنی جان' اپنی روح اور اپنے جسم کا ایک ایک ذرہ اپنی ملکیت کا ایک ایک پیسہ اور اپنے خون کا ایک ایک قطرہ امت محمدیہ کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے نچھاور کر دیں۔ آمین یا رب العالمین

بندہ ناچیز

خادم الخدام حلقہ توحیدیہ

عبدالحکیم انصاری

لاہور، 13 اپریل 1968ء

خطبہ......8

6-4-1972

کو گیارہویں سالانہ اجتماع پر بمقام ملتان ارشاد فرمایا

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ..........السلام علیکم

اس خدائے رحیم وکریم کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے چار سال کی طویل مدت کے بعد ہم سب بھائیوں کو پھر ایک جگہ اکٹھا ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔اس چار سال کے عرصہ میں پہلے دو سال تو میری شدید علالت میں گزرے اور بعد کے دو سال میں ملکی حالات کی وجہ سے سالانہ اجتماع ممکن نہ ہوا۔اس سال بھی باوجود ہماری خواہش کے اجتماع ناممکن سا نظر آتا تھا۔لاہور میں بہت کوشش کی کہ کوئی موزوں جگہ مل جائے لیکن قطعاً مایوسی ہوئی۔اس لیے مجبوراً فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ اس سال بھی اجتماع ملتوی کردیا جائے چنانچہ ہم نے یہی فیصلہ کرکے سب بھائیوں کو مطلع کردیا۔لیکن اس کے دو تین دن بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ہماری مایوسی اور دل شکستگی پر رحمت باری تعالیٰ کو رحم آیا اور اس نے ایسا انتظام فرمایا جو ہمارے وہم وگمان اور خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔واقعی اللہ تبارک وتعالیٰ جو ہر بگڑی کو بنا اور ہر گرے ہوئے کو اٹھا سکتا ہے اس کے لیے یہ کچھ مشکل کام نہ تھا کہ ہمارے احباب حلقہ کی ٹوٹی ہوئی امیدوں کو ہرا ابھرا کردے۔ہوا یوں کہ میں اسی زمانہ میں تین دن کے لیے ملتان آیا ہوا تھا' ایک مجلس میں ایک بھائی نے مجھے پوچھا کہ سالانہ اجتماع کی کون سی تاریخیں مقرر کی ہیں اس پر میں نے نہایت افسردہ دلی کے ساتھ جواب دیا کہ اجتماع تو ہم نے اس سال بھی ملتوی کردیا ہے۔اس بھائی نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا کہ لاہور میں جگہ کا بندوبست نہ ہو سکا' مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔اتفاق سے ہمارے نوآمدہ بھائی ملک کریم بخش صاحب نے جو اسی مجلس میں تشریف رکھتے تھے مجھ سے کہا کہ اگر لاہور میں بندوبست نہ ہو سکا تو آپ ملتان میں کرلیجیے یہاں فی الفور ہر قسم کا انتظام بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے۔بات نہایت معقول اور حلقہ کے ہر بھائی کی خواہش کے عین مطابق تھی لہٰذا ہم نے شکریہ کے ساتھ ملک صاحب کی دعوت قبول کرلی۔بعد میں لاہور جاکر میں نے اجتماع کی تاریخوں سے ملک صاحب کو مطلع کردیا اور قاسم صاحب سے کہہ دیا کہ فوراً دعوتی کارڈ چھپوا کر احباب کو بھیج دیئے جائیں۔تو برادران عزیز اس طرح ہم آج

اس وقت یہاں ملتان میں شریک اجتماع ہیں اور اجتماع کی گوناں گوں برکتوں سے فیض یاب اور لطف اندوز ہو رہے ہیں ۔اور چونکہ یہ سب کچھ ملک کریم بخش صاحب کی وجہ سے ہے اس لیے میں خود اور سارے حلقہ توحیدیہ کی طرف سے ملک صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ملک صاحب پر دین و دنیا کی تمام نعمتوں کی تکمیل فرمائے اور ان کو خدمت دین مبین کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا کرے۔آمین

ان چار سال کی مدت مدید میں ہمارے احباب حلقہ کے بہت سے رشتہ دار اور عزیز اللہ کو پیارے ہوئے۔افسوس ہے کہ میرے پاس ان کی کوئی فہرست موجود نہیں' نہ مجھے زبانی کچھ یاد ہے اس لیے میں اپنے ان احباب سے دلی ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان مرنے والوں کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔آمین

اسی ضمن میں مجھے ایک بہت ہی الم ناک اور روح فرسا واقعہ کا ذکر بھی کرنا ہے۔آپ سب لوگ وارنٹ آفیسر جناب محمد علی صاحب سے بہت اچھی طرح واقف ہوں گے۔یہ حلقہ کے غریب بھائیوں کی ہر ممکن مدد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔کئی سال امریکہ میں رہنے کے بعد واپس آئے اور پنشن پر ریٹائر ہو کر اپنے گاؤں میں مقیم ہو گئے تھے۔اب پھر امریکہ واپس جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ گوجرانوالہ کے قریب ان کی کار ایک جان لیوا ٹرک سے ٹکرا گئی اور وہ مع اپنی اہلیہ اور ایک رشتہ دار کے جاں بحق ہو گئے ۔مرحوم نے اپنے پیچھے تین چار معصوم بچے چھوڑے ہیں جن کا حافظ و ناصر خود خدائے رحیم و کریم ہے ان کی مرگ ناگہانی کی خبر سے مجھے جو صدمہ ہوا خدائے علیم وخبیر ہی بہتر جانتا ہے۔اس وقت تک میں اس احساس الم پر غالب نہیں آسکا ہوں مگر رنج والم سے کیا بنتا ہے یہ قدرت کے کام ہیں جہاں انسان بالکل بے بس اور مجبور ہے اس لیے آیئے! ہم سب ان کے اور ان کی اہلیہ اور مرحوم رشتہ دار کی مغفرت کے لیے دعا کریں اور آئندہ بھی محمد علی صاحب مرحوم جب یاد آئیں تو ان کے لیے ایصال ثواب کر دیا کریں۔

المیہ مشرقی پاکستان اور اس کی وجوہات:

ایک المیہ تو یہ تھا دوسرا المیہ اس سے بھی کہیں زیادہ جان گداز و جاں گسل ہے۔میرا اشارہ

مشرقی پاکستان کی طرف ہے یہ کوئی المیہ نہ تھا بلکہ واقعی قیامت تھی جس نے مشرقی پاکستان کے حالات کویکسر بدل دیا۔اس قیامت سے پہلے یہ خطہ زمین ایک اسلامی ملک تھااب یہ ایک لادین اور دشمن اسلام خطہ ہے اس سے پہلے یہاں زندگی کا ہر شعبہ مسلمان سربراہوں کے ہاتھ میں تھا آج ہر کام' ہر جگہ اور ہر شعبہ پر کفار غالب ہیں' اس سے پہلے وہاں اسلامی حکومت تھی' جو بنگالیوں کی غالب اکثریت کو پسند نہ تھی۔آج بھی کہنے کو حکومت بظاہر مسلمانوں کے قبضہ میں ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک کٹھ پتلی حکومت ہے جس کی ڈوری دہلی کی ایک جادوگرنی کے ہاتھ میں ہے۔یہ کوئی سانحہ نہ تھا نہ یہ کوئی حادثہ تھا یہ تو قیامت تھی' واقعی قیامت' کبریٰ نہ سہی صغریٰ سہی۔قدرت کا غیض و غضب دہاڑتا' چنگھاڑتا ہوا سائیکلون کی شکل میں خلیج بنگال سے اٹھا اور دیکھتے دیکھتے مشرقی پاکستان کے جنوبی قطعات پر ٹوٹ پڑا۔آٹھ دس دن وہ تباہی و بربادی رہی کہ الحفیظ والامان۔بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے بالکل غرق ہو گئے اور وہاں زندگی کا نام ونشان نہ رہا۔ساحلی قصبات اور شہروں میں مدتوں تک نظم ونسق بحال نہ ہو سکا۔لاکھوں ڈوب کر مرے' لاکھوں بھوک سے مر گئے۔سرکاری اندازے کے مطابق دس لاکھ انسان کام آئے۔مال اور دولت کا جو نقصان ہوا وہ الگ۔ابھی اس قیامت صغریٰ کے عواقب ختم نہ ہونے پائے تھے کہ بنگالیوں نے بہاریوں' پنجابیوں اور غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔یہ قیامت پہلی قیامت سے کچھ زیادہ ہی تھی۔اُس قیامت میں عورتوں کی عصمت دری تو نہ ہوئی تھی' ان کی چھاتیاں تو نہ کاٹی گئی تھیں' والدین کے سامنے ان کی بیٹیوں' بہنوں اور بیویوں کی عصمت تو نہ لوٹی گئی تھی مگر اس دفعہ تو یہ سب کچھ ہوا۔کوئی روکنے والا نہ تھا' شہ دینے والے ہزاروں تھے۔سارے صوبے میں لاقانونیت پھیل گئی' بینک لوٹے گئے' فیکٹریاں تباہ کی گئیں' مال واسباب سے بھری ہوئی دکانیں جلائی گئیں۔غریب' مزدور' امیر' رئیس اور سرمایہ دار بلا امتیاز تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور اس طرح لاکھوں آدمی قتل ہوئے۔آخر کار لاقانونیت کو روکنے اور لوگوں کی حفاظت کرنے کے لیے پاکستان کی فوجیں آگے بڑھیں' اب ان کے ہاتھوں بے شمار باغی قتل ہوئے۔اب ان فوجوں کے مقابلہ کے لیے بھارت نے گوریلا فوج تیار کرنی شروع کی۔جا بجا کیمپ کھل گئے اور باغی بنگالیوں کو باقاعدہ جنگ اور گوریلا طریقہ حرب کی

تربیت دی جانے لگی۔اس فوج نے تیاری کر کے جب ہماری عسا کر قاہرہ سے ٹکر لی تو ہر جگہ منہ کی کھائی۔یہ حالت دیکھ کر بھارت اپنی پوری طاقت سے میدان میں اتر آیا اور پاکستان کے مشرقی او رمغربی دونوں صوبوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔بے شمار آدمی اس جنگ میں کام آئے'ان لڑائیوں میں ہماری فوجوں نے ایسی بہادری دکھائی جس کی مثال جنگی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ایک مقام پر ہمارے صرف 42 غازیوں نے 540 بھارتی فوجیوں کو جہنم رسید کیا۔بیرونی مما لک کے نامہ نگاروں نے ایسے بہت سے چشم دید واقعات بیان کیے ہیں۔لیکن بھارتی فوجیں اور بحری بیڑہ روس کے دیئے ہوئے تازہ ترین ہتھیاروں' آبدوزوں اور میزائلوں وغیرہ سے لیس تھا اور خود روسی افسر جنگ میں ہدایات دے رہے تھے نیز یہ کہ مشرقی پاکستان کو کسی طرف سے مدد نہ پہنچ سکتی تھی۔جن دوست ملکوں پر ہم نے خدا کو چھوڑ کر بھروسہ کیا تھا'انہوں نے محض زبانی ہمدردی اور چیخ و پکار کے کوئی اور ٹھوس مدد نہ دی۔اس کے علاوہ جیسا کہ سب جانتے ہیں ہماری فوجی قیادت نہایت نا کارہ تھی' ہمارے جرنیل شراب و کباب کی اور رقص وسرور کی محفلوں میں مست و مدہوش تھے۔نتیجہ وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہونا چاہیے تھا کہ ہم کو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہمارے 93 ہزار فوجی ہندوؤں کی قید میں چلے گئے۔دراصل یہ تھا سب سے بڑا سانحہ جو پچھلی دونوں قیامتوں سے زیادہ نقصان رساں اور جگر دوز تھا۔ایسی شکست مسلمانوں کو دنیا میں اس سے پہلے کبھی اور کہیں بھی نہیں ہوئی اور وہ کون سا مسلمان ہے جس کا دل اس شکست کے بعد زندہ رہنے کو چاہتا ہوگا مگر کیا کیا جائے خودکشی بھی حرام ہے۔

اب لوگ اس شکست فاش کی وجوہات کا پتہ لگانے کے درپے ہیں۔کوئی کہتا ہے کہ ہماری فوجوں کے پاس سامان حرب نکما اور کم تھا' کوئی کہتا ہے کہ 1965ء میں جو بہادر افسر لڑے تھے وہ سب فوجوں سے نکال دیئے گئے اور کوئی کہتا ہے کہ ہماری نئی نسلوں کو نظریہ پاکستان سے واقف نہیں کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

مگر برادران حلقہ! میں تو ایک فقیر درویش ہوں میری رائے میں تو اس ذلت آمیز شکست کی وجہ خود ہماری بد اعمالیاں' خامیاں' کوتاہیاں اور مذہب سے بے اعتنائی ہے۔ابھی تو اللہ نے

ہمارے صرف ایک گال پر تھپڑ مارا ہے دوسرے کو آزمائش کے لیے چھوڑ دیا ہے اگر ہم نیک اعمال کرنے لگیں اور اچھے مسلمان بن جائیں تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا جو حصہ بچ گیا ہے وہ خوب پھلے پھولے گا اور ترقی کرے گا بلکہ پچھلی سزا کی تلافی بھی کر دی جائے گی۔ لیکن اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو پھر جو کچھ باقی بچا ہے اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ آیئے اب ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ ہم اپنے اعمال وافعال کی وجہ سے خدا کے کرم اور رحمت کے مستحق ہیں یا سزا اور عقوبت کے۔

دنیا کے معاشرے میں تین طبقات ہوتے ہیں اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ ہمارے یہاں بھی یہی تین طبقے ہیں اور انہی کا جائزہ ہم کو لینا ہے۔ ہمارے ہاں اعلیٰ طبقہ میں علماء، حکام، صناع، تاجر اور بڑے بڑے زمیندار شامل ہیں۔ متوسط طبقہ اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ، سیکنڈ کلاس حکام اور افسر، صناع، تاجر اور معمولی زمینداروں پر مشتمل ہے۔ ادنیٰ طبقہ میں بالکل جاہل یا معمولی پڑھے لکھے، تیسرے درجہ کے ملازمان، معمولی تاجر، کسان، مزدور اور شاگرد پیشہ لوگ ہیں اور یہی طبقہ تعداد میں سب سے زیادہ ہے۔ مگر طبقات کی یہ ترتیب دنیا والوں کی بنائی اور یورپ کی سکھائی ہوئی ہے ورنہ قرآن میں تو اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تم میں سے جو سب سے زیادہ متقی ہے اتنا ہی زیادہ وہ اللہ کی نظروں میں عزت والا ہے۔ افسوس کہ یورپ اور خصوصاً انگریز کی اندھی تقلید میں ہم نے جہاں اور بہت سی خوبیوں کو ترک کر دیا وہاں شرافت اور بزرگی کے اس قرآنی معیار کو بھی چھوڑ دیا۔ اب تو جس آدمی کے پاس روپیہ ہے وہ خواہ کیسا ہی بے ایمان، دغاباز، شرابی، زانی اور غاصب ہو ساری دنیا اسی کی عزت کرتی اور اسی کو شریف سمجھتی ہے۔ آج اس گئے گزرے دور میں بھی ادنیٰ طبقہ میں آپ کو ایسے بزرگ اور متقی لوگ مل سکتے ہیں کہ خود شرافت و بزرگی ان کے دامن اتقا پر سجدہ کرتی ہے۔ لیکن دنیا میں ان کو کوئی دو ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا۔

طبقہ اعلیٰ کا کردار (علماء، حکام اور اساتذہ):

آیئے اب ان طبقات میں سے ہم سب سے پہلے طبقہ اعلیٰ میں علمائے دین پر نظر ڈالیں۔ اللہ کا بڑا فضل وکرم ہے کہ ہمارے علماء کا دامن ان کبیرہ گناہوں سے بالکل پاک ہے جو ہمیشہ قوموں کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ لیکن بے عیب تو خدا کی ذات ہے ہمارے علمائے دین میں بھی کچھ

ایسی خامیاں اور کوتاہیاں ہیں جن کی وجہ سے اکثرقومیں تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ یہ بزرگ فرقہ وارانہ تعصب میں بہت ہی زیادہ متشدد ہو چکے ہیں۔ایک فرقہ والا دوسرے فرقے والے سے ملنا اور بات کرنا بھی عیب اور برا سمجھتا ہے۔آپ اگر کسی مولوی صاحب کے پاس اس نیت سے جائیں کہ کچھ اچھی باتیں سنیں گے اور وہاں سے کم از کم سکون قلب کی دولت لے کر واپس لوٹیں گے تو آپ کو اس میں سخت ناکامی ہوگی۔جہاں جائیں گے وہاں دوسرے فرقوں کی برائی کے سوا اور کچھ سننے میں نہ آئے گا۔صبح کی نماز کے وقت سے شام تک لاؤڈ اسپیکروں پر بھی یہی کچھ سننے میں آتا ہے یہاں تک کہ دل اکتا جاتا ہے۔علماء کا کام ہے کہ بھولے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو صراط مستقیم پر لگائیں۔ان کے اخلاق کی اصلاح کریں اور ان کو سچا اور پکا مومن بنائیں۔لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے اس فرقہ وارانہ تعصب کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے قریب آنے کی بجائے اور بھی دور ہوتے جا رہے ہیں اور قوم کے اتحاد کو بے اندازہ نقصان پہنچا ہے۔جماعت بیسیوں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئی ہے اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے سخت نفرت اور کدورت رکھتا ہے۔جس قوم میں اس قدر حقارت و نفرت کے جذبات موجود ہوں وہ کیسے متحد ہو سکتی ہے اور دوسری قوموں کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی طرح بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ بن کر دشمن کے سامنے آ سکتی ہے۔دوسری بڑی خامی ہمارے علمائے دین میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے پاس مذہب کی بابت کچھ سیکھنے یا پوچھنے کے لیے جائے اور اس کی وضع قطع شرع کے خلاف ہو مثلاً اس کی داڑھی منڈی ہوئی ہو، وہ سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے ہوئے ہو تو مولوی صاحب اس کے ساتھ نہایت ہی بے اعتنائی بلکہ بداخلاقی سے پیش آتے ہیں اور وہ بے چارہ پشیمان ہو کر انتہائی احساس مذلت کے ساتھ واپس آتا ہے اور آئندہ کے لیے عہد کرتا ہے کہ مذہب رہے یا جائے وہ اس طرح ذلیل ہونے کے لیے کبھی کسی مولوی کے پاس نہ جائے گا۔

میرے ایک دوست جو یہاں جلسہ میں موجود ہیں ان کا بیان ہے کہ وہ عرصہ سے نماز روزے اور دیگر شعائر اسلامی کے پابند نہ تھے یہاں تک کہ ایک دفعہ ضمیر نے سخت لعنت ملامت کی اور وہ

اپنی اصلاح کی غرض سے ایک بہت ہی بڑے مولوی صاحب کی مسجد میں حاضر ہوئے ۔نماز ظہر کا وقت تھا وہ وضو کر کے ذوق و شوق میں سب سے اگلی صف میں امام صاحب کے بالکل پیچھے کھڑے ہو گئے ۔ اتنے میں مولانا تشریف لے آئے تو انہوں نے جوان کو بایں ہیئت کذائی دیکھا کہ داڑھی منڈی ہوئی اور پتلون پہنے ہوئے ہیں تو نہایت خشم آلود نگاہوں سے گھورا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی ۔ مولانا کے معتقدین ان کا مطلب سمجھ گئے اور انہیں دھکے دے کر پچھلی صف میں ہٹا دیا ۔پچھلی صف والوں نے اس سے پیچھے اور پھر اس سے پیچھے دھکے کھاتے ہوئے غریب جوتوں میں پہنچ گئے ۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنی جوتیاں بغل میں دبائیں اور سیدھے گھر چلے آئے اور آئندہ کے لیے عہد کیا کہ کبھی مسجد میں نہ جائیں گے ۔یہ تو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے ورنہ روزانہ ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں ۔برادران حلقہ ذرا غور کیجیے کیا اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ ایک گناہگار انسان اپنے گناہوں پر پشیمان ہو کر کسی بزرگ کے پاس جاتا ہے کہ اس کی تعلیم اور توجہ سے اپنی اصلاح کرے اور وہاں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے ۔اللہ تو فرماتا ہے کہ ''اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور دل پذیر نصیحت کے ساتھ بلاؤ'' اور یہاں اعلائے کلمۃ اللہ کے علمبردار یہ سلوک کرتے ہیں پھر اصلاح ہو تو کیوں کر ہو ۔

دوسری خامی ان بزرگوں میں یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتے ۔ہر معاشرہ میں بیسیوں پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں اگر ان میں سے کسی ایک پیشہ کے سب لوگ اپنا کام چھوڑ دیں تو معاشرہ کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو کر رہ جائے ۔مثال کے طور پر اگر پورے پاکستان کے خاکروب اپنا کام بند کر دیں تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ملک کا کیا حال ہو اور کیا تباہی مچے ۔اسی طرح سب سے افضل اور اعلیٰ پیشہ ہمارے علماء کا ہے ۔ان کا کام بلکہ فرض ہے کہ مسلمانوں میں نئی نسل کو اسلام سکھائیں اور پھر ان کو اسلام پر قائم رکھیں ۔مگر یہاں اس فرض کی ادائیگی کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئی ہیں اور اگر کوئی تبلیغ کی بھی جاتی ہے تو دوسرے فرقے والوں کو برا بھلا کہہ کر ۔اس وجہ سے اول تو اس کا کوئی اثر ہوتا ہی نہیں اور ہوتا بھی ہے تو بالکل الٹا ۔پنجاب کے شہروں سے دور دیہات میں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں جن کو نماز روزہ بھی

نہیں آتا بلکہ بہت سے لوگ تو نبی کریم ﷺ کے نام مبارک سے بھی واقف نہیں ہیں۔ چنانچہ چیچہ وطنی سے آگے بار کے علاقہ میں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں جو جانگلی کہلاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب بھولے بھٹکے اس طرف چلے آئے' ایک گاؤں میں انہوں نے تقریر کی تو سینکڑوں آدمی تقریر سننے کے لیے جمع ہو گئے۔ مولانا نے ''نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ کا ذکر کیا اور دوران وعظ یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی امت سے اتنی محبت ہے کہ جب تک حضور ﷺ تمام گناہگار مسلمانوں کو جنت میں نہ پہنچا دیں گے خود اندر نہ جائیں گے۔'' یہ سن کر چند جانگلی مولانا سے پوچھنے لگے: ''کیوں جی مولوی جی'' اوہ کوئی پیر بابے کولوں وی وڈا اے''یعنی کیا وہ بابا فرید گنج شکر سے بھی بڑا آدمی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے علماء پر خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ کثرت سے ان علاقوں کا دورہ کریں بلکہ وہیں رہائش اختیار کر لیں اور ان جانگلیوں کو پکا مسلمان بنائیں۔

علمائے کرام کے بعد اعلیٰ طبقہ میں حکام' پروفیسر' صحافی اور مصنفین ہیں۔ بڑے بڑے زمیندار' صناع اور تجارت پیشہ سوداگر ہیں۔ حکام میں بھاری اکثریت شرابی' زانی اور راشی لوگوں کی ہے۔ ان عیبوں کے علاوہ سب سے بڑا عیب ان میں غرور و تکبر کا ہے۔ جس وجہ سے وہ اپنے عیوب پر کبھی پشیمان بھی نہیں ہوتے اور اپنے سے کمتر لوگوں کو انسان بھی نہیں سمجھتے۔ یہ وہ عیوب ہیں جو اگر کسی قوم کے پچیس فیصد آدمیوں میں پیدا ہو جائیں تو وہ تباہ ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے حکام میں اسی فیصد لوگ ایسے موجود ہیں جن کی روحیں ان گناہوں میں آلودہ ہو کر مسخ ہو چکی ہیں' ان کا ضمیر مر چکا ہے اور وہ اپنے ذاتی نفع کے لیے نہ صرف اپنے ملک و قوم بلکہ اپنے دین و ایمان تک کو سونے چاندی کے چند ٹکڑوں کے عوض فروخت کر دیتے ہیں اور ایسے ایمان فروش افسروں کی ہمارے ہاں کمی نہیں۔ ممکن ہے کہ گزشتہ جنگ میں ایسے افسر رشوتیں لے کر ہماری شکست کا باعث ہوئے ہوں۔ عام سول دفتروں میں اہل معاملہ کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اور جس طرح ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہم میں

سے ہر ایک کو اس کا تھوڑا بہت تجربہ ہے۔ لہٰذا زیادہ تفصیل میں جانا بے کار ہے۔ حکام کے علاوہ اعلیٰ طبقہ میں جو اور لوگ ہیں مثلاً بڑے بڑے زمیندار' دولت مند' سوداگر اور صناع وغیرہ ان میں یہ عیوب دل بھر کر موجود ہیں جو ہمارے حکام میں ہیں۔ البتہ اس طبقہ میں جو اعلیٰ درجہ کے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب ہیں ان میں یہ عیوب میرے اندازے کے مطابق بہت کم ہیں زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس فیصد لوگ ایسے ہوں گے جو اس گند سے آلودہ ہوں۔ ان لوگوں میں مذہب کو سمجھنے اور ماننے والے لوگ بھی بہت ہیں۔ مسلمانوں کے اجتماعی زوال پر ان لوگوں کا دل روتا ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح عام مسلمانوں کو ترقی و طاقت کی راہ پر ڈال دیں۔ لیکن عام معاشرتی ڈھانچے کی کمزوریوں اور خرابیوں کی وجہ سے مجبور ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔ مثلاً فکر معاش اور حصول اسباب زندگی میں ہی ان کا سارا وقت صرف ہو جاتا ہے اور قومی ترقی کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ دل ہی دل میں مرجھا جاتا ہے' پروان نہیں چڑھنے پاتا۔ زندہ قوموں میں ایسے ماہران علوم و فنون کو حکومت گھر بیٹھے بڑے بڑے وظیفے اور عطیات دیتی ہے تاکہ وہ پیٹ کے چکر سے نجات پا کر قومی ترقی کے راستے دریافت کرنے میں سارا وقت صرف کر دیں۔ مقابلتاً یہ طبقہ ہماری قوم میں سب سے اچھا اور قابل عزت اور وقعت ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس اسی طبقہ میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو ہمارے بڑے سے بڑے قومی دشمن سے بھی زیادہ ہماری قوم کے لیے خطرناک ہیں۔ یہ لوگ نہایت خاموشی سے اپنا کام کرتے ہیں اور ہماری نئی نسلوں کے ذہن میں ملک و قوم اور مذہب سے نفرت کا زہر بھرتے رہتے ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون ہیں؟ یہ ہیں کالجوں کے پروفیسر' اسکولوں کے ٹیچر اور کتابوں کے مصنف۔ یہ لوگ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان' نہ عیسائی ہیں نہ یہودی۔ اول درجہ کے آزاد اور مادر پدر آزاد جو معاشرہ کے کسی طبقے اور کسی سیکشن سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ کوئی اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتا ہے' کوئی سوشلسٹ۔ ان کا تعلق یا تو ایسی بے دین جماعتوں سے ہے جو مسلمانوں کے دل و دماغ سے خدا' رسول ﷺ اور مذہب کی محبت کو نکال پھینکنے کے لیے قسمت آزما مفلسوں کو بیش قرار معاوضہ دے کر مذہب' قوم اور ملک کے خلاف کام لیتی ہیں یا پھر ایسے خودرو آوارہ ذہن لوگوں میں سے ہیں جن کی نشو و نما اور تربیت با قاعدہ نہیں ہو سکی یہ لوگ نہ

مذہب اسلام سے واقف ہیں نہ اسلام کے عظیم الشان اخلاقی و معاشی نظام سے واقف ہیں۔ نا کافی مطالعہ اور نا مساعد حالات کی وجہ سے یونہی جو کچھ منہ میں آتا ہے بکتے پھرتے ہیں اور غریب طلباء اور دوسرے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا ایمان خراب کرتے ہیں۔قوم کے ہر فرد کو چاہیے کہ ان سب لوگوں سے ہوشیار رہے اور ان کا احتساب کرتا رہے۔ابھی دو تین ہفتہ قبل کی بات ہے کہ میرے ایک دوست جو ایک بہت ہی اونچے ادارے میں انسٹرکٹر ہیں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ انصاری صاحب میرے ساتھی اساتذہ میں دو تین پی ایچ ڈی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ''اسلام جب سے وجود میں آیا ہے آج تک اس نے خلق خدا کے لیے کوئی مفید کام نہیں کیا۔یہ مذہب صرف جنگ وجدل سکھاتا اور آدمی میں مذہبی تعصب اور جنون پیدا کرتا ہے۔وہ اس قسم کے واقعات کے حوالے بھی دیتے ہیں۔چنانچہ کچھ عرصہ ہوا پی آئی اے کے ایک ڈرائیور نے پولینڈ کے صدر کو جس طرح مارنے کی کوشش میں پولش وزیر خارجہ اور کئی پاکستانی افسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس واقعہ کا خاص کر حوالہ دیتے اور مولوی صاحبان کے تعصب کے سینکڑوں واقعات بیان کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ان میں سے ایک نے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں ایک دن ایک ڈاکٹر کے مطب میں بغرض علاج گیا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب ایک انگریز کا معائنہ کر رہے تھے۔ڈاکٹر نے اس کی زبان اور سینہ وغیرہ کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھا اور نسخہ لکھ کر حوالہ کیا۔اس کے بعد سب سے اگلی کرسی پر ایک مولوی صاحب تشریف فرما تھے۔ان سے کہا مولانا آیئے اب آپ کو دیکھوں تو مولانا نے جواب دیا پہلے اپنے ہاتھ دھو لو پھر مجھے ہاتھ لگانا' ڈاکٹر نے پوچھا کیا بات ہے میرے ہاتھوں کو کیا ہوا ہے تو مولانا نے جواب دیا کہ تم نے ابھی اس کافر کے بدن کو ہاتھ لگایا ہے تمہارے ہاتھ ناپاک ہیں۔

میں مولوی صاحب کی زبان سے یہ بات سن کر حیران رہ گیا اور اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ یہ عیسائی اور یہودی ہم سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ظاہر ہے جب ہم انہیں کافر کہتے ہیں اور ناپاک سمجھتے ہیں تو وہ بھی ہم کو کافر کہتے اور ناپاک سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن کریم میں اہل کتاب کو کہیں کافر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ان کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے شادی تک کرنے کی

اجازت دی گئی ہے ۔اسی طرح ہم دوسری قوموں کو بھی کافر اور ناپاک کہتے ہیں اور جس طرح ہندو ایک اچھوت کو چھونے سے احتراز کرتے ہیں ہم بھی ان کافروں سے بچتے اور دور دور رہتے ہیں ۔ میرے خیال میں تو یہی وجہ ہے کہ ہم میدان سیاست میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا اور بے یارومدد گار پاتے ہیں ۔

عیسائی ،یہودی ،ہندو ، کمیونسٹ ،سوشلسٹ کوئی بھی ہمارا ساتھی نہیں اور جس قوم کو تمام اقوام اس طرح اچھوت قرار دیں وہ دنیا میں کس طرح پنپ سکتی ہے ۔" یہ قصہ بیان کرنے کے بعد یہ صاحب مجھ سے پوچھنے لگے انصاری صاحب آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں میں نے جواب دیا پروفیسر صاحب آپ مجھ سے زیادہ علم رکھتے اور ان باتوں کو کہیں زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ میری رائے میں تو آپ پر فرض ہے کہ اپنے ساتھی اساتذہ کو قرآن وسنت کی طرف رہنمائی کریں اور جیسا قصہ آپ کے ساتھی نے بیان کیا ایسے ہی قصوں کا حوالہ دے کر بتائیں کہ جناب قرآن کی تعلیم تو یہی ہے کہ سب انسانوں سے محبت ،عزت اور خوش اخلاقی سے پیش آئیں اور اپنے اخلاق کے مظاہرے سے ان پر قرآنی تعلیم کی خوبیاں ظاہر کریں ۔اب کوئی اس پر عمل نہ کرے اور بتانے والے غلط بتائیں تو اس میں اسلام کا کیا قصور ہے ۔"

یہ دشمن اسلام پروفیسر ،لیکچرار اور مصنفین ہماری آئندہ نسل کے نونہالوں کی ذہنیت کو دین و مذہب کے خلاف جس طرح مسخ کر رہے ہیں اب میں اس کی چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ظاہری اور کھلے دشمنوں کے مقابلہ میں یہ ذہنی ڈاکو ہمارے معاشرے کے کتنے خطرناک دشمن ہیں ان سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن کوشش کرنی ہمارا فرض ہے ان کی ناپاک کوششوں کی دو تین سچی مثالیں سنیے اور سر دھنیے ۔

نام کے مسلمانوں کا عمل:

کچھ عرصہ ہوا کہ میرے ایک دوست پنڈی سے ٹرین میں لاہور آرہے تھے ۔ریل ڈبے میں وہ اور ان کے ایک عمر رسیدہ دوست جو لاہور میں ایڈووکیٹ ہیں بیٹھے تھے ۔ان کے علاوہ آٹھ دس نوجوان لاہور کے ایک مشہور کالج کے طالب علم تھے وہ بھی ہم سفر تھے جب گاڑی چلی تو نوجوان

طلباء آپس میں کچھ بحث کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اور تو سب خاموش ہو گئے لیکن ایک طالب علم دوسروں کو مخاطب کر کے تقریر کرنے لگا تقریر میں وہ بار بار نبی کریم ﷺ کا ذکر کرتا اور صرف محمد محمد کہتا (نعوذ باللہ) اور بیان کرتا کہ محمد نے یہ کیا محمد نے وہ کیا۔ میرے دوست کہتے ہیں میں تو خاموش بیٹھا سنتا رہا لیکن میرے معمر دوست یعنی وکیل صاحب سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے اس طالب علم کو مخاطب کر کے پوچھا: صاحب زادے!''آپ مسلمان ہیں؟''تو صاحب زادے نے نہایت خشونت آمیز لہجہ میں جواب دیا:''جی ہاں فرمایئے''وکیل صاحب نے کہا:''اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ کو نبی کریم a کا نام عزت و ادب سے لینا چاہیے۔''صاحب زادے صاحب نے جواب دیا: آپ کا تو دماغ خراب ہے۔''ان کا نام عزت سے لیا جائے تو کارل مارکس' لینن اور ماوزے تنگ کا نام عزت سے کیوں نہ لیا جائے۔''''ان لوگوں نے وہی کچھ کیا ہے جو انہوں نے کیا تھا۔''اس پر وکیل صاحب کچھ اور بولنے والے تھے مگر میں نے منع کر دیا کہ''بے ادب اور بے دین لڑکے ہیں خواہ مخواہ ان سے الجھ کر کیوں بے عزتی کراتے ہو۔''

سنا آپ نے یہ ہیں ہماری قوم کے سپوت اور مایہ ناز نونہال جو بڑے ہو کر قومی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ میں نے ایک دن یہ واقعہ اپنے ایک عزیز کے صاحبزادے سے بیان کیا جو لاہور کے ایک مشہور کالج میں پڑھتے ہیں۔ انہوں نے سن کر کہا کہ''یہ تو بہت معمولی بات ہے ہمارے کالج میں کافی تعداد ایسے ہی لڑکوں کی ہے جو مذہب کی الف بے تے اور نبی کریم ﷺ کے نام مبارک سے بھی واقف نہیں۔''وہ کہنے لگے کہ اکثر خالی گھنٹوں میں ایسی بحثیں اور باتیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک دن یہ سوال درپیش تھا کہ حضور اکرم ﷺ کہاں پیدا ہوئے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ بغداد میں' کوئی کہتا تھا دمشق میں' ایک لڑکا بولا تم سب غلط کہہ رہے ہو' وہ تو سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے تھے۔''میں نے اپنے عزیز سے یہ بات سن کر پوچھا کہ پھر تم نے ان کو بتایا نہیں تو وہ کہنے لگا کہ''مجھے جوتے کھانے تھے جو ان سے کچھ کہتا۔''یہ لڑکے تو ایسے بے شرم ہیں کہ ان کو مذہب کے متعلق کچھ بتاؤ تو مذاق اڑاتے ہیں اور مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں یہ روزمرہ کی باتیں ہیں اور مجھ کو لوگ ملا جی کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا سبھی لڑکے ایسے ہیں اس نے کہا

نہیں۔ایسے بھی بہت ہیں جو مذہب سے خوب واقف ہیں بلکہ مذہب کے نام پر جان دینے کو تیار ہیں لیکن میری طرح وہ بھی مجبور ہیں اگر ہم کچھ بولیں تو وہ لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اس لیے ہم سب خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں تا کہ فساد نہ ہو۔

اب ایک اور مثال سنیے جو پچھلی مثالوں سے کہیں زیادہ اندوہناک ہے' مقامی کالجوں میں سے ایک زنانہ کالج کی پرنسپل نے چند لڑکیوں سے کہا کہ کالج میں شراب پی کر نہ آیا کرو اور کلاس میں بیٹھ کر سگریٹ نہ پیا کریں اس پر وہ لڑکیاں بگڑ گئیں اور حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ پرنسپل نے ان پر جرمانہ کر دیا دوسرے دن ان لڑکیوں کی مائیں تشریف لائیں اور پرنسپل سے لڑائی کے انداز اور سخت لہجہ میں فرمانے لگیں کہ ''جب ہم کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر تم کون ہوتی ہو منع کرنے والی'' پرنسپل نے جواب دیا کہ ''آپ اپنے گھر میں شراب پلائیں یا اس سے بھی بدتر کچھ اور کرائیں۔ کالج کی مالک میں ہوں یہاں میرا حکم چلتا ہے میں ہرگز ان کو معاف نہیں کروں گی۔'' اس واقعہ کی صداقت کا مجھے پورا یقین نہیں ہے کیوں کہ راویہ اسی کالج کی ایک طالبہ تھی ممکن ہے اس نے غلط کہا ہو یا مبالغہ کیا ہو۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ میں نے کالج کی چند لڑکیوں کو سگریٹ پیتے تو خود دیکھا ہے۔ شراب کی بات کا البتہ مجھ کو کسی طرح یقین نہیں آتا۔ مسلمان کتنے ہی گئے گزرے ہوں اور دولت مند بننے کے بعد دین و مذہب سے کتنے ہی بے گانہ کیوں نہ ہو جائیں اس قدر بے حیا تو نہیں ہیں جو اپنی لڑکیوں کو بہ طیب خاطر شراب پینے کی اجازت دیں۔ وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

تو برادران حلقہ! یہ ہے ہم پاکستانیوں کے اخلاق اور مذہبی اعمال و افعال کی دھندلی سی تصویر۔ اگر مضمون پر زیادہ تحقیق و تفتیش کے بعد کچھ لکھا جائے تو کئی جلدیں لکھی جا سکتی ہیں مگر کس کو اتنی مہلت ہے اور کون یہ دردسر مول لے۔ ادنیٰ طبقہ کا ذکر میں نے اس لیے نہیں کیا کہ جہالت اور غربت کی وجہ سے اس طبقہ کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ مفاد پرست لوگ ان لوگوں کو کچھ روپیہ پیسہ دے دلا کر اور لمبے چوڑے وعدے کر کے جس طرف چاہیں اسی طرف موڑ دیتے ہیں۔ قوم کے عروج و زوال بلکہ زندگی اور موت کے ذمہ دار تو اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں وہ دیانت داری' محنت اور خلوص سے محض ملک و قوم کے فائدے کے لیے کام کریں تو وہ قوم کبھی ذلیل و خوار نہیں ہو

سکتی۔لیکن جب خود یہی بد دیانت' راشی' بدچلن' بدخلق اور مفاد پرست ہوں تو پھر قوم کا خدا ہی حافظ و ناصر ہے۔اس کا سفینہ آج نہیں ڈوبا تو کل ڈوبے گا۔

صوفیائے کرام کا طریقۂ اصلاح:

میں نے آج سے پورے ساٹھ سال پہلے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ ہماری قوم بڑی تیزی سے تباہی اور زوال کے غار کی طرف رواں دواں ہے۔اسی زمانہ سے میں دنیا کی مختلف قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں تاریخ میں پڑھتا رہا پھر مدتوں اس بات پر غور کیا کہ قومیں کن وجوہات کی بناپر مٹتی اور بگڑتی ہیں اس کے بعد مسلمانوں کی اصلاح وترقی واحیاءِ ثانیہ کے لیے جتنی جماعتیں وجود میں آئیں ان کی تنظیم' مساعی اور طریق کار کا مطالعہ بنظر غائر کیا اور ان کی ناکامی کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔پورے تیس سال کی جدوجہد اور کدوکاوش کے بعد میں تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم مسلمان خواہ وہ کسی ملک کے بھی ہوں مومن نہیں ہیں صرف مسلمان ہیں اور مسلمان بھی نام کے۔نوے فیصد مسلمان تو قرآن حکیم کی تعلیم ہی سے واقف نہیں اس پر عمل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ہم قرآن کریم کی بجائے رسوم پرستی کو اسلام سمجھ رہے ہیں۔ہم نے فرائض کو بھلا دیا ہے اور فروعات کو فرائض سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ہم نماز اول تو پڑھتے ہی نہیں اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہماری نمازوں سے ہمارے اخلاق کی کہاں تک اصلاح ہوئی ہے' ہم نے کون کون سے برائیوں کو چھوڑا اور کون کون سے نیکیوں کو اختیار کیا ہے کیوں کہ خدا تو نے نماز کی یہی تعریف کی ہے کہ نماز برائیوں اور ممنوعہ کاموں سے بچاتی اور نیک بناتی ہے۔اس کے علاوہ ہم کبھی غور نہیں کرتے کہ ہماری نماز میں خشوع اور حضوری باری تعالیٰ کہاں تک تھی۔اگر نماز سے یہ فوائد حاصل نہیں ہوتے تو وہ کیا خاک نماز ہے وہ تو ایک رسم ہے محض رسم جو پانچ وقت ادا کر لی جاتی ہے۔یہی حال دوسری عبادات کا ہے کہ محض رسماً ادا کر لی جاتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی میں نے یہ دیکھا کہ علمائے کرام میں جو لوگ واقعی متقی اور پرہیز گار ہیں ان کی باتوں میں بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ان کی تقریر کے دوران لوگ روتے بھی ہیں اور ان کے دل میں اصلاح کا ولولہ بھی اٹھتا ہے۔لیکن جلسہ گاہ سے نکلتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔پھر میرا خیال ان صوفیائے

کرام کی طرف گیا جو بخارا' ایران اور عراق سے چل کرا کیلے یا دو چار مریدوں کے ساتھ بالکل بے سرو سامان انڈونیشیا' چین اور ترکستان یا ہندوستان آئے اور کسی شہر میں مقیم ہو کر خاموشی سے تبلیغ اسلام کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں آدمیوں کو مسلمان بنالیا۔ مدتوں ان کی زندگی اور ان کے اخلاق کا تجزیہ کرنے اور موجودہ سچے صوفیوں اور خود اپنی حالت پر غور کرنے کے بعد مجھ پر یہ راز کھلا کہ ان بزرگوں کے پاس دو چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ان کے پاس بیٹھنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہیں اور ان کی ذات کا والہ وشیدا بنا دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو ان کا اخلاق ہے اور دوسری چیز جو اخلاق سے بھی کہیں زیادہ موثر اور طاقت ور ہے وہ روحانی طاقت ہے جو حرارت یا سوزو گداز کی صورت میں ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس سے بات کرتے ہیں وہ نہایت غور سے ان کی بات سنتا اور جو کچھ کہتے ہیں اس پر بے چون و چرا عمل کرنے لگتا ہے۔

یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد میں نے خود اس کے تجربے کئے تو سو فیصد درست پائے۔ اب میں نے حلقہ توحیدیہ کی بنیا دڈالی اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی بجائے' خود مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح شروع کر دی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ میں نے 1950ء میں یہ مبارک کام شروع کیا تھا۔ اس وقت میں بالکل اکیلا تھا اور آج 22 برس بعد آپ دیکھتے ہیں کہ بفضل خدا میرے ساتھ چار پانچ ہزار آدمی ہیں جن میں سے کئی سو ولی کامل ہیں اور باقی بھی خالی نہیں' روحانیت میں خاصا بلند مقام رکھتے ہیں۔ چونکہ ہم لوگ یہ کام بطور پیشہ نہیں کرتے اور فقیری وضع قطع اختیار کیے بغیر دنیا کے تمام کام سرانجام دیتے ہوئے اللہ اللہ کرتے اور مدارج روحانی کا اکتساب کرتے ہیں' اس لیے دنیا والوں کی نظر سے بچے ہوئے ہیں یعنی مشہور نہیں ہیں۔

توحیدیوں کی ذمہ داری:

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے زمانہ میں معاشرہ کی اصلاح کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ پہلے خاموشی سے ایک جماعت اولیاء اللہ کی تیار کی اور پھر اس جماعت کے افراد کو امراء اور وزراء

کے پاس بھیج کر ان کی اصلاح کرائی جس کا فائدہ تاریخ کے صفحات سے آج بھی ثابت ہے میں نے بھی وہی وطیرہ اختیار کیا۔ 1950ء سے اب تک بزرگوں کی ایک جماعت پیدا کرنے میں لگا رہا ہوں۔ اب جب کہ ہماری جماعت میں اچھے بزرگوں اور اولیاء اللہ کی تعداد کافی ہو گئی ہے میں چاہتا ہوں کہ ہماری جماعت دیہات و امصار میں پھیل جائے اور دیہات کے لوگوں کی مذہبی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا کام شروع کر دے۔ اس میں مشکل یہ درپیش ہے کہ ہمارے تمام بھائی کاروباری یا ملازمت پیشہ ہیں اس وجہ سے باہر جا کر کام نہیں کر سکتے۔ یہ مجبوری ہے مگر باوجود اس کے ہم کو فوراً یہ کام شروع کر دینا چاہیے ہمیں چاہیے کہ ہم کچھ دن کی چھٹیاں لے کر دیہات میں جائیں اور وہاں توحید و روحانیت کا نور پھیلائیں۔ اس طرح سے جو کچھ تھوڑا بہت تجربہ ہم نے کیا ہے وہ بہت ہی حوصلہ افزا ہے لوگ اس طرح گرتے ہیں جیسے شمع پر پروانے' دنیا ہماری منتظر ہے۔ شراب توحید ولایت کے طالب ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تشنہ کام اور مایوس بیٹھے ہیں۔ اس لیے اے میرے دوستو! اب آپ بلا تاخیر یہ کام شروع کر دیں۔ اس سے بہتر دنیا میں کوئی عبادت اور کوئی نیک کام نہیں۔ کیا عجب ہے کہ رب کریم نے یہ سعادت ہمارے حلقہ کی تقدیر میں لکھی ہو کہ ہم بھولے بھٹکوں کو اللہ کا سیدھا اور سچا راستہ دکھائیں ان کو نہ صرف مسلمان بلکہ مومن اور ولی اللہ بنا دیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ قرآن کریم کے بھلائے ہوئے سبق پھر یاد آ جائیں اور احیاء اسلام کا سہرا پاکستان کے سر رہے۔ امید بہت بڑی اور بضاعت بہت کم ہے کو چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن خلوص دل اور محنت سے کام کرنے والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ ضرور نوازتا اور فائز المرام فرماتا ہے۔

اب میں آپ کو چند نکات بتاتا ہوں جو کام کرتے وقت آپ کو ہر وقت یاد رکھنے ہوں گے اور ان پر عمل کرنا ہوگا۔

۱..... تبلیغ بالکل خاموشی سے کی جائے جس کو آپ حلقہ میں شامل کرنا چاہیں اس کو زبان سے دعوت نہ دیں بلکہ دل سے اس پر اثر ڈالیں' وہ خود بخود آپ کی طرف راغب ہو جائے گا۔

۲..... کسی سے بحث ومباحثہ وتمحیص سے بالکل بچا جائے اور جو کوئی بحث کرنا چاہے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لی جائے۔

۳......کام بالکل خلوص سے کیا جائے یعنی اس میں ذاتی مفاد یا اپنی فضیلت و بڑائی کا رائی برابر خیال دل میں نہ ہو محض خداوند قدوس کے لیے اور امت اسلامیہ کی بہتری اور بہبود کے لیے کیا جائے۔

۴......کیسی ہی مخالفت ہو اور آپ کے ساتھ کوئی کتنی ہی سختی اور درشتی سے پیش آئے جواب میں سوائے نیکی اور نیک سلوک کے آپ اور کچھ نہ کریں۔

۵...... جہاں پانچ آدمی ہو جائیں وہیں ایک حلقہ قائم کر دیا جائے اور ان پر ہمیشہ نظر رکھی جائے اور ان کو اپنی تعلیم اور اخلاق سے بہرہ ور کیا جائے۔

فی الحال یہی باتیں کافی ہیں وقتاً فوقتاً جو دشواریاں پیش آئیں مجھ سے صلاح مشورہ کیجیے۔ان شاءاللہ ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔

مجھے اپنی جان سے زیادہ پیارے مریدوں پر پورا اعتماد ہے کہ وہ دل و جان سے اس کام میں لگ جائیں گے اور کسی قسم کی مصیبت کو خاطر میں نہ لائیں گے اللہ تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین ثم آمین

خادم الخدام حلقۂ توحیدیہ

عبدالحکیم انصاری

ملتان، 6 مئی 1972ء

خطبہ......9

21-4-1973

کو بارہویں سالانہ اجتماع پر بمقام ملتان ارشاد فرمایا

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ............السلام علیکم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے کہ آج ہم سب بھائی ایک سال بعد پھر ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ اس سال ہمارا اجتماع پھر ملتان میں ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے سال حلقہ کے بھائیوں کو یہاں بہت ہی آرام ملا اور بہت ہی لطف آیا۔ ان میں سے میں نے جس سے بھی رائے لی کہ اجتماع اس سال کہاں ہونا چاہیئے تو بلا استثنیٰ سب نے یہی کہا کہ ملتان میں۔ علاوہ ازیں ہمارے بھائی ملک کریم بخش صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت ونعمت کے ساتھ ساتھ دل بھی نہایت کریم اور حوصلہ بھی نہایت فراخ عطا فرمایا ہے وہ خود اس بات پر مصر تھے کہ سالانہ اجتماع ملتان ہی میں ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پچھلے سال تو مجھ کو تجربہ نہ تھا۔ لیکن اس سال میں ان شاء اللہ پچھلے سال سے بھی زیادہ اچھا انتظام کروں گا اور ان شاء اللہ کسی بھائی کو کوئی بھی تکلیف نہ ہوگی۔ اندریں حالات میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم سب پھر یہیں اکٹھے ہوں۔ اس کے لیے سب سے پہلے جناب ملک کریم بخش کا اپنی اور تمام حلقہ کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس سے کہیں زیادہ دولت اور اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی محبت عطا فرمائے تا کہ وہ ایسے نیک کاموں میں جن سے امت محمد ﷺ کی اصلاح ہوتی ہے اور بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں۔ اللہ تعالیٰ ملک صاحب کو ہر قسم کی پریشانیوں اور حوادث سے محفوظ رکھے۔ آمین

اس کے بعد آپ سب بھائیوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے سو کام چھوڑ کر دیوانہ وار ملتان دوڑے چلے آئے ہیں۔ اللہ آپ سب کو اپنی بیکراں رحمت اور دینی و دنیوی نعائم سے سرفراز فرمائے' آمین۔ جو لوگ نہیں آئے ہیں ان کو معذور سمجھئے۔ کوئی ایسی ہی نا قابل حل مجبوری ہوگی کہ وہ نہ آ سکے۔ لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ ان دنوں میں ان سب کے دل ملتان ہی میں ہوں گے اور یقیناً ان سب کا حصہ ان کے پاس پہنچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان پر بھی اپنی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش

کرے اور ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ آمین

اس ایک سال کے عرصہ میں کئی برادران حلقہ کے عزیز و اقارب فوت ہوئے ہیں۔ افسوس ان کی فہرست موجود نہیں ورنہ ہم نام بنام سب کی مغفرت کی دعا کرتے۔ آیئے سب کے لیے اکٹھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے ورثاء اور اعزاء و اقرباء کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اس ضمن میں سب سے روح فرسا واقعہ ہمارے پیارے بھائی نذیر طارق کی اہلیہ کی وفات ہے' جو یکا یک اور اچانک آپریشن کی وجہ سے واقع ہوئی۔ ۲۸ اپریل کی رات وہ میرے پاس دعا کرانے آئی تھیں کہ اللہ تعالیٰ آپریشن کامیاب کرے۔ دوسرے دن صبح ۱۱ بجے آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب ہوا۔ لیکن قضائے الٰہی کو کون روک سکتا ہے۔ آپریشن کے دس گھنٹے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ مرحومہ نے سات بچے چھوڑے ہیں' جن میں سب سے چھوٹی لڑکی صرف دو ماہ کی ہے۔ یہ ہمارے بھائی نذیر طارق کے لیے بہت ہی جاں گسل اور صبر آزما واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ طارق صاحب کو حوصلہ اور ہمت عطا فرمائے اور ان بچوں کی پرورش کا اپنے رحم و کرم سے ایسا بندوبست کر دے کہ طارق صاحب کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہو اور بچے بخیر و خوبی پروان چڑھیں اور مومن و موحد بن کر دنیا میں نام پیدا کریں آمین۔ اس کے بعد آیئے مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور طارق صاحب اور ان کے والد جناب مولانا حاجی عبدالحق صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

آستانہ توحیدیہ کا قیام:

برادران حلقہ! آیئے اب ہم اس سال کی سب سے اہم اور مبارک بات یعنی آستانہ توحیدیہ کی تکمیل کے لیے خدائے برتر و اعلیٰ کا شکریہ ادا کریں۔ یہ آستانہ ہمارا مرکز ہے اور آپ جانتے ہیں کہ بغیر مرکز کے کوئی ادارہ' کوئی گورنمنٹ بلکہ خود نظام عالم بھی کام نہیں کر سکتا۔ اس تمام کائنات کا مرکز ربّ العلیٰ کا عرش عظیم ہے جس کے گرد تمام کائنات گھومتی اور گردش کرتی رہتی ہے۔ آسمانوں میں لاتعداد آفتاب ہیں اور ہر آفتاب کے ساتھ متعدد سیارے ہیں جو اس کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ یہ نظام شمسی کہلاتے ہیں۔ ہمارے آفتاب کے گرد 9 سیارے ہیں اور یہ سب ہمارا

نظام شمسی ہے۔ کرہ زمین پر ہر ملک کا دارالحکومت اس کا مرکز ہے۔ جس ملک کا مرکز جتنا مضبوط ہو وہ اسی قدر پھولتا پھلتا اور ترقی کرتا ہے۔ جس کا مرکز کمزور ہو وہ رفتہ رفتہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روحانی مراکز ہیں۔ بغداد حضرت غوث الاعظمؒ کی تعلیم کا' لاہور حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کی تعلیم کا' اجمیر حضرت معین الدین چشتیؒ کی تعلیم کا اور سرہند حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیم کے مراکز ہیں اور سب سے بڑے تو مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ ہیں جو حضور سرور کائنات فخر موجودات حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی الہامی اور خدائی تعلیم کے مرکز ہیں۔ یہیں سے توحید باری تعالیٰ کا وہ آفتاب عالم تاب طلوع ہوا جس نے ظلمت کدہ جہاں کے کونے کونے کو روشن اور منور کر دیا۔ یہی وہ مبارک شہر ہیں جہاں سے حضور رسالت مآب ﷺ کے نبوی اسوہ حسنہ' ذاتی اخلاق اور روحانی فیوض و برکات کی وہ گھنگھور گھٹائیں اٹھیں جنہوں نے انسانیت وتہذیب کے لحاظ سے بنجر و ناکارہ اقطاع عالم کو تہذیب وتمدن اور انسانیت وشرافت کے لالہ زاروں میں تبدیل کر دیا۔

جب تک ان مرکزوں سے صحیح توحید کی تعلیم ہوتی رہی دنیا میں اسلام کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا' جب سے اس تعلیم میں فرق آیا اور توحید کی جگہ پیر پرستی اور قبر پرستی نے لے لی' ملت اسلامیہ اور ممالک اسلامی کی قوت گھٹنے لگی اور آج یہ حالت ہے کہ پچیس یا چھبیس ممالک میں کوئی ایک تو کیا سب مل کر بھی کفار ومشرکین کی کسی ایک سلطنت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کل کی بات ہے کہ اکیلے اسرائیل نے متعدد عرب سلطنتوں کو شکست فاش دے کر فلسطین' اردن اور مصر کے خاصے بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور یہ سب مل کر ایک انچ زمین بھی اس سے واپس نہ لے سکے۔ ادھر بھارت نے ہم کو نہایت شرمناک شکست دے کر مشرقی پاکستان کو ہم سے علیحدہ کر دیا اور ہمارے 90 ہزار فوجی بہادروں کو قید کر لیا اور ہم آج تک سوائے چیخ و پکار کے کچھ بھی نہ کر سکے۔ 26 مارچ کے اخبارات میں سبھی نے یہ خبر پڑھی کہ اسرائیل نے خاکم بدہن مدینہ منورہ پر قبضہ کرنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ لیکن کتنی آنکھیں تھیں جو اس خبر کو پڑھ کر اشک بار ہوئیں' کتنے مسلمان تھے جو اس خبر سے متاثر ہو کر رات کو سو نہ سکے' کتنے صحافی اور اخبارات کے ایڈیٹر تھے جنہوں نے اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہا یا لکھا ہو' کتنے مولوی صاحبان اور عوام کی خیر خواہی اور اسلام پر فدا ہونے

کے جھوٹے دعویدار لیڈر رتھے جنہوں نے عوام کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے آواز اٹھائی۔ آہ! کیا ایسے بے حس مسلمانوں کو زوال پذیر قوم کہا جا سکتا ہے؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک مردہ قوم ہے جس کو مرے ہوئے بھی آج دو صدیاں گزر چکی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آخر اس بے حسی کا سبب اور اس مردنی اور مردہ دلی کی کیا وجہ ہے۔ برادران حلقہ اس کا اصل سبب اور حقیقی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے قلب و جگر میں نہ حضور اکرم رسول خداﷺ سے محبت کی حرارت ہے نہ خدائے قادر و قیوم سے عشق کی تپش۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

آخر یہ سب کچھ کیوں ہے۔ اس لیے اور محض اس لیے کہ توحید کی تعلیم غائب ہو چکی ہے اور اس کی جگہ غیر اللہ پرستی نے لے لی ہے۔ برادران حلقہ! یہ کام آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے کہ توحید کی تعلیم کو پھر زندہ کریں اور اگر تمام عالم اسلام میں نہیں تو کم از کم پاکستانی مسلمانوں کے دل میں خدا اور رسول خداﷺ کے عشق کی آگ کو اس طرح بھڑکائیں کہ غیر اللہ پرستیاں سب کی سب جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا حلقہ ابھی ایک طفل نوخیز سے زیادہ نہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا وجود میں آیا ہے اور ہم ان تمام ذرائع سے تہی دامن ہیں جو اس زمانہ میں کسی مسلک و مقصد کی ترویج و تبلیغ کے لیے ناگزیر ہیں۔ لیکن الحمدللہ کہ ہمارے حوصلے بلند ہیں اور ہم اس راہ میں اپنی جان، اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اور اپنے مال کا ایک ایک پیسہ بے دریغ صرف کرنے کو تیار ہیں۔ صرف تیار ہی نہیں بلکہ آپ نے تو عملی طور پر کر کے دکھا دیا ہے کہ آپ کے خلوص و ایثار کے آگے کوئی مشکل بھی مشکل نہیں رہ سکتی۔ دو سال بھی نہیں ہوئے کہ آستانہ کا تخیل بھی کسی کے دماغ میں نہ تھا۔ لیکن جب خیال پیدا ہوا تو چند ہی ماہ میں آپ نے تقریباً دو لاکھ روپے کی خطیر رقم اکٹھی کر کے آستانہ بنا ڈالا۔ آپ نے جس خلوص و ایثار سے کام لیا ہے میں اس سے بخوبی واقف ہوں اور کئی بھائیوں کی بابت تو یہاں تک جانتا ہوں کہ انہوں نے اپنی بیویوں کا زیور تک فروخت کر کے اس کار خیر میں حصہ لیا ہے۔ میں اس کا کیا بدلہ دے سکتا ہوں البتہ یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک

وتعالیٰ ہمارے حلقہ کے ہر بھائی کو اس دنیا میں ہر لحاظ سے سرخرو اور خوش وخرم رکھے اور آخرت میں اپنے قرب کی دولت سے فائز المرام فرمائے۔ آمین!

مصلحین کے لیے رہنما اصول:

برادران حلقہ! آپ کے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے اس کو معمولی کام نہ سمجھئے۔ یہ کام لوگوں کے **مشرکانہ عقائد کی اصلاح** کا کام ہے اور ہر انسان اپنے عقائد کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اصلاح کرنے والوں کی جان کا دشمن ہو جاتا ہے۔ قدم قدم پر مقابلہ کرتا ہے اور رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ اچھی طرح یاد رکھیے کہ آپ کو صرف عقائد ہی کی اصلاح نہیں کرنی بلکہ ان بے ہودہ و فرسودہ رسوم کو بھی مٹانا ہے جو ہمارے معاشرہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ ہوا یہ ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کو مسلمان بنانے والے علماء اور صوفیاء نے اسلامی عقائد و عبادات تو سکھا دیئے لیکن ان رسوم کو مٹانے کی مطلق کوشش نہیں کی جو ان میں کفر و جہالت کے زمانہ میں رائج تھیں اور ہزاروں خاندانوں میں آج تک جاری ہیں۔ دراصل رسوم کو مٹانا غلط مذہبی عقائد کی اصلاح سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رسوم کی والہ و شیدا اور ان کو تقدس کے درجے تک ماننے والی زیادہ تر عورتیں ہوتی ہیں۔ عورتوں کی بھاری اکثریت جاہل اور طبعاً ضدی ہوتی ہے وہ کسی طرح بھی اپنے آباؤ اجداد کی رسوم کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ ان کو سمجھانا اور ان رسوم کی برائیاں ان کے دل و دماغ میں بٹھا دینا بہت ہی مشکل کام ہے اور یہ میں نے آپ کو پہلے ہی بتا او رسکھا رکھا ہے کہ اصلاح کے کام میں زور، ظلم اور زبردستی سے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی بلکہ کامیابی خدا کے بتائے ہوئے طریقے یعنی حکمت اور حسن تدبیر و نصیحت ہی سے ہوتی ہے اور سو فیصدی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام بلکہ اچھے اور اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ حضرات بھی اس فرمودۂ خدا پر عمل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اصلاح کرنے کے لیے تو ایک اعلیٰ کردار اور مخصوص صفات رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہے۔ میں نے آپ کو انہی لائنوں پر تعلیم و تربیت دی ہے اور ہمارے حلقہ کے کافی آدمی اسی کردار کے مالک اور ان صفات اعلیٰ سے موصوف ہیں۔

اصلاح کا کام بلکہ کوئی بھی بڑا کام ہو، اس کے کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز سچی اور پر

خلوص **طلب** ہے۔طلب کے بغیر عمل کی قوت ہی پیدا نہیں ہوتی۔طلب پیدا ہونے کے لیے **علم** درکار ہے۔جب تک آپ کو علم نہیں ہوگا تو طلب کس طرح پیدا ہوسکتی ہے۔آپ کو مسلمانوں کے باطل عقائد اور جاہلانہ رسوم کی اصلاح کرنا ہے تو سب سے پہلے آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح اسلامی عقائد کیا ہیں جن کی ترویج جاہل مسلمانوں میں کرنا ہے اور یہ بات آپ کو صرف **قرآن** سے معلوم ہوسکتی ہے۔اس لیے سب سے پہلے آپ کو قرآن (ترجمہ) پڑھنا چاہیے اور پھر جب صحیح عقائد معلوم ہو جائیں تو خود اپنی اصلاح کرنا اور پھر دوسروں کی اصلاح کے لیے قدم اٹھانا چاہیے۔قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں بڑا وقت لگتا ہے اس لیے اگر کسی ایسے آدمی کا پتہ لگے جس نے قرآن کا مطالعہ کر کے صحیح عقائد معلوم کر لیے ہیں اور خود ان پر عمل پیرا بھی ہے تو پھر آپ کو اس شخص سے استفادہ کر کے اس کی پیروی کرنی چاہیے تا کہ آپ کا وقت بچ جائے اور جلد از جلد کام شروع کر سکیں۔ہادی یا مرشد کی ضرورت اسی لیے ہوتی ہے۔طلب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بہت شدید اور خلوص پر مبنی ہو۔طلب کی شدت یہ ہے کہ آپ کے دل و دماغ پر ہر وقت یہ فکر سوار رہے کہ یہ کام کرنا ہے اور اس کے سوائے دنیا کے اور سارے کام ہیچ نظر آئیں۔طلب کے لیے دوسری ضروری چیز خلوص ہے خلوص کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام اپنی ذاتی شہرت یا مالی منفعت کے لیے ہرگز نہ کریں بلکہ اس کا شائبہ بھی دماغ میں موجود نہ ہو۔جو کچھ کرنا ہو محض خدا اور رسول خدا ﷺ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے۔جب یہ سب کچھ ہو جائے تو اب **عمل** شروع ہوتا ہے۔عمل کے لیے ضروری ہے کہ پورے ذوق وشوق اور جوش وخروش سے لگا تار اور پیہم ہو اور اس میں کوئی وقفہ نہ پڑنے پائے کیوں کہ وقفے سے جوش اور ذوق میں کمی آ جاتی ہے۔اب آپ جو عمل شروع کریں تو آپ کے سامنے ہر وقت قرآن کی آیت لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى موجود رہنی چاہیے۔کہنے کو تو یہ بہت چھوٹی سی آیت ہے لیکن درحقیقت ان چند الفاظ میں اعلیٰ انسانی کردار کو بنانے کے لیے بہت بڑی حکمت اور ہدایت موجود ہے۔الفاظ کا ترجمہ ہے:''انسان کے لیے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ کوشش کیے جائے۔''ان الفاظ میں یہ بات مضمر ہے کہ **کوشش لگا تار اور پیہم ہو اور سخت ہو۔** یعنی آپ کے راستے میں کیسی ہی رکاوٹیں اور کتنی ہی دشواریاں پیش آئیں۔آپ بے

دل اور مایوس ہو کر کوشش نہ چھوڑ دیں۔ان رکاوٹوں میں سب ہی کچھ شامل ہو سکتا ہے مثلاً خانگی پریشانیاں' بے روزگاری' غربت و افلاس' طرح طرح کی بیماریاں' عزیز و اقارب کا برا سلوک' طعنے اور استہزا دشمنوں کی مخالفت اور ایذا رسانی' جسمانی تکالیف' مار ڈالنے کی دھمکیاں اور جان جانے کا خطرہ وغیرہ وغیرہ۔آپ کی صداقت' طلب اور خلوص کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئے آپ کے ارادے اور جوشِ عمل میں کمزوری واقع نہ ہو بلکہ آپ پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے قدم بڑھاتے چلے جائیں۔اگر واقعی جان جانے کا خطرہ سامنے آئے تب بھی آپ کا ایڈوانس رکنے نہ پائے۔اس وقت آپ قرآن کی اس آیت کو یاد کریں کہ "ہر فرد اور قوم کی موت کا ایک وقت مقرر ہے اور جو وقت مقرر ہو چکا ہے موت اس سے نہ تو ایک منٹ پہلے آ سکتی ہے نہ بعد میں" یہ ہے ایک انسان کامل کا کردار۔مومن اسی طرح کام کیا کرتے ہیں۔

دوسری ہدایت اس آیت میں یہ ہے کہ تمہارے لیے صرف کوشش ہے۔نتیجہ پر تم کو کوئی اختیار نہیں۔وہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔مطلب یہ ہے کہ تم لگاتار کوشش کرتے رہو لیکن یہ کبھی بھی خیال نہ کرو کہ نتیجہ بھی وہی نکلے گا جو تم چاہتے ہو۔اس لیے اگر چہ نتیجہ تمہاری مرضی کے مطابق نکلے تو سبحان اللہ۔خدا کا شکر ادا کرو لیکن اگر نتیجہ تمہاری مرضی کے خلاف نکلے تو بے دل مت ہو' حوصلہ مت ہارو' پھر کوشش کرو اس وقت تم کو قرآن کی اس آیت کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس میں خدا نے فرمایا ہے کہ "تم ایک چیز کو اپنے لیے پسند کرتے ہو لیکن خدا اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کرتا۔" اس لیے اگر وہ چیز تم کو نہ ملے یا وہ مقصد پورا نہ ہو تو یوں سمجھو کہ اگر وہ چیز تم کو مل جاتی تو یقیناً نقصان رساں اور تکلیف دہ ہوتی۔اس پر بھی شکر ادا کرو کہ اللہ نے تم پر بڑا فضل کیا کہ ایک بڑی تکلیف و پریشانی سے بچا لیا۔

رجائیت اور قنوطیت:

برادرانِ حلقہ! مجھے خود اپنی زندگی میں کئی مرتبہ ایسے مواقع پیش آئے کہ میں نے ایک دعا مانگی اور وہ قبول ہو گئی لیکن یہ میرے لیے نہایت نقصان دہ اور باعث پریشانی ہوا۔اور میرا پچھلا ماضی کا کیا کرایا سب تباہ و برباد ہو گیا۔ویسے بھی قرآن میں ہے کہ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو۔

درحقیقت یہ ہے وہ حقیقی رجائیت (Optimism) کی تعلیم جو قرآن مسلمانوں کو دے رہا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے تو قرآن کو گلدستہ طاق نسیاں بنا دیا ہے۔ اسے کوئی دیکھتا تک تو ہے نہیں، تعلیم پر عمل تو بہت دور کی بات ہے۔ زیادہ تر لوگ صرف عربی عبارت پڑھتے ہیں پھر اسے چوم کر رکھ دیتے ہیں۔ ان غریبوں کو کیا معلوم کہ اس میں زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنانے کے کیسے کیسے نادر خزانے بھرے پڑے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہم یوں غافل پڑے ہیں اور دوسری اقوام انہی خزانوں کے تصرف سے ساری دنیا پر غالب آ گئی ہیں اور اب آسمانوں کو فتح کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اگر کسی مسلمان سے سائنسی اکتشافات اور نئی نئی حقیقتوں کی دریافت کا ذکر کیا جائے تو یہ بڑے فخر سے گردن اکڑا کر کہہ دیتا ہے کہ "یہ تو ہمارے قرآن میں بھی ہے۔" یہ اتنا نہیں سوچتا کہ "ہے"، "تو تجھ کو کیا"۔ "پدرم سلطان بود" فائدے تو نا مسلم اٹھا رہے ہیں اور تم اسی طرح لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے پر مگن ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

میں نے ابھی جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو رجائی (Optomist) بننا چاہیے یعنی ہر حالت میں خوش اور پر امید رہنا چاہیے، بے حوصلگی اور مایوسی کو قریب بھی نہ آنے دینا چاہیے۔ اسی ضمن میں رجائیت اور قنوطیت کے متعلق میں آپ کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو عوام کو تو کیا خواص میں سے بھی شاذ و نادر ہی کسی کو معلوم ہوگی۔ سائنس دانوں کی تازہ دریافت یہ ہے کہ انسان کے جسم سے ہر وقت لہریں نکل کر فضا میں منتشر ہوتی رہتی ہیں اور انہی لہروں کے ذریعہ ایک انسان اپنے خیالات دوسرے کے ذہن میں ڈال سکتا اور دور دراز کے مقامات تک اپنے دوستوں کو پیغام بھیج سکتا ہے اسی کو وہ Transformation of thoughts (انتقال خیالات) اور ٹیلی پیتھی کہتے ہیں اور یہ اشغال آج یورپ کے بے شمار لوگ کر رہے ہیں۔ مسمریزم اور ہپناٹزم کی پریکٹس بھی انہی لہروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی عامل انہی لہروں کے ذریعہ اپنے خیال کو معمول کے دماغ تک پہنچا کر اس کو نوم مقناطیسی میں مبتلا کر دیتا اور پھر اس کے دلی حالات معلوم کر لیتا ہے۔ ہپناٹزم کے ذریعہ صرف خیالات کی طاقت سے بہت سے امراض کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔ یہ علاج روحانی کے نام سے مشہور ہے اور یورپ میں اب عام ہوتا جا رہا ہے۔

علیین اور سجین:

سائنس دانوں کو ابھی ان لہروں کا اتنا ہی علم حاصل ہوا ہے۔لیکن صوفی خصوصاً عارف اس بات کو ہمیشہ سے جانتے ہیں اور وہ ان لہروں کو اپنے مریدوں کے خیالات و اعمال بدل کر اصلاح کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں وہ لہروں یا شعاؤں کے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔لیکن وہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ انسان کے الفاظ اور خیالات جو منہ سے نکلتے ہیں یا دماغ میں آتے ہیں وہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ہمیشہ اوپر چڑھتے رہتے ہیں اور عرش عظیم تک جا پہنچتے ہیں۔یہ بات ہم کو آج سے چودہ سو برس پہلے قرآن حکیم نے بتائی تھی' چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر:10) یعنی "اللہ کی طرف چڑھتے ہیں کلمات پاکیزہ اور نیک عمل بلند کرتا ہے عامل کے مرتبہ کو۔" بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں جو خیالات آتے ہیں یا ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ لہروں کی شکل میں منتقل ہو کر اگر نیک ہوں تو عرش عظیم تک چڑھتے ہیں اور عِلِّيِّيْنَ میں ہر شخص کی اپنی پرسنل فائل میں لکھ دیئے جاتے ہیں وہ الفاظ اگر نیک نہ ہوں تو نیچے کی طرف نزول کرتے ہیں اور سِجِّيْنَ میں ریکارڈ کر دیئے جاتے ہیں۔الفاظ اور خیالات کی طرح نیک اور بد اعمال جو اوپر چڑھتے یا نیچے کی طرف نزول کرتے ہیں ان کی تصاویر لی جاتی ہیں اور قیامت کے دن ہر شخص کو دکھائی جائیں گی۔قرآن حکیم میں ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ☆ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ☆ (زلزال: 8،7) یعنی "مثقال برابر نیکی ہو یا بدی قیامت کے دن تم کو سب کی تصویریں دکھائی جائیں گی۔" الغرض یہ ہے ان لہروں کا کام اور مستقر۔حدیث شریف میں ہے کہ ہر انسان کے داہنے اور بائیں کندھے پر ایک ایک فرشتہ رہتا ہے۔داہنے والا اس کے نیک عمل اور بائیں والا اس کے برے عمل لکھتا رہتا ہے۔ان کو کراماً کاتبین کہتے ہیں ایک دوسری حدیث میں ہے کہ یہ کراماً کاتبین صرف ایک دن کام کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور پھر قیامت تک کبھی نہیں آئیں گے۔اس طرح ہر روز نئے فرشتے آتے اور کام کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔میرا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں حضور اکرم a نے ان لہروں کو فرشتہ کہا اور در حقیقت یہ ہیں بھی فرشتے۔لاکھوں قسم کے فرشتے

ہیں جو کائنات میں اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں ۔فرشتہ کیا ہے؟ درحقیقت فرشتے خدا کے ایجنٹ ہیں جو خدا کی دی ہوئی طاقت سے اپنا اپنا مقررہ کام کرتے رہتے ہیں ۔اللہ اکبر کیا نظام اور کیا اعلیٰ انتظام ہے ۔علیین اور سجین کتنے بڑے ریکارڈ آفس ہیں جہاں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک ہر پیدا ہونے والے انسان کے رتی رتی خیالات' الفاظ اور اعمال کا ریکارڈ محفوظ رہتا ہے ۔سائنس دان بے چارہ کیا بتائے گا جو خدائے علیم وحکیم نے قرآن میں ہم کو بتادیا اور حکم دیا کہ ہماری آیتوں پر غور کیا کرو ۔لیکن افسوس کہ ہم قرآن کو ہاتھ تک نہیں لگاتے' پڑھنا اور غور کرنا تو بہت دور کی بات ہے ۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان لہروں کا ماخذ اور ٹرانسمیٹر انسان کا قلب ہے ۔جس آدمی کا قلب نیکی' پارسائی اور خدا کے ساتھ قلبی تعلق کی وجہ سے طاقت ور ہوتا ہے' جو قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہمیشہ خوش رہتا ہے نہ کسی سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے' جو بڑے سے بڑے صدمہ کا اپنے قلب پر اثر نہیں ہونے دیتا اور جو کبھی رنجیدہ اور مایوس نہیں ہوتا مختصراً یہ کہ جو رجائی یا آپٹو مسٹ ہوتا ہے اس کی یہ لہریں نہایت طاقت ور اور تیز رفتار ہوتی ہیں ۔ایسا آدمی جب اپنے دل میں کسی دوسرے شخص کے متعلق خیال کرے کہ وہ فلاں فلاں کام کرے اور فلاں فلاں باتیں چھوڑ دے تو اس کا خیال لہروں کے ذریعہ فوراً مرسل الیہ کے دماغ تک پہنچتا ہے اور اس کے خیالات کو بدل دیتا ہے اور وہ وہی کچھ کرنے لگتا ہے جو لہریں بھیجنے والا چاہتا ہے ۔مثلاً اگر کسی دفتر کا کوئی ادنیٰ ترین چپڑاسی یہ چاہے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب اپنے پاس آنے والے اہل معاملہ پہ غصہ نہ ہوں یا گالیاں نہ دیں تو یقیناً ڈپٹی کمشنر صاحب کا دماغ بدل جائے گا اور وہ اہل معاملہ سے نہایت شرافت اور خوش اخلاقی سے پیش آنے لگیں گے یا مثلاً ایک مکمل پیر یہ چاہے کہ اس کا فلاں مرید غصہ' نفرت' جھوٹ اور شراب چھوڑ دے تو یقیناً مرید کی یہ بد عادتیں دور ہو جائیں گی ۔ان لہروں کے لیے فاصلہ کوئی چیز نہیں ہے ۔مرسل الیہ سامنے بیٹھا ہو یا ہزاروں میل کے فاصلہ پر انگلینڈ یا امریکہ میں ہو برابر اثر کرتی ہیں البتہ پیر صاحب کے قلب کی طاقت اس کے لیے ضروری ہے ۔جتنی طاقت پیر صاحب کے قلب میں ہوگی اتنی ہی دور تک اور اتنی ہی جلدی اصلاح ہو جائے گی اسی کو توجہ کہتے

ہیں ۔توجہ دینے والے پیر تین طرح کے ہوتے ہیں ۔ایک وہ جو مرید کو صرف سامنے بٹھا کر توجہ دے سکتے ہیں یہ **کامل** کہلاتے ہیں' دوسرے وہ جو دو سو چار سو میل تک توجہ دے سکتے ہیں وہ **اکمل** کہلاتے ہیں' تیسرے وہ جن کے لیے فاصلہ کوئی چیز نہیں ۔کرہ زمین پر جہاں بھی ان کا مرید ہو اس تک توجہ پہنچ جاتی ہے یہ **مکمل** کہلاتے ہیں ۔رجائی کا بیان ہم کر چکے ہیں اب رہ گئے قنوطی تو چونکہ ہر وقت رنج والم اور رحمت خدا سے مایوسی کی وجہ سے ان کا قلب نہایت کمزور رہتا ہے اس لیے ان کی لہریں بھی کمزور رہتی ہیں اور کسی کے دماغ پر اثر نہیں کر سکتیں ۔ان کو نہ کوئی عزیز رکھتا ہے نہ ان کا کہنا مانتا ہے وہ ہمیشہ پریشان اور ناکام و نامراد رہتے ہیں ۔برادران حلقہ! میں نے آپ کے سامنے ایک ایسا راز فاش کر دیا ہے جو اس سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا اب آپ کی مرضی ہے کہ رجائی بن کر خوشی' خوشحالی اور کامیابی کی زندگی بسر کریں یا قنوطی بن کر ناکام و نامراد مر جائیں ۔

قوتِ برداشت:

مصلحین کے لیے قوت برداشت کی بھی بڑی ضرورت ہے اس کے بغیر اصلاح کے میدان میں ایک قدم بھی آگے بڑھنا ممکن نہیں ۔عجب بات تو یہ ہے کہ جس کی آپ اصلاح کرنا چاہیں وہ ہی آپ کا دشمن ہو جاتا ہے ۔یہ بالکل وہی بات ہے کہ ایک شخص گندگی اور غلاظت میں لوٹ رہا ہے اس کو آپ وہاں سے نکال کر تازہ اور پاک پانی سے غسل کراتا' اچھے کپڑے پہنانا اور ان کو عطر سے بسانا چاہتے ہیں ۔تو وہی آپ سے لڑنے لگتا ہے ۔پاک صاف رہنا برا سمجھتا ہے اور اسی غلاظت میں لوٹتے رہنا پسند کرتا ہے ۔اصلاح کرنے والوں کی قدم قدم پر مزاحمت کی جاتی ہے ۔ ان کو گالیاں دی جاتی ہیں ان کا مقاطعہ کیا جاتا ہے' مارا پیٹا جاتا ہے اور کیا کچھ تکلیف نہیں دی جاتی ۔اگر اصلاح کرنے والا پہلے ہی مقابلہ میں بے حوصلہ ہو جائے' ڈر جائے یا اس کو غصہ آ جائے تو قیامت تک اصلاح کا کام نہ کر سکے گا ۔سرور دو عالم ﷺ کی شروع کی 13 سال کی زندگی جو مکہ معظمہ میں گزری اس کا ایک ایک دن ہمارے سامنے ہے جب سے حضور اکرم ﷺ نے اعلائے کلمۃ اللہ کا کام شروع کیا اسی دن سے مخالفت شروع ہو گئی سب سے زیادہ دشمن آپ ﷺ کے عزیز واقارب ہی تھے ۔رفتہ رفتہ تمام مکہ دشمن ہو گیا ۔کون سی اذیت تھی جو آنحضرت ﷺ کو نہیں دی گئی ۔

گالیاں دی جاتی تھیں' تھپڑ' مکے اور پتھر مارے جاتے تھے۔ راستہ میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ آپﷺ کے جسم اطہر پر غلاظت اور گندگی پھینکی جاتی تھی۔ ایک دفعہ آپﷺ سجدے میں تھے آپﷺ کے سر پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی جو اتنی وزنی تھی کہ آپﷺ سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ آپﷺ کو بھوکا مارنے کی تدبیریں کی گئیں۔ آپﷺ کا مقاطعہ کیا گیا اور آخر میں آپﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی گئی اور رات کے وقت آپﷺ کے مکان پر حملہ کیا گیا۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپﷺ کو پہلے ہی بذریعہ وحی خبردار کر دیا تھا اور آپﷺ صاف بچ کر نکل گئے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن کیا کبھی حضور اکرمﷺ کے پائے ثبات میں لغزش آئی؟ کیا آپﷺ نے ایک دن بھی تبلیغ دین متین کا کام بند کیا؟ علاوہ ازیں کیا آپﷺ نے کبھی گالی کے بدلے گالی دی؟ یا پتھر کے بدلے پتھر مارا یا کسی کو بددعا دی؟ بالکل نہیں قطعاً نہیں ہرگز نہیں۔ سب سے عجیب تر بات تو یہ ہے کہ اگر چہ زیادتی کے بدلے زیادتی نہ کرنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے مگر یہ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ سمجھ سے بالاتر بات تو یہ ہے کہ حضور اکرمﷺ کے دل میں بھی کبھی اپنے دشمنوں کی طرف سے برائی پیدا نہیں ہوئی' ورنہ وہ دہ ہیں اور اسی وقت تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ آج آنحضرتﷺ کے غلاموں کے غلام ایسے ہیں کہ ان کے دل میں اگر کسی کے لیے برائی آ جائے تو اس کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ یہ ہمت اور یہ برداشت انبیاءj کے لیے ممکن ہے۔ دوسرے کے بس کی بات نہیں۔

اس لیے جب تک قوت برداشت پیدا نہ ہو جائے اصلاح کے لیے قدم نہیں بڑھانا چاہیے اور یہ قوت برداشت ہمارے حلقہ کی تعلیم کے مطابق صرف ان لوگوں میں پیدا ہو سکتی ہے جو غصہ کو فنی کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غصہ سے عقل جاتی رہتی ہے اور جب عقل ہی نہ رہے تو آدمی جو بھی کام کرتا ہے الٹا ہی کرتا ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اگر دو آدمی شطرنج کھیلتے ہوں اور ان میں سے ایک کو غصہ دلا دیا جائے تو بازی پر بازی ہارتا چلا جاتا ہے یا جب عدالت میں بحث کرتے ہوئے کسی وکیل کو غصہ دلایا جائے تو وہ بجائے باقاعدہ اور مدلل بحث کرنے کے الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا ہے اور مقدمہ ہار جاتا ہے' میدان جنگ میں اگر جنرل کو غصہ آ جائے یا وہ دشمن کی سخت گولہ باری یا اچانک حملے سے گھبرا جائے تو لڑائی ہار جائے گا۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے سیاست دان'

سائنس دان اور مشہور جرنیل گزرے ہیں سبھی نہایت حلیم اور بردبار تھے۔فریق مخالف ان کے خلاف کچھ ہی کیوں نہ کہتے ان کو غصہ نہ آتا تھا۔

نیوٹن کی بابت مشہور ہے کہ وہ کوئی بہت ہی اہم کتاب لکھ رہا تھا اس زمانے میں بجلی نہ تھی میز پر مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔نیوٹن تھوڑی دیر کے لیے کہیں گیا۔اس کے پیچھے اس کا کتا چھلانگ مار کر میز پر چڑھ گیا اس کے چڑھنے سے لیمپ ٹوٹ گیا اور سارے کاغذات جو لکھے تھے جل کر راکھ ہوگئے۔نیوٹن جب واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ برسوں کی محنت ضائع ہوگئی۔ لیکن اس کے ابرو پر بل بھی نہ آیا۔کہا تو اتنا کہا کہ "پیارے جیک تم کو معلوم نہیں یہ تو نے کیا کر دیا۔" یہاں یہ حال ہے کہ آپ کا نوکر یا کوئی معصوم چھوٹا سا بچہ بھی آپ کا شیشہ یا رکابی توڑ دے تو آپ اس کو مارتے مارتے بے حال کر دیتے ہیں۔"معمولی معمولی باتوں پر چاقو چل جاتے ہیں' لوگ قتل کر دیئے جاتے ہیں۔اخبارات میں ایسے دو چار واقعات روز ہی آتے ہیں۔کیا آپ کی قوم اس قابل ہے کہ کبھی متحد ہو سکے یا کوئی بڑا کام کر سکے۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی سوانح عمری میں پڑھا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں جب انگریزوں نے گیلی پولی میں ترکوں پر حملہ کیا تو اتاترک کا چھوٹا سا خیمہ ایک پہاڑی پر نصب تھا اور وہیں سے وہ اپنی فوج کو لڑا رہا تھا۔جب دشمن کی گولہ باری نے زور پکڑا اور گولے اس کے خیمہ سے دس بیس گز کے فاصلہ پر گرنے لگے تو ماتحت افسروں نے ہزار کہا کہ خیمہ پیچھے ہٹا کر لگا دیں مگر وہ بہادر سپاہی ذرا بھی ہراساں نہ ہوا۔اسی جگہ بیٹھا فوج کو لڑاتا رہا یہاں تک کہ انگریزوں کو دنیا کی سب سے بری شکست فاش کھانی پڑی اور اتاترک نے دنیا سے اپنا لوہا منوایا۔یہ سب کرشمہ قوت برداشت کا نہ تھا تو کیا تھا۔

برادران سلسلہ! آپ کو اصلاح کا کام کرنا ہے اس لیے اپنے حلقہ کی تعلیم کے مطابق غصہ بالکل نفی کر دو۔قلب میں پاس انفاس کے ذریعہ روحانی طاقت کو بڑھاؤ پھر دیکھو کہ تم کتنی جلدی کامیاب ہوتے ہو۔

زبان پر قابو:

اصلاح کرنے والوں میں ایک اور صفت ہونا بھی ضروری ہے اور وہ ہے ''زبان پر قابو'' زبان کے دو کام ہیں کھانا اور بولنا۔ کھاتے وقت زبان پر قابو یہ ہے کہ حرام چیز نہ کھاؤ۔ اس سے تمہارا قلب مسخ اور تمہاری روحانی طاقت ختم ہو جائے گی۔ زبان کا دوسرا کام بولنا ہے اور یہی بولنا اصلاح کے لیے گفتگو کرتے وقت ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ ''اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور حسین الفاظ میں نصیحت کر کے بلاؤ۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی تم اصلاح کرنا چاہتے ہو اس کو اس کے کسی عیب کی وجہ سے ہرگز برا بھلا نہ کہو۔ مثلاً کوئی شرابی شراب پیے ہوئے تمہارے پاس آئے وہ نشے میں ہو اور اس کے منہ سے بدبو آ رہی ہو تو یوں مت کہو کہ ملعون، مردود، فاسق، فاجر شراب پیتا ہے۔ چھوڑ اس بدعادت کو تو دوزخ کا ایندھن بنے گا۔ ایسا کہنے سے وہ بہت برا مانے گا اور آئندہ تم سے کبھی بات بھی نہ کرے گا پھر تم اس کی اصلاح کس طرح کر سکو گے اس لیے ایسے موقع پر اس طرح برداشت کرو جیسے کہ کوئی بات ہی نہیں۔ اس سے محبت و شفقت سے پیش آؤ اور کوشش کرو کہ وہ تمہارا دوست بن جائے اور بار بار تمہارے پاس آنے لگے پھر کسی دن جب اس کے ساتھ اور آدمی بھی موجود ہوں اور تمہاری روحانی کیفیت بھی اچھی ہو تو اس کی طرف مخاطب بھی مت ہو۔ ایسے بن جاؤ کہ گویا تم جانتے ہی نہیں کہ وہ شراب پیتا ہے پھر دوسرے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر شراب کی برائیاں بیان کرو اور اللہ و رسول کا حکم شراب کی حرمت کے متعلق لوگوں کو سناؤ۔ اس ان ڈائریکٹ تقریر اور نصیحت کا اثر اس پر یقیناً اور شرطیہ ہو گا اور اگر پہلی ہی مرتبہ نہیں تو کم از کم دو چار مرتبہ تمہاری نصیحت سننے کے بعد شراب سے توبہ کر لے گا۔

یہ ہے وہ حسین زبان اور یہ ہے وہ حکمت جو ایسے موقع پر تم کو برتنی چاہیے۔ اس کے علاوہ اصلاح کے لیے کبھی کسی پر کسی قسم کا اعتراض نہ کرو۔ اس کا ہر عیب اور ہر زیادتی برداشت کرو۔ بحث ہرگز ہرگز کبھی نہ کرو بحث سے سوائے تضیع اوقات کے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یوں دلوں میں کدورت آ جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص بحث کرنے پر بہت ہی مصر ہو تو جیسا کہ میں پہلے بھی کسی خطبہ میں بتا چکا ہوں، اس سے نہایت عاجزی سے معافی مانگو اور کہہ دو کہ ''ہمارے مسلک میں بحث قطعاً منع ہے۔ آپ اپنے مسلک پر چلتے رہیں ہم خوش ہمارا خدا خوش، لیکن ہم کو ہمارے مسلک پر چلنے

دو۔ آؤ باوجود ازیں ہم آپس میں دوست رہیں۔ یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ اس کے لیے دلوں میں عناد کیوں پیدا کیا جائے۔'' مگر یہ تم اسی وقت کہہ اور کر سکو گے۔ جب کہ تم نے غصہ اچھی طرح نفی کر دیا ہو اور قوت برداشت بدرجہ اتم پیدا ہو گئی ہو۔

ہمارے حلقہ کی تعلیم کے مطابق اصلاح کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ تم لوگوں سے نہایت **محبت اور خلوص** سے پیش آؤ۔ ظاہری اور بناوٹی محبت نہیں۔ حقیقی محبت کرو جیسا کہ تم کو بتایا اور سکھایا گیا ہے۔ **عالمگیر محبت** کو اپنا شعار بناؤ' اس لیے جس سے بھی ملو حقیقی محبت کے جذبے سے ملو۔ اگر کبھی ضرورت پڑے اور تم کو توفیق ہو تو چھوٹی موٹی کوئی خدمت لوگوں کی کر دیا کرو اور دل میں یہ خواہش پیدا کرو کہ اس شخص کی اصلاح ہو جائے۔ اگر تم دل سے ایسا چاہو گے تو تمہارے قلب سے جو لہریں نکلیں گی اس کے دماغ کو متاثر کیے بغیر نہ رہیں گی (جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے) وہ رفتہ رفتہ تمہاری ہر بات ماننے لگے گا اور اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اصلاح ہمیشہ خدا کے واسطے کرنی چاہیے تمہاری اپنی ذاتی غرض اس سے وابستہ نہ ہو۔

اچھا اب میں تم سب کو اللہ کے حفظ و امان میں دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ تم سب اللہ کے مقبول بندے بن جاؤ۔ اب پیارے برادران سلسلہ تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے آستانہ سے محبت کرو۔ اس کے استحکام اور سر بلندی کے لیے کوشاں رہو۔ اگر تم سب ایسا کرو گے تو یاد رکھو کہ ان شاء اللہ اسی آستانہ سے توحید کے آفتاب عالم تاب کی روشنی پھوٹے گی جو پاکستان کے چپہ چپہ کو توحیدی یعنی مومن اور محسن بنا دے گی۔

خادم الخدام حلقہ توحیدیہ

عبد الحکیم انصاری

ملتان، 21 اپریل 1973ء

خطبہ......10

20-4-1974

کو تیرہویں سالانہ اجتماع پر بمقام لاہور بانیٔ سلسلہؒ کے حکم پر قبلہ محمد صدیق ڈارؒ نے پڑھا

نحمدہ و نصلی علٰی رسولہ الکریم

عزیزان سلسلہ و معزز حاضرین! السلام علیکم

اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر کس زبان اور کس منہ سے ادا کیا جائے جس نے اپنی عنایات بے پایاں سے ہم کو پھر ایک جگہ اکٹھے ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں آپ سب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خوش آمدید کہتا ہوں کہ آپ اپنے ذاتی کاموں کو چھوڑ کر محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس مقدس اجتماع میں شریک ہوئے ہیں۔

میں اس پر مسرت موقع پر اپنے تمام برادران حلقہ توحیدیہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اس سال کا یہ مبارک اجتماع آپ کے خلوص اور حلقہ کے ساتھ بے پناہ محبت کے اس جیتے جاگتے نمونہ ''آستانہ توحیدیہ'' میں منعقد ہو رہا ہے۔

برادران حلقہ! یہ ہمارا تیرھواں سالانہ اجتماع ہے۔ اس سے قبل بارہ اجتماعات کے انفرادی مصارف کی سعادت مختلف اوقات میں عزیزان چوہدری جلال الدین صاحب' میاں محمد علی صاحب اور ملک کریم بخش صاحب کے حصے میں آتی رہی ہے۔ ان تینوں حضرات نے ہر اجتماع میں اہل حلقہ کی جس خلوص اور محبت سے خدمت کی وہ ہم سب پر عیاں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان صاحبان کو اس سے بھی کہیں زیادہ دولت' عزت اور اپنی اور اپنے رسول مقبول ﷺ کی محبت عطا فرمائے تاکہ وہ ایسے نیک کاموں میں جن سے امت محمدیہ کی اصلاح ہوتی ہے اور بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں۔ (آمین)

گزشتہ اجتماعات کے انفرادی شوق اور سعادت مندی کے پیش نظر اس سال کے اجتماع کے لیے بھی عزیزم ملک کریم بخش صاحب کی پر خلوص دعوت تھی کہ اس سال کا اجتماع بھی ملتان میں ہی منعقد کیا جائے۔ لیکن اکثر بھائیوں کی اس تجویز کو ملک صاحب موصوف نے بخوشی قبول کر لیا کہ آستانہ شریف کی تعمیر کے پہلے مبارک سال کا اجتماع مشترکہ مصارف سے لاہور میں ہی منعقد کیا جائے تاکہ تمام بھائیوں کی دیرینہ تمنا پوری ہونے پر اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کا شکریہ ادا کیا

جائے کہ جس نے ہمارے مرکز کی دوامی حیثیت قائم کر دی۔ میں ملک صاحب اور تمام بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اللہ آپ سب کو جزائے خیر دے۔ ثم آمین۔ میں یقین کے ساتھ امید رکھتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی اپنی یادگار "آستانہ توحیدیہ" کے ساتھ والہانہ محبت کے جذبہ کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنے کی مسلسل کوشش جاری رکھیں گے۔ دل کی گہرائیوں سے میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

عزیزان گرامی! اس خوشی کے موقع پر میں آپ کو چند اندوہناک خبریں بھی سنانا چاہتا ہوں جو اس سال وقوع پذیر ہوئیں۔ پہلی المناک خبر تو حلقہ پشاور کے بہت ہی پیارے بھائی اور ایک عظیم انسان لالہ سلطان احمد کی ہے جو رمضان شریف سے چند روز قبل آٹھ دس چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مرحوم بہت خوبیوں کے مالک تھے اور حلقہ کے بھائیوں سے بے انتہا پریم و محبت رکھتے اور بہت خدمت کرتے تھے۔ دوسری روح فرسا خبر بھکر کے ماسٹر رانا عبدالستار صاحب کی ہے جنہوں نے گزشتہ 13 دسمبر کی رات داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی موت کا واقعہ ان کے والد صاحب کی اطلاع کے مطابق یہ ہے کہ آخر وقت تک ذکر پاس انفاس اور نفی اثبات میں مشغول رہے اور ایک سچے مومن اور توحیدی شان و شوکت کے ساتھ اپنی جان کی امانت جان کے مالک کے حوالے کر دی۔ ایسی مسکراتی موت پر جس قدر بھی رشک کیا جائے کم ہے۔ تیسرا جواں مرگ حادثہ ہمارے محترم بھائی چوہدری جلال الدین صاحب کے سب سے چھوٹے جواں سال صاحبزادے سلطان احمد کو پیش آیا۔ مرحوم تقریباً ایک سال تک صاحب فراش رہے۔ مگر زندگی نے ان سے وفا نہ کی۔ مرحوم سلطان احمد نوشہرہ ورکاں کے اجتماعات میں حلقہ کے بھائیوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتے اور بے پناہ محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کا جذبہ رکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایسے دردناک حالات میں صبر کا دامن عموماً چھوٹ جایا کرتا ہے۔ لیکن صد رحمت ہو بابا جلال الدین پر جس نے مشیت ایزدی کے سامنے سرنگوں کر لیا اور بڑھاپے کے

باوجوداس صدمہ کی ضرب کو جوانوں سے کہیں زیادہ برداشت کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس صبر کے عوض میں چوہدری صاحب کو سکون اور اجرِ عظیم بخشے آمین۔

ہمارے حلقہ میں موجودہ سال کے دوران نہ صرف اتنے ہی دردناک واقعات پیش آئے بلکہ ان کے علاوہ بھی حلقہ کے بھائیوں کے عزیز واقارب کی اموات واقع ہوئی ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر مرنے والوں کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے دعائے صبر وسکون مانگیں۔

اب ہم اپنے خطبہ کے موضوع تصوف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تصوف وحکمت:

تصوف اسلام ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر مذہب میں موجود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام مذاہب کسی نہ کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کو مانتے ہیں جو نہ تو حواس ظاہری سے معلوم ہوسکتی ہے نہ عقل ہی سے سمجھ آسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان طبعاً متجسس واقع ہوا ہے وہ بجاطور پر جاننا چاہتا ہے کہ میں جس کی پرستش کرتا ہوں، جس نے مجھے پیدا کیا ہے، جو مجھے رزق دیتا ہے، جس کے ہاتھ میں میرا بھلا اور برا ہے اور جو مجھے موت دے گا اور موت کے بعد بھی میرے ساتھ رہے گا اور اس دنیا میں میں نے جو برے بھلے عمل کیے ہیں ان کی جزا اور سزا دے گا آخر وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس سے ملنے کا راستہ کون سا ہے؟ اس کی خوشنودی اور اس کا قرب، معرفت اور دیدار کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ تو اب آپ غور کریں کہ کیا اس شخص کی یہ خواہش ناجائز اور اس خواہش کی تکمیل ناممکن ہے؟ ہرگز نہیں!!

خدا نے انسان کی فطرت میں بہت سی خواہشیں رکھی ہیں اور ساتھ ہی ہر خواہش کی تکمیل کا سامان بھی مہیا کیا ہے مثلاً بھوک پیدا کی ہے تو کھانے کی ہزاروں چیزیں بنائی ہیں۔ پیاس پیدا کی ہے تو سینکڑوں مشروبات بنائے ہیں۔ جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے کروڑوں مرد اور عورتیں پیدا کیں۔ سیر وسیاحت کی خواہش ہو تو خدا کی زمین فراخ ہے، ساری عمر سیاحت کرتے رہو۔ علم حاصل کرنے کی خواہش ہو تو سینکڑوں علم پیدا کیے ہیں جس علم کو چاہو اس کے حصول میں عمر گزار دو

دولت کی خواہش ہوتو وہ طور طریقے سیکھو جن میں دولت کے حصول کی صلاحیت ہے ان پر عمل کرو اور دولت مند بن جاؤ۔

جب یہ ایک کلیہ اور مسلمہ ہے کہ خدا نے ہر خواہش کی تکمیل کا پورا بندوبست کیا ہوا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اندریں صورت کیا خدا کی معرفت اور قرب و دیدار کی خواہش ہی ایک ایسی خواہش ہے جس کی تکمیل کا خدا نے کوئی بندوبست نہیں کیا؟ ناممکن ہے کہ نہ کیا ہو۔ ایسا تو خیال کرنا بھی خدا کے عدل و انصاف اور اس کی شان ربوبیت کا انکار کرنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہے) تو پھر خدا نے اپنے ملنے کے کون سے طریقے اور قاعدے بتائے ہیں کہ طالب دیدار خدا ان طریقوں اور قاعدوں پر عمل کر کے فائز المرام ہو سکے۔ تو حاضرین کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مذہب جو کسی ان دیکھی طاقت کی پرستش کرتا ہے اس میں اپنے معبود کی معرفت حاصل کرنے یا اس سے ملنے کے الگ الگ طریقے ہیں مثلاً چینی پیغمبر کنفیوشس نے جو طریقے بتائے ہیں وہ ان طریقوں سے مختلف نہیں جو ہندوؤں کے رشیوں منیوں نے بتائے ہیں یا عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کو ان کے پیغمبروں نے سکھائے ہیں۔ یہی طریقے اور قاعدے بہ حیثیت مجموعی ان مذاہب کا تصوف کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی خدا نے اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہیں رکھا اور قرآن میں اپنے ملنے کے طریقے بیان کر دیے ہیں۔ یہ طریقے تعداد میں اس قدر کم مگر اتنے سریع التاثیر ہیں کہ عقل حیران ہوتی ہے۔ جو لوگ سالہا سال دلائل الخیرات، دعائے گنج العرش، دعائے ماثورہ، دعائے جمیلہ، حزب البحر، قصیدہ بردہ اور قصیدہ غوثیہ وغیرہ کا ورد، طرح طرح کے مراقبے، چلے اور سخت سے سخت ریاضتیں کرنے کے بعد بھی حصول مقصد میں نامراد رہتے ہیں، ان قرآنی طریقوں پر صرف دو تین سال عمل کرنے کے بعد وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرا تھا اور ان کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ ہم سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور ضرور اپنی مراد کو پہنچیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان طریقوں کو "تصوف" نہیں کہا بلکہ "حکمت" فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (البقرۃ:151)

""یعنی ہم نے تم ہی لوگوں میں سے تمہارے پاس ایک رسول بھیجا ہے جو تم کو ہماری آیات (قرآنی) پڑھ کر سناتا ہے' تمہارے اخلاق کا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب (قرآن) اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

اب سوال یہ ہے کہ قرآن میں معیشت' معاشرت' سیاست' اخلاق اور قانون کی جو تعلیم دی گئی وہ تو احادیث' فقہ اور اسلامی قانون کی شکل میں اب بھی موجود ہے گو اس پر اکثر اسلامی ملکوں میں عمل نہ ہوتا ہو۔ مگر وہ حکمت کہاں ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ کیا علمائے کرام کے پاس ہے یا صوفیائے عظام کے۔ افسوس ہے کہ وہ گم ہو چکی۔ مسلمانوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

حکمت کا لفظ عام طور پر فلسفہ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی واسطے سقراط اور بقراط اور افلاطون وغیرہ کو حکیم کہتے ہیں۔ لیکن قرآن میں حکمت سے مراد فلسفہ نہیں بلکہ **علم الحقائق اشیاء** ہے کیوں کہ یہ بات مشاہدے سے ثابت ہو چکی ہے کہ فلاسفروں کے دو گروہ ہیں ایک وہ جو فلسفہ پڑھنے کے بعد خدا سے منکر ہو جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو ایک واجب الوجود (خدا) کو مان لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں ایسی تعلیم دے ہی نہیں سکتا جس کو حاصل کر کے کچھ لوگ خدا کے منکر بھی ہو جائیں۔ اس لیے قرآن میں جو "حکمت" کا لفظ آیا ہے یقیناً فلسفہ کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس سے وہ علم مراد ہے جس سے انسان پر اشیاء کی وہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں جو نہ تو حواس ظاہری سے معلوم ہو سکتی ہیں نہ عقل ہی سے سمجھ میں آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علم دنیا کے تمام علوم میں سب سے افضل ہے۔ اسی وجہ سے یہ اتنا عام اور آسان بھی نہیں ہے کہ جو چاہے حاصل کر لے بلکہ اس کو صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن میں اللہ نے اس کے حصول کی صلاحیت رکھی ہو اور یہ معمولی آدمی نہیں ہوتے بلکہ خاص لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ

اِلاَّ اُولُوا الاَلْبَابِ(البقرۃ:269)

ترجمہ:"اللہ تعالٰی حکمت عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیر کثیر عطا کی گئی لیکن حکمت کی باتیں ان کے سوائے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا جو دانشمند ہیں۔"

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ رسول کریمﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَائِقَ کُل الْا شْیَاءِ کَمَا ھِیَ

ترجمہ:"اے اللہ! ہم کو تمام اشیاء کی حقیقت سے آگاہ فرما۔"

علم الحقائق کے تین حصے کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔مادیات

۲۔نفسیات

۳۔الٰہیات

مادیات یا سائنس:

اس کے طالب علم صرف مادی اشیاء کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش میں عمریں صرف کر دیتے ہیں۔مثلاً جب ان کو خیال آیا کہ پانی کس طرح بنا ہے تو مدت دراز تک کوشش دشوار اور سعی بسیار سے یہ معلوم کرلیا کہ یہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے۔اسی طرح ہوا کے اجزاء کی تحقیق کی، نباتات کی طرف آئے تو یہاں تک معلوم کرلیا کہ بیج سے کلا کیوں کر پھوٹتا ہے اور کس طرح تناور درخت بن جاتا ہے۔جنگلوں میں خودرو نباتات کو کس طریقے سے انسان کی خوراک اور اس کے باغوں کی تزئین و آرائش کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔کس قسم کی مٹی اور کھاد کون سی نباتات کی نشو ونما میں زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ میں لاکھوں ٹن غلہ دوسرے قحط زدہ ممالک میں بھیجنے اور خود اپنے ملک میں بے غل وغش خرچ کرنے کے بعد باقی ہزاروں ٹن سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ دنیائے طب میں قدم رکھا تو بیسیوں جراثیم اور بیکٹیریا دریافت کر لیے اور ان کو پرورش کرنے اور ہلاک کرنے کے طریقے معلوم کیے جس سے دنیائے

طب میں ایک انقلاب آ گیا۔ دھاتوں کی تحقیق ہاتھ میں لی تو بہت سی نئی نئی مرکب دھاتیں خود بنا لیں۔ ان میں سے کئی ایسی ہیں جو زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت میں بھی پگھل نہیں سکتیں۔ یہاں تک معلوم کرلیا کہ فلاں دھات میں اتنے اور فلاں میں اتنے الیکٹرون ہوتے ہیں۔ جن کی تعداد کو اگر کسی طرح بدل دیا جائے تو دھات کی ہیئت بدل جائے گی۔ سائنس دانوں نے فلکیات پر تحقیق کی تو ایسی ایسی باتیں دریافت کیں کہ ساری دنیا حیران رہ گئی۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ ہماری زمین اور سورج اور ہمارا نظام شمسی اور خالی آنکھ سے نظر آنے والے چند ہزار ستارے بس یہی کل کائنات اور ہمارے خدائے قادر قیوم کی پوری خدائی ہے۔ لیکن ان سائنس دانوں نے موجودہ زمانہ کی جناتی دوربینوں اور اعلیٰ ریاضی کے مسلمات سے ثابت کر دیا کہ یہ جو کچھ نظر آتا ہے یہ تو ساری کائنات کا ایک اربواں حصہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا نظام شمسی اس کہکشاں سے بنا ہے جو نظر آتی ہے۔ لیکن تحقیق یہ ہوا ہے کہ صرف ہمارا نظام شمسی ہی اکیلا نہیں بنا بلکہ اربوں ایسے نظام ہیں جو اس کہکشاں سے بنے ہیں اور سارے آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر ایسی ایسی لاکھوں کہکشائیں ہیں جن میں ہر ایک سے اسی طرح کے اربوں نظام ہائے شمسی بنے ہیں اور یہ تو صرف وہ کچھ ہے جو ہم کو موجودہ دوربینوں وغیرہ سے نظر آتا ہے اس کے علاوہ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی خدائی میں کیا کچھ بھرا پڑا ہے ایسی ایسی بے شمار کائناتیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی کیا کچھ ہے جہاں نہ انسان کے آلات ہی کچھ کام دے سکتے ہیں نہ اس کی عقل اور خیال۔ ابھی کچھ عرصے پہلے چاند کے متعلق کیا کیا عجیب وغریب عقائد ونظریات بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن اب ان سائنس دانوں نے اس کی حقیقت کھول کر رکھ دی ہے اور وہاں تک آنے جانے کے راستے بھی استوار کر لیے ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارا سورج زمین سے تقریباً ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے۔ لیکن اس فضا میں ہزاروں ایسے سورج بھی ہیں جو ہمارے سورج سے بھی حجم میں لاکھوں گنا بڑے ہیں۔ سُبْحَانَ اللہ فَتَبَارَکَ اللہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ.

اب مشینی دنیا کی طرف آیئے۔ اس دنیا میں تو ان کے حکمائے وقت یعنی سائنسدانوں نے وہ

کمال کیا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس میں مشینوں کا استعمال عام نہ ہو۔ کپڑا بننے کی مشینیں' کپڑا کاٹنے' کترنے اور سینے کی مشینیں کپڑے دھونے کی مشینیں' حجامت بنانے اور ناخن بنانے کی مشینیں' کھانا پکانے کی مشینیں' مصالحہ پیسنے اور کوٹنے کی مشینیں' برتن دھونے کی مشینیں' اناج بونے' اس کو پانی دینے (ٹیوب ویل)' فصل کاٹنے اور چھڑنے کی مشینیں' برتن اور زیورات بنانے کی مشینیں' کاغذ بنانے اور چھاپنے کی مشینیں' آٹا پیسنے کی مشینیں' ہزاروں قسم کی مصنوعات بنانے کی مشینیں۔ ان کے علاوہ میدان جنگ میں استعمال ہونے والی بیسیوں قسم کی بندوقیں' رائفلیں' مشین گنیں' بڑی دور مار توپیں اور ایسے آلات جن کا عام آدمیوں کو پتہ بھی نہیں ہے۔ خبر رسانی کے آلات' ٹیلی گراف' ریڈیو' ٹرانسمیٹر اور وائرلیس وغیرہ۔ پھر آمد و رفت اور ٹریفک کی گاڑیاں مثلاً سائیکل' موٹر سائیکل' اسکوٹر' موٹر' ہوائی جہاز' پانی کے جہاز' ٹرک اور ریل گاڑیاں' آبدوز کشتیاں جو کئی کئی ماہ تک پانی کے اندر رہ سکتی ہیں۔ چاند پر جانے والے راکٹ' خلا میں قائم رہنے والے خلائی اسٹیشن۔ ان کے علاوہ دیوپیکر بلڈوزر اور مشینیں جن سے اگر چاہیں تو ہمالہ پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر کے ہموار میدان میں تبدیل کر دیں اور بڑے بڑے ہموار میدانوں کو کھود کر سمندر بنا دیں۔ الغرض کہاں تک بیان کیا جائے اگر ساری مشینوں کا ذکر کیا جائے تو ایک بڑی ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ پھر ان مشینوں کے ساتھ پاور (توانائی) کا استعمال۔ سب سے پہلے انگلینڈ میں کپڑا بننے کی مشینیں ایجاد ہوئیں۔ وہ شروع شروع میں صرف ہاتھ سے چلتی تھیں پھر بھاپ کی طاقت دریافت ہوگئی تو اس سے کام لیا جانے لگا اور پہلے سے سینکڑوں گنا کام ہونے لگا اس کے بعد بجلی کی طاقت دریافت ہوگئی تو کام اور بھی زیادہ آسان اور پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ مقدار میں ہونے لگا۔ اس کے بعد پٹرول دریافت ہوا اور اس سے آمد و رفت کی گاڑیوں اور ہوائی جہاز وغیرہ کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ مہینوں کا راستہ دنوں اور دنوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہونے لگا یعنی زمین کی طنابیں ان سائنس دانوں نے کھینچ دیں۔ اور وہ سکڑ کر چھوٹی سی ہوگئی۔ اب ایٹمی توانائی دریافت ہوگئی۔ دیکھیں یہ کیا کیا گل کھلاتی ہے۔

سوچنے اورغور کرنے کی بات ہے یہ ایجادیں اور دریافتیں جنہوں نے زمانہ کی معیشت و معاشرت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا کوئی معمولی چیز ہیں۔ کوئی معمولی عقل کا انسان یا کوئی معمولی بلکہ اچھا پڑھا لکھا آدمی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یقیناً نہیں۔ یہ انہی لوگوں کے کارنامے ہیں جو سائنس دان کہلاتے ہیں اور جو حقیقت میں حکیم ہیں ان لوگوں نے خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لیے اپنی عمریں صرف کر دیں۔ ہزاروں جانیں قربان کر ڈالیں۔ تب یہ نعمتیں وجود میں آئیں کہ آج افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ایئر کنڈیشنڈ مکان بنا کر انسان آرام سے رہ سکتا ہے۔ ریفریجریٹر کا برف جیسا ٹھنڈا پانی پی سکتا ہے اور کولڈ اسٹور میں اپنے کھانے پینے کا سامان مدتوں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح کوہ زمین کے شمالی برفانی علاقوں میں گرم ایئر کنڈیشنڈ مشینوں سے اپنے مکانوں بلکہ پورے محلوں اور شہر میں ایسی گرمی پیدا کر لیتا ہے کہ سردی کا خیال بھی نہیں آنے پاتا اور بجلی کی روشنی سے اپنی لمبی لمبی اندھیری راتوں کو دن کی طرح روشن اور منور رکھتا ہے۔ فضا میں خاص قسم کے میزائل چھوڑ کر مینہ اور اولے برسا سکتا ہے اور اپنی بنجر زمینوں کو زرخیز اور شاداب پر بہار گلزاروں میں تبدیل کر لیتا ہے۔ حقیقتاً یہ عام تو کیا اچھے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور غیر معمولی دماغوں کا کام نہیں بلکہ ان خاص لوگوں کا کام ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا کی ہے پھر حکمت کے ساتھ خیر کثیر خود بخود ہی ان کے حصہ میں آ گئی۔ ان کے ملکوں میں ہن برسنے لگا اور انہوں نے پرانی سلطنتوں اور طاقت ور سے طاقت ور بادشاہتوں کو صرف ایک دو صدی میں اپنا غلام بنالیا۔

اوپر جو کچھ بتایا گیا ہے یہ حکمت کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے کیوں کہ اس میں صرف مادی چیزوں کی تحقیق کی جاتی ہے جو حواس ظاہری سے معلوم اور محسوس ہو سکتی ہیں ان کو تو لا اور ناپا جا سکتا ہے اگر مرکب ہوں تو تجزیہ کر کے ایک ایک جزو کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ اجزاء کس نسبت سے ترکیب دیئے گئے ہیں اور اگر یہ چیزیں مفرد ہوں تو تجربہ سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان اجزاء کو کس خاص تناسب سے ترکیب دے کر کون کون سی چیزیں بنائی جا سکتی ہیں اور یہ سلسلہ اتنا وسیع اور دراز ہے کہ غالباً قیامت تک ختم نہ ہوگا ہمیشہ نئی سے نئی چیزیں دریافت اور

ایجاد ہوتی رہیں گی۔

الغرض یہ ہے مادی اشیاء کی حقیقت سے واقف ہونے کا علم۔ مسلمانوں نے اس کی طرف کبھی توجہ ہی نہ کی۔ یورپ کی اقوام نے اس کو اپنایا۔ اس کے حصول کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں اور عمریں صرف کیں اس کا جو اجر انہوں نے آج پایا وہ ہم سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تو یہ علم کسی کو سکھایا ہی نہیں پھر اگر انہوں نے اس کی طرف سے بے اعتنائی برتی تو ان کا کیا قصور ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے سپرد تبلیغ اسلام کا اتنا بڑا اور عظیم الشان کام تھا کہ حضور ﷺ کو علم مادیت سکھانے کی نہ تو فرصت تھی نہ ضرورت۔ حضور ﷺ نے تو اور بھی بہت سے علوم صحابہ کرامؓ کو نہیں سکھائے مثلاً ادبیات، علم البیان، علم الکلام، منطق، فلسفہ، طب اور ریاضی وغیرہ۔ بعد میں جوں جوں اسلام ترقی کرتا گیا اور عجمی اقوام مسلمان ہوتی گئیں علمائے اسلام نے خود ان علوم کو سیکھا اور ان میں وہ ید طولیٰ حاصل کیا کہ ساری دنیائے اسلام علم کی روشنی سے جگمگا اٹھی۔ یورپ میں اس وقت اندھیرا تھا۔ جب اس روشنی کی کرنیں وہاں پہنچیں اور اقوام یورپ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہمارے تنزل اور مسلمانوں کی ترقی و بالادستی کا راز اسی روشنی میں پنہاں ہے تو ہزارہا طلباء پروانہ وار اسلامی مدارس کی طرف دوڑے اور قرطبہ، غرناطہ، دمشق اور بغداد وغیرہ کی یونیورسٹیوں سے کسب علم کے بعد جب اپنے وطن کو واپس لوٹے تو وہاں چراغ سے چراغ جلائے۔ انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ہر علم میں مزید ترقی کی کوشش کی، جانیں قربان کیں اور نئی نئی دریافتوں میں عمریں گزار دیں اور آج تک یہی ہو رہا ہے۔ دوسری طرف مسلمان شمع علم کو بجھا کر آرام کی نیند سو گئے اور آج تک پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ صدیوں کی غفلت کے بعد اب کچھ بیداری کے آثار نظر آنے لگے ہیں اور ہمارے نوجوان بھی ہزاروں کی تعداد میں امریکہ اور انگلینڈ وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مگر افسوس جب وہ واپس آتے ہیں تو پکے مسلمان خال خال اور کمیونسٹ، سائنٹیفک سوشلسٹس، اسلامی سوشلسٹس اور ملحد و بے دین زیادہ ہوتے ہیں۔ <u>اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بچپن</u>

میں گھروں پران کومذہب سے تقریباً بالکل ناآشنار کھا جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ ہمارے علماء کا فرض نہ تھا کہ جب انہوں نے یورپی اقوام کو اکتساب سائنس کے بل پر ترقی کرتے دیکھا تو خود بھی یورپ جا کر ماڈرن علوم حاصل کرتے اور اپنے ممالک اور قوم کو یورپ کی مادی طاقت سے مغلوب نہ ہونے دیتے خصوصاً جب کہ قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ حکم دیا گیا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے بیچ میں ہماری بے انتہا نشانیاں ہیں ان پہ غور وفکر کرو۔وہاں جو کچھ بھی ہے ہم نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور ایک جگہ تو بالکل صاف صاف فرمادیا ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ

''کیا یہ لوگ کائنات اور اس میں جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان پر غور نہیں کرتے معلوم ہوتا ہے ان کی موت نزدیک آ گئی ہے۔''(الاعراف:185)

اس سے زیادہ صاف اور واضح حکم سائنس سیکھنے کا اور کیا ہوسکتا ہے پھر بیسیوں اپنی ان قدرتی نشانیوں کا ذکر کیا ہے جن پر غور کرنے سے عقل و دانش نشو ونما پاتی اور نئے نئے علم وجود میں آتے ہیں۔مثلاً فرماتے ہیں کہ ایک ہماری نشانی یہ ہے کہ زمین مردہ کو پھر زندہ کر دیتے ہیں اور اس میں سے تمہارے لیے طرح طرح کے میوے اناج اور سبزیاں اگاتے ہیں۔ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ''دن رات کے گھٹنے بڑھنے اور موسموں کے بدلنے میں ہماری نشانیاں ہیں پس تم غور کیوں نہیں کرتے'' ایسی لاتعداد آیات ہیں جن میں قدرتی اشیاء کی حقیقت پر غور وفکر کرنے کی ترغیب ہی نہیں بلکہ حکم دیا ہے۔اس مختصر خطبہ میں یہ سب کچھ نقل کرنے کی گنجائش نہیں لہٰذا صرف ایک ایسی آیت لکھتا ہوں جو موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام علوم کو سیکھنے کی دعوت دیتی ہے اور اس قسم کی اور سب آیتوں پر حاوی ہے۔دیکھئے سورہ عنکبوت آیت بیس اس میں صاف اور واضح حکم دیا گیا ہے کہ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (العنکبوت:20) یعنی ''اے رسول

مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھیں کہ آفرینش کی ابتدا کیسے ہوئی ۔"

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ **فَانظُرُوا** دیکھو/نظر کرو میں نظر کے معنی صرف دیکھنے کے نہیں ہیں بلکہ غور سے دیکھنا اور حقیقت تک پہنچ جانے کے ہیں جیسا کہ ہم کہتے ہیں فلاں آدمی صاحب نظر ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ عقلمند ہے' اصلیت اور حقیقت کو سمجھنے والا ہے ۔علم دو طرح کے ہوتے ہیں ایک **بدیہی' دوسرا نظری**۔ تو بدیہی وہ علم ہے جس میں غور وفکر کی ضرورت نہ ہو بلکہ دیکھتے ہی اصلیت معلوم ہو جائے لیکن نظری علوم وہ ہیں جن میں غور وفکر کرنے کے بعد حقیقت سمجھ میں آئے تو یہاں "نظر کرو" کے معنے صرف دیکھ لینے کے نہیں بلکہ یہ حقیقت معلوم کرنے کے ہیں کہ آفرینش کی ابتدا کیوں کر ہوئی ۔ ہمارے علماء نے تو ظاہر ہے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی لیکن یورپ کے محققین کئی صدیوں سے اس پر غور کر رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اگر چہ اصل حقیقت تو ابھی تک معلوم نہیں ہوئی ۔لیکن بہت سے نئے علوم مدون ہو گئے ۔مثلاً علم طبیعات' علم الکیمیا' علم طبقات الارض' علم الحیوۃ' علم نباتات' علم معدنیات' فلکیات اور اعلیٰ علم ریاضی ۔ان علوم سے انسان کو جو بے انتہا فائدے پہنچے وہ سب مفصل بیان کیے جائیں تو کئی ضخیم کتابیں تیار ہو سکتی ہیں یہاں ان کے بیان کی گنجائش نہیں تعلیم یافتہ لوگ سب جانتے ہیں ۔

صحابہ کرامؓ کو مادیات نہ بتانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اس علم سے کہیں زیادہ اعلیٰ و افضل علم اپنے خاص خاص صحابیوں کو سکھا رہے تھے ۔الٰہیات جس کا موضوع یہ ہے کہ خدا کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ اس نے مخلوق و کائنات کو کس طرح پیدا کیا ہے اور ان سے اس کا کیا تعلق ہے ۔اس کے علاوہ غائب کی دوسری چیزیں جن پر بن دیکھے ایمان لانا قبول اسلام کے لیے پہلی بنیادی شرط ہے ۔ان کی حقیقت کیا ہے (مثلاً فرشتے' الہامی کتابیں' رسول' قیامت اور بعث بعد الموت)اور آخری مقصود و موضوع اس علم کا خدا کا قرب' معرفت اور مشاہدہ ہے ۔لیکن الٰہیات سیکھنے سے پہلے علم النفس یا نفسیات کا سیکھنا ضروری ہوتا ہے ۔اس لیے حضور a نے یہ بھی سکھایا۔ علم النفس کی افادیت اور عظمت و بزرگی میں الٰہیات سے تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا البتہ

مادیات کے مقابلہ میں یہ علم کہیں اعلیٰ و افضل ہے اس لیے اب کچھ بیان نفسیات یا علم النفس کا کیا جاتا ہے۔

نفسیات یا علم النفس:

علم النفس کا موضوع ہے' نفس کی ماہیت اور حقیقت کا پتہ لگانا اور یہ معلوم کرنا کہ وہ جانداروں اور خصوصاً انسانوں کے ذہن' خیال اور اعمال و افعال پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلی بات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک عالم نفس تک سلوک مکمل طور پر طے نہ ہو جائے۔ البتہ دوسری بات مشاہدہ اور تجربہ سے بہ آسانی معلوم کی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ نفس کے تمام معمول جن پر وہ اثر انداز ہوتا ہے مادی ہوتے ہیں اور ہم کو اس کے تمام تاثرات آنکھوں سے نظر آتے ہیں اور حواس سے محسوس ہو سکتے ہیں۔

بہر حال جہاں تک ممکن ہے میں کچھ نہ کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں جن لوگوں نے سلسلہ توحیدیہ کی تعلیم پر پورے ذوق و شوق سے باقاعدہ اور متواتر عمل کیا ہے۔ جن کے دل میں عشق الٰہی کی حرارت اور سوز پیدا ہو چکا ہے۔ جن میں دوسروں کو توجہ دینے اور وصول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی ہے۔ جو توجہ کی لطافت و ثقالت سے واقف ہو گئے ہیں اور جن کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ توجہ کن کن مختلف حالات میں کیا کیا اثر کرتی ہے اور اس کی طاقت اور وساطت سے کیسے کیسے ناممکن اور حیران کن نتیجے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں وہ اس مضمون کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

نفس میں صرف ایک صفت ہے اور وہ ہے خواہش یا یوں کہو کہ نفس نام ہی خواہش کا ہے۔ نفس میں چار خواہشات بنیادی ہیں بھوک' پیاس' سردی' گرمی سے بچاؤ اور جنسی اشتہا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خواہشات ہیں لیکن وہ سب ذیلی یا اضافی ہیں۔ اب آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی تمام رونق' چہل پہل اور گہما گہمی بلکہ خود زندگی انہی خواہشات کی وجہ سے ہے۔ اس لیے جن مذاہب میں خواہشات کو بالکل فنا کر دینے کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً بدھ اور ہندو مت وہ اصولاً غلط ہے۔ میں نے خود عملی طور پر اس کا تجربہ کیا ہے۔

اگر چہ میں نماز بھی پڑھتا تھا' ذکر بھی کرتا تھا لیکن تین چار سال میں خدا سے کوئی تعلق ہی باقی نہ رہا اور دل کچے گوشت کا ایک لوتھڑا رہ گیا' آپ خود سوچیں کہ اللہ سے ہمارا رابطہ تو صرف اسی وجہ سے ہے کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں سزا نہ دے دے اور اس سے امیدیں رکھتے اور دعائیں مانگتے ہیں کہ یارب ہم کو یہ دے وہ دے' اس تکلیف کو دور کر' اس مصیبت سے محفوظ رکھ تو جب ہم کو نہ دوزخ کی پرواہ رہے' نہ جنت کی خواہش' نہ کسی رنجیدہ بات کا رنج ہو نہ خوشی کی بات کی خوشی تو پھر خدا سے کیا تعلق رہ سکتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ کام تو الٹا ہو گیا نہ کوئی امنگ رہی نہ جوش و خروش نہ طلب' چلے تھے دل کو زندہ کرنے وہ تو بالکل ہی مردہ ہو گیا۔ اس وقت میں واپس لوٹا' کوشش سے خواہشیں پیدا کرتا۔ اور معمولی معمولی باتوں میں رنج اور خوشی کا احساس کرتا۔ الغرض خدا خدا کرکے دو ڈھائی سال میں طبیعت پھر بحال ہو گئی۔ اسلامی تصوف میں نفس کو بالکل مار دینا جائز نہیں۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ اپنے نفوس کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بعض لوگ خصوصاً بدھ بھکشو اور ہندو سادھو کہتے ہیں کہ جب خواہشات کو مارے تو اپنے دنیوی اور دینی فرائض کو ترک نہ کرے۔ بلکہ پہلے ہی کی طرح باقاعدہ انجام دیتا رہے تو دل مردہ نہیں ہوتا۔ میرے تجربہ میں ان کا یہ کہنا بھی بالکل غلط ہے۔ میں اس حالت میں ملازمت بھی کرتا تھا' عبادت بھی کرتا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد پوری طرح بجالاتا مگر سب بیکار گیا۔ البتہ ایک بات بظاہر درست معلوم ہوتی یعنی یہ کہ جب تم خواہشات کو مٹاؤ تو اللہ کے ملنے کی خواہش کو اور زیادہ کرتے جاؤ۔ میں نے یہ بھی کر کے دیکھا۔ حقیقت میں جو مزہ دنیا کے افکار و آلام میں پھنسے رہ کر اللہ اللہ کرنے میں آتا ہے اور جو روحانی ترقی دل شکستگی میں اور مصیبتوں کو خوشی سے برداشت کرنے میں ہوتی ہے اور جو مدارج علیا اس طرح ملتے ہیں کسی دوسری طرح ممکن ہی نہیں۔ میرا اپنا تجربہ تو یہی ہے آگے اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون سا طریقہ بہتر ہے۔ اب آگے میں یہ بتاؤں گا کہ نفس میں کتنی بے پناہ طاقت ہے اور ہم اس سے کیسے کیسے عجیب اور ناممکن الوقوع کام لے سکتے ہیں' اس وقت آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی نفس کو بالکل مار دینا بیوقوفی ہے۔ ہاں ہونا یہ چاہیے کہ نفس جب کوئی بری خواہش کرے تو

اس کا مقابلہ کرو اور اس کی وہ خواہش ہرگز پوری نہ ہونے دو یعنی کنٹرول کی طاقت پیدا کرو اور اس کو بڑھاتے رہو۔ نفس کے ساتھ اس طرح مقابلہ کرنے سے روحانی قوت بڑھتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ اماریت سے لوامیت اور پھر ملکوتیت اختیار کر لیتا ہے۔

ٹیلی پیتھی انتقالِ خیال:

نفس کی طاقت کا سب سے گھٹیا مظہر ہیں مسمریزم' ہپناٹزم' ٹیلی پیتھی اور انتقال خیال ایک دماغ سے دوسرے دماغ میں۔ میرے خیال میں یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مسمریزم اور ہپناٹزم سے بیماریوں کا کامیاب علاج کیا جاتا ہے اور یورپ میں یہ طریقہ علاج بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ سر کا درد' جسم کے کسی اور حصہ کا درد' بخار وغیرہ کو اس کے عمل سے بہت جلد آرام آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی مہلک بیماریوں کو بھی شفا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ دیوانہ پن بھی جاتا رہتا ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے تصوف میں بھی یہ طریقہ صدیوں تک جاری رہا ہے۔ نقشبندیہ خاندان میں تو سلب مرض کا طریقہ باقاعدہ سکھایا اور عمل میں لایا جاتا تھا۔ میں نے اس کا بذات خود کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اگر آپ اس سے متعلق کچھ جاننا چاہیں تو حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ''قول الجمیل'' کا مطالعہ کریں۔ اس میں یہ طریقہ مختصر طور پر دیا ہوا ہے۔

مسمریزم کا ایک تماشہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عامل چھوٹی اور ہلکی مادی چیزوں کو صرف نظر اور انگلی سے اشارہ کر کے متحرک کر دیتا ہے اور وہ چیزیں گز دو گز فاصلہ طے کر کے عامل کے پاس آ جاتی ہیں۔ دیا سلائی' چاقو' گھڑی اور قلم وغیرہ۔ ہپناٹزم میں معمول پر خواب مقناطیسی طاری کر کے اس کے دل کا چھپا ہوا سارا حال پوچھا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ مجرموں سے جرم کا پتہ لگانے کے لیے بہت مفید ہے۔ ٹیلی پیتھی اور انتقال خیال یہ ہے کہ عامل معمول کو مقناطیسی نیند سلا کر اس سے ماحول وغیرہ کے متعلق سوال کرتا ہے اور صحیح جواب پاتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد کے سامنے اسی طرح ایک عامل اپنے معمول کو بے ہوش کر کے طرح طرح کے سوالات پوچھ رہا تھا۔ مثلاً عامل نے ایک آدمی سے گھڑی لی اور معمول سے جو بے ہوش سو رہا تھا اور جس کی آنکھوں پر

پٹی بندھی ہوئی تھی پوچھا یہ کیا؟ معمول نے جواب دیا: گھڑی۔ عامل نے پوچھا: کیا بجا ہے؟ معمول نے درست جواب دیا۔ یوں وہ طرح طرح کے سوالات کر رہا تھا میں نے اپنے ہاتھ میں چونی دبائی اور عامل سے کہا اپنے معمول سے پوچھو میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ اس پر عامل نے کہا مجھے دکھایئے آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں نے انکار کیا تو وہ کہنے لگا پھر تو میرا معمول نہیں بتا سکے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ معمول کو صرف اس بات کا علم ہو سکتا ہے جو عامل کو معلوم ہے۔ اسی کو انتقال خیال کہتے ہیں۔

ٹیلی پیتھی یہ ہے کہ عامل و معمول یا دو دوست شہر کے مختلف محلوں میں یا دو مختلف شہروں میں رہتے ہیں وہ ایک وقت مقرر کر کے لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک آدمی کچھ سوالات وغیرہ لکھتا ہے۔ دوسرا بھی بالکل وہی باتیں اپنے کاغذ پر لکھتا ہے۔ پہلا آدمی بھی اس وقت کچھ لکھتا ہے اور اس سے بالکل وہی جواب لکھا جاتا ہے جو نمبر 2 نے لکھا تھا۔ یہ بھی دراصل انتقال خیال ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی حالت میں آمنے سامنے عمل ہوتا ہے اور اس صورت میں فاصلے سے۔ بادی النظر میں یہ باتیں بڑی معرکۃ الاراء اور حیران کن ہیں۔ لیکن جن صوفیوں نے سلوک میں کمال حاصل کیا ہے ان کے نزدیک یہ سب کچھ بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں۔ ایک صوفی اپنے مریدوں پر توجہ کے ذریعہ جو چاہے وہی اثر ڈال سکتا ہے۔ لاہور میں بیٹھے ہوئے لندن یا نیویارک جیسے دور دراز مقامات میں اپنے مریدوں کے دماغ پر توجہ دے کر ان کی بری عادتیں چھڑا سکتا ہے اور ان کی اصلاح کر سکتا ہے۔ دور بیٹھے ہوئے مریضوں پر صرف خیال اور تصور سے دم کر کے ان کے امراض کو دور کر سکتا ہے۔ جو چاہے وہ پیغام پہنچا سکتا ہے اور اس کا جواب لے سکتا ہے۔ یہ کوئی دور از کار باتیں نہیں۔ خود میرا اپنا روزمرہ کا تجربہ ہے۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ ایک مسمرائزر یا ہپناٹسٹ اپنے معمول کو پہلے سے بتا دیتا ہے کہ جو میں کہوں تم بھی اسی کا تصور کرنا اور اپنی قوت ارادی کو میرے سپرد کر دینا۔ اب اگر معمول عامل کے خلاف سوچے اور یہ خیال کرے کہ عامل کا اثر ہرگز قبول نہ کروں گا تو پھر ایسے معمول پر عامل کا

کوئی اثر نہیں ہوتا۔حالانکہ مسلمان صوفی کو اس کی مطلق ضرورت نہیں۔وہ جس کو چاہے اپنی توجہ سے اس کے خیالات بدل سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

یہ تو تھے مسمریزم وغیرہ کے معمولی کرشمے مگر نفس کی طاقت اس سے کہیں بڑے بڑے کام انجام دے سکتی ہے' مثلاً محض قوت ارادی سے بڑے بڑے بوجھوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینا' مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ ہو جانا' طے الارض یعنی ہزاروں میل کا فاصلہ چند سیکنڈ میں طے کر لینا' شکل تبدیل کر لینا یا لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جانا' کشف سے دل کا حال یا ماضی و مستقبل کا حال بتا دینا وغیرہ وغیرہ۔

علمِ سیمیا:

ان کے علاوہ ایک اور علم نفس سے متعلق ہے جس کو سیمیا کہتے ہیں اس میں یہ ہوتا ہے کہ موجود کچھ ہوتا ہے لیکن نظر کچھ آتا ہے۔یا موجود کچھ بھی نہیں ہوتا اور عامل جو کچھ دکھانا چاہے وہی نظر آنے لگتا ہے۔یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اپنی آپ بیتی لکھ دوں جس سے مندرجہ بالا امر کی تصدیق ہو جائے گی۔

ہوا یہ کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہونے کے بعد جب ہر طرف افراتفری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔14 ستمبر کو میں نے ارادہ کیا کہ جو کچھ بھی ہو پاکستان چلنا چاہیے۔چنانچہ جیسے بن پڑا میں نظام الدین بستی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔میرے ساتھ میرا لڑکا اور میرے برادر نسبتی حبیب الرحمٰن صاحب تھے۔پہلی ٹرین جو صبح 6 بجے جاتی تھی ہمارے ہاتھ نہ آئی۔مگر دوسری ٹرین میں جو 12 بجے چھوٹی تھی ہم کو جگہ مل گئی۔اور ہم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔دوستوں نے بہتیرا منع کیا اور سمجھایا کہ ایسے وقت میں جانا درست نہیں' دھڑا دھڑ ریل گاڑیاں کٹ رہی ہیں اور کوئی بھی صحیح سلامت لاہور نہیں پہنچتی۔میں نے کہا تن بہ تقدیر جو کچھ بھی ہو موت کا ایک وقت مقرر ہے اگر آنی ہے تو کون بچا سکتا ہے اور اگر زندگی ہے تو کون مار سکتا ہے۔الغرض ٹھیک بارہ بجے گاڑی روانہ ہو گئی۔یہ دہلی جنکشن پر نہیں ٹھہری کیوں کہ وہاں مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا تھا اس لیے گاڑی

سیدھی غازی آباد جنکشن پر رکی۔ مجھ کو اس وقت معلوم ہوا کہ ہو کیا رہا ہے۔ پنجاب سے آنے والی گاڑیوں میں سکھ اور ہندو ڈبوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے بلکہ ریل کی چھت پر بھی سینکڑوں آدمی سوار تھے۔ گاڑی وہاں صرف دس منٹ ٹھہری اور خیریت سے روانہ ہوگئی۔ راستہ میں ہمارے اوپر گولیاں وغیرہ بھی چلائی گئیں مگر کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ریل کے دونوں طرف آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ مسلمانوں کے قافلے ہیں۔ جو مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان جا رہے ہیں۔ راستہ میں کیا کیا واقعات پیش آئے طوالت کے خوف سے حذف کر کے اصل واقعہ لکھتا ہوں۔ دوسرے دن کوئی دو بجے ہماری گاڑی جالندھر پہنچی اور وہاں کوئی دو گھنٹے ٹھہر کر آگے روانہ ہوگئی۔ چند میل چلنے کے بعد دیکھا کہ ہم سے پہلے جو گاڑی صبح چھ بجے بستی نظام الدین سے چلی تھی اور ہم سے مس ہوگئی تھی وہ کٹی پڑی ہے۔ ٹرین کو ڈی ریل کر دیا گیا تھا جا بجا ٹوٹے پھوٹے ڈبے لوٹے پڑے تھے۔ بیسیوں لاشیں پڑی تھیں کچھ آدمی کھڑے حسرت سے ہماری گاڑی کو دیکھ رہے تھے اور چیخ رہے تھے کہ آگے نہ جاؤ۔ مگر رکنا یا جانا ہمارے ہاتھ میں نہ تھا۔ خدا خدا کر کے بیاس کا اسٹیشن آیا اور گاڑی وہاں رک گئی۔ تمام پلیٹ فارم اسباب سے بھرے ہوئے تھے مگر آدمی ایک بھی نہ تھا۔ میرے ڈبہ کے سامنے صرف ایک بڈھا سکھ بیٹھا تھا' میں نے اسے پوچھا سردار جی! یہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہمارے قافلے کا سامان ہے۔ میں نے پوچھا کہ قافلہ کہاں ہے تو اس نے کہا کہ وہ گاؤں دیہات سے اپنی رسد لوٹنے گئے ہیں۔ یہ باتیں ہونے کے کوئی گھنٹے بھر بعد سکھ آنے شروع ہوئے اور اسٹیشن سے باہر جو بڑ کا درخت تھا وہاں جمع ہونے لگے دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد کوئی تین سو سے زائد ہوگئی۔

سب نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ داڑھیوں پر سفید ڈھاٹے بندھے تھے۔ ہاتھ میں ننگی کرپانیں تھیں۔ میں اطمینان سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے دل میں اس بات کا شائبہ بھی نہ تھا کہ وہ ہم کو کاٹ سکتے ہیں۔ اس وقت سارے پلیٹ فارم پر اور میری کھڑکی کے نزدیک کوئی آدمی بھی نہ تھا کہ یکا یک مجھے گاڑی کے اندر سے رونے کی آواز آئی۔ مڑ کر جو دیکھا کہ عورتیں'

بچے بوڑھے اور جوان سب رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا بھئی تم کیوں روتے ہو۔ ایک شخص نے جواب دیا کہ تم کو دکھائی نہیں دیتا کہ سکھ آ گئے ہیں۔ اب ہم کو کاٹیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ جب کاٹیں گے اس وقت رو لینا۔ پہلے سے واویلا کر کے ان کی توجہ اپنی طرف کیوں کراتے ہو۔ مگر کون سنتا۔ اس پر میں کھڑا ہوا اور میں نے چلا کر کہا "خاموش ہو جاؤ" اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا روؤ مت بلکہ **یا حفیظ یا سلام** پڑھو۔ خدا کو اپنے ساتھ محسوس کرو اور دشمن کی کرپانوں کو دیکھتے رہو۔ چنانچہ سب نے چلا چلا کر **یا حفیظ یا سلام** پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی طرف سے ہٹ کر میں پھر کھڑکی کی طرف مڑا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی کھڑکی میں کہنی ٹکائے کھڑا ہے اور سکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ بہت پستہ قد، دبلا پتلا، نہایت بدصورت آدمی تھا اور اس نے ریلوے خلاصی کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں سکھوں کو دیکھتے رہے۔ نہ وہ مجھ سے بولا نہ میں نے اس سے کچھ کہا۔ اب لوگوں کو **یا حفیظ یا سلام** پڑھتے ہوئے مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ یکا یک سکھ واپس جانا شروع ہو گئے اور وہاں ایک سکھ بھی نہ رہا۔ اس کے بعد ہماری گاڑی کوئی پندرہ منٹ تک رکی رہی اور پھر اللہ اللہ کر کے حرکت میں آئی۔ اس خلاصی نے مجھ سے کہا "انصاری صاحب اب آرام سے جائیں لاہور تک کوئی خطرہ نہیں" میں نے کہا آپ نہیں بیٹھتے۔ اس نے جواب دیا: "ہمارا کیا ہے، جب چاہیں گے آ جائیں گے۔ اب گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ میں برابر اس کو دیکھتا رہا کہ وہ یکا یک غائب ہو گیا۔ کچھ دیر تو میرے دماغ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن پھر یکا یک یہ خیال ابھرا کہ یہ شخص میرا نام کس طرح جانتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ہمارے ساتھ فوج یا پولیس نہیں ہے تو یہ سکھ کیوں واپس چلے گئے گاڑی کاٹنے سے انہیں کون روک سکتا تھا۔ الغرض! ہم خیر سے لاہور پہنچ گئے وہاں سے دو ہفتے بعد کراچی روانہ ہو گئے۔ کئی سال گزر گئے۔ میرے دل میں کبھی کبھی یہی دو سوال اٹھتے رہے لیکن جواب نہ ملا۔ ایک دن اتفاق سے میں ایک دوست سے ملنے کے لیے گیا تو اس کے پاس ایک نوجوان بیٹھا تھا جو نہایت خوبصورت کلین شیو، بال بنے ہوئے اور کم از کم پانچ سو روپے کا

سوٹ پہنے ہوئے تھا۔میرے دوست نے میرا اس سے تعارف کرانا چاہا تو اس نے کہا: انصاری صاحب تو مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جناب میں آپ سے کبھی نہیں ملا۔تو اس نے کہا کیوں وہ فسادوالی گاڑی یاد نہیں۔ میں نے پوچھا کون سی فسادوالی گاڑی۔تو اس نے جواب دیا وہی جو بیاس کے اسٹیشن پر کھڑی تھی اور سکھ جمع ہورہے تھے۔ میں نے پوچھا تو کیا آپ بھی ہمارے ہی ڈبے میں تھے؟ اس نے جواب دیا نہیں مگر آپ کی کھڑکی میں کہنی ٹیکے جو خلاصی کھڑا تھا اس کو آپ بھول گئے۔ میں بھونچکارہ گیا۔ میں نے پوچھا اچھا تو وہ آپ تھے۔اس نے کہا جی جہاں آپ کے ڈبہ پر میری ڈیوٹی تھی۔ میں نے پوچھا اچھا تو آپ رجال الغیب میں سے ہیں۔وہ ہنسا اور اس نے کہا یوں ہی سمجھ لیجیے۔ میں نے اس سے پوچھا یار یہ تو بتاؤ کہ وہ سکھ کیوں واپس لوٹ گئے حالانکہ ان کو کوئی چیز مانع نہ تھی۔اس نے جواب دیا کہ میں سکھوں کو یہ دکھا رہا تھا کہ آپ کی گاڑی کے ہر دروازے اور ہر کھڑکی کے سامنے ایک مسلح باوردی سپاہی رائفل لیے کھڑا ہے اور گاڑی کی چھت پر مشین گنیں لگی ہوئی ہیں۔اس کے جواب سے میری تسلی ہوگئی اور میں مان گیا کہ ''سیمیا بھی کوئی حقیقی چیز ہے محض گپ نہیں ہے۔''

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ غیر مسلم روحانی عالموں میں کرشمے اور خوارق عادات دکھانے کی جو طاقت ہے وہ مسلمان بزرگوں میں اس سے کہیں زیادہ اور مکمل طور پر موجود ہے۔لیکن فرق یہ ہے کہ مسلمان فقراء اور صوفیاء کو ان باتوں کی تشہیر سے منع کیا گیا ہے۔اس لیے وہ مشہور نہیں اور بہت کم لوگ ان کو جانتے ہیں۔

یوگ کے کرشمے:

ہندوؤں کے روحانی اشغال میں ایک یوگا ہے۔یوگی واقعی ایسے کرشمے دکھاتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ہندوؤں نے پوری ایک صدی یورپ اور امریکہ میں یوگا کی اتنی تبلیغ کی کہ آج امریکہ میں لوگ دھڑا دھڑ ہندو بن رہے ہیں۔کاش اسلامی روحانیت سے کوئی ان کو آشنا کرا دیتا تو بہت سے امریکن مسلمان ہو جاتے۔ہندوؤں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بے شمار یورپین

خصوصاً انگریز خود ہندوستان آئے تا کہ اپنی آنکھوں سے یہ کرشمے دیکھیں' یہ لوگ برسوں یہاں رہے' ایک ایک مندر اور ایک ایک کٹیا میں جہاں کسی یوگی کا پتہ چلا' گئے اور ان کے کمالات آنکھوں سے دیکھے۔

میری 14-15 سال کی ہو گی۔ میں دہلی میں مقیم تھا کہ ایک دن میرے ایک چچا زاد بھائی نے کہا کہ ایک بڑا یوگی آیا ہے اور چیٹھی رسانی کے باغ میں رہتا ہے۔ عجیب عجیب تماشے دکھاتا ہے۔ چلو گے؟ میں نے کہا ضرور! چنانچہ دوسرے دن ہم چیٹھی رسانی کے باغ میں گئے۔ 5-5 روپے کے دو ٹکٹ لیے اور اندر داخل ہو گئے۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یوگی نے عجیب و غریب کرتب دکھائے ان میں سے صرف دو یاد رہ گئے۔ کیوں کہ وہ واقعی عجیب تھے۔

ایک تو یہ تھا کہ یوگی ہال کے بالکل سنٹر میں آنکھیں بند کر کے کھڑا ہوا حبس دم کر کے سانس روک لیا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اس کا سر چھت سے لگ گیا پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر آیا۔ دوسری مرتبہ کرسی پر بیٹھ کر معہ کرسی چھت تک اٹھ گیا۔ تیسری دفعہ اس نے اپنے سامنے ایک میز بھی رکھ لی اور مع میز کرسی کے چھت تک پہنچ گیا۔

دوسرا کرتب یہ تھا کہ اس ہال کے آٹھ دروازے تھے ہر دروازے میں اس جیسا ایک ایک آدمی کھڑا ہو گیا۔ یوگی نے ایک کو اشارہ کیا وہ چلا اور یوگی کے پاس آ کر اس کے جسم میں غائب ہو گیا اور اسی طرح باقی 7 آدمی بھی ایک ایک کر کے اس کے جسم میں غائب ہو گئے۔

ایک اور واقعہ یوگ کا میں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بابت کسی تذکرے میں پڑھا کہ جب حضرت کی خانقاہ میں باولی کھدوائی جا رہی تھی۔ 30-40 فٹ نیچے جا کر ایک سمادھی (مٹھ) نکل آئی' مزدوروں نے اس کی کچھ اینٹیں اکھاڑ کر دیکھا تو اس میں ایک سادھو آسن جمائے بیٹھا تھا۔ حضرت نے اس کو اٹھا کر ایک بڑے صندوق میں بند کر دیا جس میں روئی بھری ہوئی تھی۔ پھر صندوق کو اپنے حجرے میں رکھوا دیا اور روزانہ تھوڑی تھوڑی روئی اس کے اوپر سے اٹھاتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ جاگ پڑا۔ سنسکرت دانوں کے ذریعہ بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ

ایک رلیہ کے زمانہ میں بیٹھا تھا۔حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ پانچ سو برس پہلے سادھی میں بیٹھا تھا۔حضرت نے اس سے پوچھا کہ تم نے اس عرصہ میں کیا کیا دیکھا۔یوگی نے جواب دیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں میں تو سو رہا تھا۔حضرت نے فرمایا کہ پھر تو یہ کام بالکل بے کار ہے تم کو اس عرصہ میں یہاں کا کچھ علم ہوا نہ وہاں کا۔

مہر بابا کا قصہ:

ایک واقعہ ڈاکٹر پال برنٹن نے اپنی کتاب A SEARCH IN SECRET INDIA میں لکھا ہے کہ جب ہندوستان میں ہندو روحانیت اور خصوصاً یوگ کی تحقیقات کر رہا تھا تو اس نے ایک شخص مہر بابا نامی کی بابت سنا جو جنوبی ہند میں بہت مشہور تھا۔چنانچہ برنٹن اس سے ملا۔بابا غار میں رہتا تھا اور اس کے مریدوں نے غار کے آس پاس گھر بنا لیے تھے۔مہر بابا تمام پارسیوں کا متفقہ پیشوا تھا' لیکن جنوبی ہند کے تمام آدمی اس سے عقیدت رکھتے تھے۔اس کا دعوئی تھا کہ میں نیا مسیحا ہوں۔ابھی میں عبادت میں مصروف ہوں لیکن ایک وقت آنے والا ہے جب کہ میں دنیا کے تمام مذاہب کو ملا کر ایک نیا مذہب بناؤں گا اور کرہ زمین سے شر و فساد کو مٹا کر ابدی امان قائم کر دوں گا۔برنٹن نے اس کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی۔اس نے لکھا ہے کہ ابھی ناتجربہ کار ہے شیخی زیادہ مارتا ہے۔بہر حال اس کے سال بعد مہر بابا اپنے غار سے نکلا اور امریکہ میں اپنے مشن کا پرچار کیا۔بہت آدمی اس کے ہم خیال ہو گئے اور وہ ابھی چار پانچ سال ہوئے شمالی یورپ میں اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے ہوئے مر گیا۔یہ قصہ میں نے جس خیال سے لکھا ہے وہ یہ بتانا ہے کہ مہر بابا کو یہ بزرگی اور فقیری کہاں سے ملی۔

برنٹن لکھتا ہے کہ وہ ایک متوسط الحال پارسی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔پونا کے ایک کالج میں ایف اے میں پڑھتا تھا۔کافی خوبصورت تھا۔جس سڑک سے وہ کالج آتا جاتا تھا وہاں راستہ میں ایک مسلمان فقیرنی رہتی تھی جو بابا جان کے نام سے مشہور تھی۔(میں راقم الحروف اس سے خود کئی دفعہ ملا ہوں) یہ ایک بزرگ اور بوڑھی عورت تھی۔سینکڑوں کرامتیں اس سے ظہور پذیر ہوئی

تھیں اور ہزاروں آدمی اس کی زیارت کو روزانہ آتے تھے' ایک دن مہربابا سائیکل پر سوار کالج سے گھر جا رہا تھا۔ جب وہ بابا جان کے پاس سے گزرا تو بابا جان نے اس کو اشارہ کیا کہ ادھر آؤ۔ وہ سائیکل سے اتر پڑا اور بابا جان کے پاس آ کر نہایت ادب سے سلام کیا۔ بابا جان نے کھڑے ہو کر اس کو گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دے کر کہا جاؤ۔ مہربابا گھر پہنچا تو اس پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے کتابیں پھینک دیں' کھانا پینا چھوڑ دیا اور سارا وقت عبادت میں گزارنے لگا۔ چند سال بعد اس نے گھر بھی چھوڑ دیا اور ناسک کے قریب جنگل میں ایک زمین دوز مکان بنا کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس سے کشف و کرامات کا اظہار بھی ہونے لگا اور وہ مرجع خلائق بن گیا۔

اب آپ غور کریں اور دیکھیں کہ غیر مسلم اور خصوصاً ہندوؤں کے تصوف میں کس قدر محنت اور ریاضت کرنی پڑتی ہے' دنیا کو چھوڑنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر دس پندرہ برس بعد کرامت اور کشف حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ مسلمان سالک میں دس پندرہ ماہ میں (بشرط محنت) یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ ہمارا مقصود اور ٹارگٹ خدا ہے۔ اس لیے ایسی چیزیں راستہ کی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن ہندوؤں کا تو مقصود ہی کشف و کرامت ہے وہ تو یہ حاصل ہونے کے بعد وہی ٹھہر جاتے ہیں۔ مگر وہیں ہم خدا تک پہنچنے کے لیے آخر عمر تک اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں رکنے کا نام نہیں لیتے۔

الٰہیات (اللہ کا دیدار اور اس کے حصول کا طریقہ):

حکمت کا تیسرا اور سب سے اعلیٰ و افضل درجہ الٰہیات ہے۔ اگر کوئی مختلف علوم میں سے یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ان میں سب سے افضل کون سا علم ہے تو ان علوم کے موضوعات کو دیکھنا چاہیے۔ جس علم کا موضوع سب سے افضل ہو وہی علم سب سے افضل ہے۔ الٰہیات کا مقصود چونکہ ذات کبریا ہے اس لیے یہ علم دیگر تمام علوم سے یقیناً افضل ہے۔ پھر اس علم میں یہ بات نہیں ہے کہ کتابیں پڑھ لیں اور موضوع تک پہنچ گئے۔ بلکہ اس میں پہلے کچھ عمل کرنا پڑتا ہے پھر انسان موضوع یعنی ذات باری تعالیٰ کے دیدار تک پہنچ پاتا ہے۔ وہ عمل کیا ہیں؟ چونکہ سوال خود ذات

خداوندی کے بارے میں ہے۔اس لیے جواب کا ماخذ بھی صرف قرآن سے ہونا چاہیے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب قرآن میں خود دیا ہے۔فرماتے ہیں:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا

''یعنی جو یہ چاہے کہ اس کو خدا کی ملاقات یا دیدار میسر آئے تو اسے چاہیے کہ عمل صالح کرے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''(الکہف:110)

اس آیت میں دو حکم ہیں:

۱۔عمل صالح کرو۔

۲۔شرک کبھی نہ کرو۔

عمل صالح بیسیوں ہو سکتے ہیں۔مثلاً نماز،روزہ،حج،زکوٰۃ اور قرآن کے تمام اوامر ونواہی۔تو یہ حکم عام ہے لیکن دوسرا حکم صرف ایک بات کے لیے ہے کہ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

اعمال صالح میں اوامر ونواہی کے علاوہ اور ایسے اعمال بھی ہیں جن میں اللہ کی دید کے قابل بنانے کی صلاحیت ہے۔وہ بھی قرآن میں ہیں۔میں ان کو آگے بیان کروں گا۔

عقیدہ توحید:

یہاں یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ شرک کی بابت جو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید کے عقیدے پر چٹان کی طرح جمے رہو کبھی کسی حالت میں بھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ اللہ کے سوا کوئی اور طاقت بھی ہے جو میرا کچھ بگاڑ سکتی ہے یا مجھے سزا دے سکتی ہے یا مصیبت کے وقت میری مدد کر سکتی ہے۔یہ صرف اس کی ذات ہے جو مجھے عدم سے وجود میں لائی۔جس نے مجھ کو پیدا کیا اور مجھ کو مارے گا۔صرف وہی ہے جو پیدا ہونے سے پہلے میرے ساتھ تھا۔اب بھی ہر وقت ساتھ ہے اور مرنے کے بعد بھی ساتھ رہے گا۔پھر اس کو چھوڑ کر میں کسی اور کا سہارا کیوں تلاش کروں۔اس لیے ہر خوشی کے وقت اس کا شکر کرو اور ہر مصیبت کے وقت صرف اسی کو مدد کے لیے پکارو۔

سورہ آل عمران آیت 175 میں ہے

فَلاَ تَخَافُوهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

''اگر مومن ہوتو مجھ سے ہی ڈرو۔شیطان اوراس کے دوستوں سے نہ ڈرو۔''

شیطان کے دوست کون ہیں؟ تمام کافر اور وہ بت جن کو یہ کافر پوجتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ پلید اور خبیث ارواح جو سزاً اس مادے کے پھندوں میں قید ہیں۔ دوزخ یعنی عالم مثال میں جانے کے بھی قابل نہیں اور وہ جنات بھی شیطان کے دوست ہیں جو کافر ہیں۔سورہ بنی اسرائیل آیت 56 میں ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلاَيَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلاَ تَحْوِيْلاً☆

''کہہ دیجیے کہ اللہ کے سوائے جن کو تم پکارتے ہو (مدد کے لیے) وہ نہ تمہاری تکلیف دور کر سکتے ہیں نہ (تقدیر) بدل سکتے ہیں۔''

سورہ رعد آیت 16 میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

''کہہ دیجیے کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہے۔وہ ایک ہے اور سب پر غالب ہے۔''

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ تخلیق کے بارے میں سورہ الصافات میں ارشاد ہوتا ہے

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصافات:96)

''اللہ نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان چیزوں کو بھی جو تم بناتے ہو۔''

تعجب ہے ان لوگوں پر جو ایسی صاف صاف آیات کی موجودگی میں اللہ کے سوا پیروں، ولیوں، نبیوں اور موکلوں وغیرہ کو مدد کے لیے پکارتے اور پھر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر صرف توحید کی تعلیم دینے کے لیے بھیجے گئے تھے نہ کہ معجزے دکھانے کے لیے۔

برادران سلسلہ! آپ سب اللہ کے فضل و کرم سے توحیدی ہیں۔آپ کو سختی سے اپنا محاسبہ کرنا

چاہیے کہ صرف نام ہی کے توحیدی تو نہیں۔ سچ مچ کے توحیدی ہیں۔توحید میں اتنی طاقت ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی توحیدی ہے تو خواہ اس اکیلے کے سامنے دنیا کی ہزار بلائیں موجود ہوں' شیر منہ کھولے دھاڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے ہوں' ہزاروں کفار کا لشکر حملہ کر رہا ہو' سر پر ایٹم بم لیے ہوائی جہاز چکر لگا رہے ہوں اس کے پائے ثبات میں ذرا بھی تزلزل نہ آئے گا۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ توحیدی کسی سے نہیں ڈرتا۔

مگر یاد رکھو کہ کسی سے نہ ڈرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ لوگوں کے ساتھ بدتمیزی اور سختی و درشتی سے پیش آؤ۔ خوش خلقی بھی توحیدی کا شیوہ ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں جانی چاہیے۔ یاد رکھو خدا کو دیکھنے کے لیے اس کے راستے میں پہلا قدم وہ شخص رکھ سکتا ہے جو

1 پکا توحیدی ہو 2 اس کے بعد اوامر ونواہی کی پابندی

3 تیسری چیز اللہ کا ذکر اور یاد ہے۔ (ذکر کے معنی منہ سے اللہ اللہ کہنا اور دل سے یاد کرنا دونوں باتیں مراد ہیں۔)

4 چوتھی چیز تزکیہ اخلاق ہے۔ 5 پانچویں چیز قطع ماسویٰ اللہ ہے۔

توحید کا بیان ہو چکا ہے۔ اوامر ونواہی کو سب مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لیے اب ذکر کا بیان کیا جاتا ہے۔ مگر ذکر کا بیان کرنے سے پہلے بتانا بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں میں ایک فرقے کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا دیدار ہو ہی نہیں سکتا اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ کو دیدار الٰہی نہ ہوسکا۔ اور وہ ہمیشہ رب ارنی پکارتے اور لن ترانی سنتے رہے تو تم کو کس طرح ہوسکتا ہے۔ تو ان لوگوں کو چاہیے کہ سورہ طٰہٰ اور سورہ نحل پڑھیں۔ جن میں پیغمبری ملنے سے پہلے ہی موسیٰ k کو آگ کے نور کی شکل میں اللہ کا دیدار ہوا اور پیغمبری عطا کی گئی۔ سوال یہ ہے کہ تو پھر وہ بعد میں رب ارنی کیوں کہتے رہے۔ تو بات یہ ہے کہ پہلے تو انہوں نے آگ میں اللہ کا ایک صفاتی جلوہ دیکھا تھا۔ اب پیغمبر ہونے کے بعد وہ خدا کی ذات بحت یعنی اس کی حقیقت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جو پاک ہے تمام صفات اور رنگ و بو سے اور دیکھنا بھی چاہتے تھے مادی آنکھوں سے۔ اس واسطے لن ترانی سنتے تھے۔ لیکن طور پر بے ہوش ہونے کے عالم میں یقیناً

انہوں نے روحانی آنکھ سے خدا کی ذات بحت کا مشاہدہ کرلیا اور پھر کبھی سوال نہ کیا۔

لقاءاللہ کے متعلق قرآن میں اس قدر آیتیں ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے نہ معلوم یہ لوگ کس طرح کہتے ہیں کہ خدا کا دیدار ممکن ہی نہیں۔ یہ سب آیتیں اس چھوٹے سے خطبہ میں درج نہیں کی جاسکتیں۔لہٰذا صرف حوالہ لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔دیکھئے سورہ یونس آیت 15۔45 ‘سورہ رعد آیت 2 ‘سورہ کہف کی آخری آیت جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔سورہ عنکبوت آیت 5 اور آیت 23 اور آخری آیت۔ان سورتوں کے علاوہ اور بھی کئی جگہ لقاءاللہ کا ذکر آیا ہے اور سب سے صاف صاف تو سورہ انشقاق میں ارشاد ہوتا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحاً فَمُلَاقِيهِ (انشقاق:6)

اس آیت میں تو مسلمانوں کا بھی ذکر نہیں ہر انسان کے لیے فرمایا ہے کہ ”جو ہمارے لیے ایسی کوشش کرے گا جو کوشش کا حق ہے تو ہم اپنی لقاء سے اسے ضرور سرفراز فرمائیں گے۔“

آپ غور کریں کہ اللہ جیسے رحیم و کریم آقا سے یہ امید رکھنا کہ وہ کسی کی سچی طلب اور پوری پوری کوشش کے باوجود اس کو فائز المرام نہ فرمائے گا۔درحقیقت اس کے دامن رحمت کی وسعت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ان آیات کے علاوہ احادیث بھی ہیں۔اس جگہ صرف ایک درج کی جاتی ہے۔فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر کہ ”آج میں نے اپنے پروردگار کو بہترین صورت میں دیکھا۔اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا جس سے میں نے سینہ میں ٹھنڈک محسوس کی اور اس کے بعد سارا عالم مجھ پر منکشف ہو گیا۔“(مشکوٰۃ شریف)

اب ذکر کی بات سنیے:

ذکر:

اللہ نے اپنے ملنے کے لیے ایسا سیدھا اور آسان طریقہ بتایا ہے کہ ہر انسان جس کو صحیح طلب ہو با آسانی اس پر عمل کر سکتا ہے۔وہ طریقہ کیا ہے؟وہ ہے اللہ کا ذکر زبان سے بھی اور دل سے بھی۔ذکر کے متعلق بہت سی آیات ہیں مگر بخوف طوالت صرف تین آیتیں دیتے ہیں۔ان میں

سے پہلی دو آیتیں مبتدیوں کے لیے اور آخری منتہیوں کے لیے ہے۔

پہلی دو آیتیں اس سال کے منشور دعوت اور چراغ راہ کے سرورق پر درج ہیں۔

1...... وَاذْکُرْ رَبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ☆

''اور اپنے رب کو دل میں یاد کرو۔زاری سے اور ڈر سے' زبان سے آواز نکالے بغیر صبح اور شام اور غافلوں سے مت ہو۔'' (الاعراف:205)

2...... فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ (النساء: 103)

''پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہر حال میں۔''

3...... وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً (المزمل:8)

''یعنی اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور سب کو چھوڑ کر اسی کے ہو جاؤ۔''

مطلب یہ ہے کہ قلبی تعلق اللہ کے سوا کسی سے بھی باقی نہ رہے۔

الغرض! ذکر بنیاد ہے علم الٰہیات کے حصول کی۔لفظ اللہ یعنی اسم ذات کا ذکر سانس کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔جیسا کہ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔یہ ذکر پورے ذوق وشوق اور پابندی سے کم از کم دو تین برس ضرور کرنا چاہیے۔یہاں تک کہ اللہ کی یاد دل میں مستقل ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر لفظاً ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔اس کے ساتھ ہی دل میں جوش پیدا کرنے کے لیے نفی اثبات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔یہ جہر سے ہو تو بہت اچھا ہے۔اس سے خون میں گرمی پیدا ہوتی اور دل و دماغ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اللہ بدن کے ایک ایک روئیں اور خون کے ایک ایک ذرے میں مل جاتا ہے۔یوں کہیے کہ روزانہ بیٹری کو چارج کرنے کے مترادف ہے۔اس لیے یہ بھی بہت ضروری ہے۔اگر زیادہ نہیں تو کم از کم پندرہ منٹ کر لینا کافی ہے۔پچھلے زمانے میں یہ ذکر 4۔5 ہزار مرتبہ روزانہ بتایا جاتا تھا مگر مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ

پاس انفاس اصل چیز ہے اور نفی اثبات تو صرف جوش وخروش پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرا پہلو نفی اثبات کا یہ ہے کہ نفی کرنا آ جائے اور اس کی عادت ہو جائے۔ جب تک نفی درست نہ ہو اثبات کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا اس لیے ذکر آہستہ آہستہ کرنا چاہیے جلدی نہیں۔ بعض ہمارے بھائی غلطی سے سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہفتہ واری حلقہ ذکر میں شریک ہونا ہی کافی ہے۔ وہ سخت غلطی پر ہیں ان کو مطلق کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ یہ ذکر روزانہ گھر میں نماز فجر سے پہلے یا بعد میں کرنا چاہیے۔ یہ نہ ہو تو نماز عشاء کے بعد سہی۔ آپ یہ سب کچھ جانتے ہیں اور جو بھائی نئے ہیں وہ دوسرے پرانے بھائیوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ اس واسطے ذکر کا زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

تزکیہ اخلاق:

اب چوتھی چیز تزکیہ اخلاق ہے۔ یہ چیز بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ پاس انفاس۔ ذکر سے قلب میں روح اور رجان پڑتی ہے اور حرارت وسوز عشق الٰہی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن گرمی اور سوز تو پیدا ہو جائے اور تزکیہ اخلاق نہ کیا جائے تو وہ حرارت بجائے فائدے کے نقصان پہنچائے گی۔ دراصل وہ حرارت ہی مقصود ہے۔ بعض اشخاص کے دل میں گرمی پیدا نہیں ہوتی لیکن باقی کوائف سب ٹھیک ہوتے ہیں تو ان کو پریشان نہ ہونا چاہیے۔ اس حرارت کے ساتھ ہلکا سا نشہ اور سرور ہوتا ہے اور اس حالت میں سالک بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔ جتنے کرشمے اور کرامات سالک سے سرزد ہوتے ہیں اس حرارت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ حرارت ایک خاص درجہ تک اگر کسی میں پیدا ہو جائے تو اس میں اس قدر کشش مقناطیسی پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص اس سے محبت کرنے لگتا ہے اس کا والہ وشیدا ہو جاتا ہے اور اس کا ہر حکم مانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تزکیہ اخلاق نہ ہوا ہو تو انسان اس طاقت سے غلط اور ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ اس لیے تزکیہ اخلاق بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے بزرگ سفر کرنے کا حکم دیتے تھے، سقہ بن کر پانی پلواتے تھے، بھیک منگواتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ باتیں کون کرے گا۔ لہٰذا میں نے ایک بہت ہی سہل طریقہ اس کا نکالا ہے اور وہ یہ ہے کہ غصہ اور نفرت کو دل سے بالکل نکال دو۔ ایسا کرنے سے باقی برائیاں رفتہ رفتہ خود ہی جاتی رہیں گی۔ یہ عمل

گھر ہی سے شروع ہونا چاہیے۔یعنی اپنے بیوی بچوں، رشتہ داروں، ملازموں وغیرہ پر کبھی غصہ نہ کرو۔خواہ ان سے کیسی ہی خطا سرزد ہو۔ضبط کرو اس سے قوت برداشت پیدا ہو گی جو ہر بڑے آدمی خصوصاً اصلاح کرنے والوں کے لیے بہت ضروری ہے۔دل تو چاہتا تھا کہ اس پر دو چار صفحے لکھتا لیکن اول تو چار ماہ کی مسلسل بیماری سے دماغ کمزور ہے اجازت نہیں دیتا دوسرے وقت بھی تھوڑا رہ گیا ہے۔آپ پہلے ہی سب کچھ جانتے بھی ہیں جس کسی کو تفصیل معلوم کرنا ہو ''تعمیر ملت'' سے معلوم کر سکتا ہے۔یہ سب کچھ اس میں لکھا ہے غصہ اور نفرت کی نفی کے ساتھ ساتھ دو چیزیں اختیار کرو ایک عالمگیر محبت دوسرے حق یعنی خدا کی ہر مخلوق سے محبت سے پیش آؤ اور جو کام کرو حق کرو۔

قطع ماسویٰ اللہ:

یہ چار باتیں جو اوپر بیان ہوئیں اوسط درجہ کا بزرگ بننے کے لیے ضروری ہے۔اگر یہ سب کچھ ٹھیک ٹھیک کیا جائے تو سالک میں کشف و کرامات کی وہ طاقت خود بخود پیدا ہو جائے گی جو غیر مذاہب کے صوفیوں کی کسی عبادت و ریاضت اور یوگ وغیرہ سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔مسمریزم، ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی انتقال خیال اس کو اس درجہ حاصل ہو گا کہ دوسرے طریقوں سے ان طاقتوں کو حاصل کرنے والے کبھی حشر تک نہیں کر سکتے۔اعلیٰ درجہ کی بزرگی حاصل کرنے اور مراتب اعلیٰ تک پہنچنے یعنی قرب خداوندی حاصل کرنے کے لیے پانچویں بات یعنی قطع ماسویٰ اللہ بدرجہ کمال پیدا کرنا پڑتی ہے اوسط درجے تک کے لیے بھی ضروری تو ہے مگر اس قدر زیادہ نہیں۔

قطع ماسویٰ اللہ کیا ہے؟ یہ ہے کہ سالک کا دلی تعلق اللہ کے سوا دنیا کی کسی شے مثلاً بیوی بچے' روپیہ پیسہ، عیش و عشرت وغیرہ کسی چیز سے سوت کے دھاگے کے برابر بھی قائم نہ رہے لیکن حقوق العباد کما حقہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔یہ کام بہت مشکل ہے' کرنے والوں کے لیے کوئی چیز مشکل نہیں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ہزاروں نے کیا ہے اب کر رہے ہیں اور آئندہ کریں گے۔طلب صحیح' ہمت بلند اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔

الغرض یہ ہے وہ علم حکمت جو حضور نبی کریمﷺ اپنے ساتھیوں کو سکھاتے تھے۔علم حقائق

الاشیاء۔حکمت کے عام معنی ''عقل کی باتیں'' بھی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حضور ﷺ نے عرب کے ان پڑھ جہلا کو اپنی تعلیم سے علم کا وہ نور بخشا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے جھجک چلے جاتے اور ایسی عقل مندی کی باتیں کرتے کہ بڑے بڑے عالم و فاضل دنگ رہ جاتے اور ان کا جواب نہ دے سکتے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ علم الٰہیات سے انسان میں عقل سلیم اور قلب سلیم پیدا ہو جاتا ہے اور جس کو یہ دونوں نعمتیں میسر آ جائیں وہ بڑے بڑے فلسفہ دانوں کو بھی لا جواب کر دیتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علم الٰہیات حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے تو جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے۔اس میں عقل سلیم اور قلب سلیم پیدا ہو جاتا ہے۔علم لدنی حاصل ہو جاتا ہے۔جس کے آگے پھر کسی علم کی ضرورت نہیں رہتی۔اس میں وہ روحانی جذبہ اور مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ جو اس کے پاس تھوڑی دیر بھی بیٹھتا ہے اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے اس لیے تمام دنیاوی کام بھی ہمیشہ اس کے حسب دل خواہ انجام پاتے ہیں۔وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور خدا سے جو مانگتا ہے وہی ملتا ہے۔وہ ہمیشہ خوش رہتا اور دوسروں کو خوش رکھتا ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خلق خدا کی اصلاح کرتا اور ان کو خدا تک پہنچاتا ہے۔آخرت کے لحاظ سے وہ نہ بائیں والوں میں ہوتا ہے نہ دائیں والوں میں بلکہ آگے والوں میں ہوتا ہے اور ہمیشہ قرب اور لقائے الٰہی سے شادکام رہتا ہے۔**سبحان اللہ وبحمدہ** خطبہ تمام ہوا اب دعا کرو کہ خدائے رحیم و کریم تمام مسلمانان عالم کا بول بالا کرے۔انہیں کفار و مشرکین کی بالادستی سے نجات دے کر پھر سب پر غالب فرمائے،انہیں فرقہ بندیوں اور تفرقہ پردازیوں سے (جو ان کی ذلت و خواری کی اصل وجہ ہیں) دور فرما کر متحد کر دے۔ان سے شرک کی لعنت دور کرے۔اشخاص پرستی،پیر پرستی اور قبر پرستی جیسی لعنتوں سے نجات دے کر خالص اور پکا توحیدی بنا دے۔آمین یا رب العالمین

خادم خادمان حلقۂ توحیدیہ

عبدالحکیم انصاری

لاہور، 20 اپریل 1974ء

خطبہ......11

5-4-1975

کو چودھویں سالانہ اجتماع پر بمقام ملتان ارشاد فرمایا

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

برادران سلسلہ توحیدیہ............السلام علیکم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے کہ آج ہم سب بھائی ایک سال بعد پھر ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ پچھلے سال ہمارا اجتماع آستانہ میں ہوا تھا۔ جسے سب بھائیوں نے متفقہ طور پر تنگی اور قدرے تکالیف کے باوجود بہت پسند کیا تھا اور سب ہی بھائیوں نے متفقہ طور پر اس خواہش کا اظہار کیا تھا آئندہ تمام اجتماعات لاہور ہی میں ہوا کریں۔ خود میری صحت بھی دور دراز کے سفر کی متحمل نہیں لہٰذا مجھے بھی سب بھائیوں کی اس تجویز سے اتفاق تھا کہ اجتماعات اب لاہور میں ہی ہوا کریں۔ لیکن ہمارے محترم بھائی عزیزم ملک کریم بخش صاحب نے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نہایت دردمند دل اور فراخ حوصلہ عطا فرمایا ہے' ایک مرتبہ پھر ملتان میں اجتماع کرانے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے درخواست کی جسے میں نے ان کے پیار بھرے خلوص اور ایثار و محبت کے جذبے کے پیش نظر قبول کرلیا۔ اس کے لیے سب سے پہلے میں عزیزم ملک کریم بخش صاحب کا اپنی اور تمام حلقہ کی جانب سے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس سے کہیں زیادہ دین و دنیا کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ صحت و زندگی دے اور ہر قسم کی پریشانیوں اور حوادث سے محفوظ رکھے۔ آمین

اس کے بعد میں حلقہ ملتان اور باہر سے آنے والے تمام مہمان بھائیوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے سب کام چھوڑ کر محض اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے اس مقدس اجتماع میں شرکت کی سعادت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ میں آپ کے لیے اور ان سب بھائیوں کے لیے جو بوجہ مجبوری اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ سب کو اپنی رحمت بیکراں اور دینی و دنیاوی نعائم سے سرفراز فرمائے۔ ثم آمین

اس ایک سال کے عرصہ میں ہمارے بہت ہی پیارے بزرگ بھائی آل احمد عباسی صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس کے علاوہ کئی برادران حلقہ کے عزیز و اقارب فوت ہوئے۔ آیئے

ان سب کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے ورثا اور اعزا و اقربا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

برادران سلسلہ!

اس خطبہ میں آپ کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ وہی کچھ بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلے سینکڑوں مرتبہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بتا چکا ہوں۔ اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سلسلہ کے اذکار و اشغال وغیرہ پہلے سلسلوں سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ اور چونکہ عوام پہلے سلسلوں کی باتوں کو نسلاً بعد نسلاً سنتے سنتے ان کے اس قدر معتقد ہو چکے ہیں کہ ہماری باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اور تو اور خود وہ لوگ جو ہمارے حلقہ میں پندرہ پندرہ اور بیس بیس سال سے شامل ہیں ہماری تعلیم کی روح کو ابھی تک نہیں سمجھے۔ اس لیے بار بار لکھنا اور سمجھانا پڑتا ہے۔ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ کی بنیاد توحید ہے اور ہمارا حلقہ اور ہمارے سلوک کی آخری منزل ذات باری تعالیٰ کا قرب اور دیدار ہے۔ یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس عمارت کی بنیاد ہی کمزور یا غلط ہوگی وہ عمارت کبھی مضبوط نہیں ہوسکتی چنانچہ کسی شاعر نے کس قدر سچ کہا ہے کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

توحیدی کا کردار:

اسی لیے میں آپ سے ہمیشہ سے یہی کہا کرتا ہوں کہ توحید کو بدرجہ کمال حاصل کرو اور پکے اور سچے توحیدی بنو۔ تب تمہارے اذکار و اعمال میں وہ طاقت پیدا ہوگی جو خدا تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ صرف زبان سے کہہ دینا کہ ہم توحیدی ہیں اور اپنے نام کے بعد "توحیدی" لکھ کر فخر سے سر اونچا کر لینا ہرگز کافی نہیں۔ بلکہ محض مذاق ہے۔ ایک توحیدی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوائے خدا کے نہ کسی سے ڈرے نہ کسی کے سامنے سر جھکائے، نہ کسی سے مدد مانگے۔ اس کا مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ تم دنیا سے تعلق قطع کر کے رہبانیت اختیار کر لو اور اسباب و وسائل سے کام لینا چھوڑ دو۔ یاد رکھو کہ ترک وسائل اسلام میں قطعاً ناجائز ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اگر تم کو ایسے

دشمن سے واسطہ پڑ جائے جو تمہاری دانست میں بہت زیادہ قوی ہے اور تمہاری جان و مال کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے تو بھی تم اس سے ہرگز نہ ڈرو۔ خدا پر یقینی طور پر بھروسہ رکھو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا اور بے فکر ہو کر اس کا مقابلہ کرو یقیناً تم فتح یاب ہو گے۔ ایسے موقعہ پر تمہاری قوت ارادی اور خدا پر یقین کی طاقت کس طرح دشمن کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کو سمجھانے کے لیے ایک بہت بڑے مضمون کی ضرورت ہے جس کی گنجائش نہیں اس کی بابت میں بہت مختصر طور پر مجملاً کسی دوسرے خطبے میں بیان کر چکا ہوں' یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس وقت تمہارے دل و دماغ سے جو لہریں نکل کر دشمن کے دماغ سے ٹکراتی ہیں وہ اس قدر قوی ہوتی ہیں کہ دشمن حواس باختہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے اور تمہاری تھوڑی سی نفری اس کو اپنی تعداد کثیر سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے اور اس کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو یوں بیان کیا ہے کہ "ہم دشمن کے دل پر خوف طاری کر دیتے ہیں اور وہ مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔" تم کو اگر رات کے وقت جنگل میں بھوت وغیرہ سے ڈر لگا ہو تو تمہیں یاد ہو گا کہ اس وقت خوف کے عالم میں جنگل کا ایک ایک جھاڑ بلکہ ایک ایک تنکا بھوت نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح مفلسی اور ناداری میں بھوک اور فاقہ کا خطرہ ہو اور بظاہر کوئی سامان اور سبب تم کو اس مصیبت سے بچانے کا نظر نہ آتا ہو تب بھی ایک توحیدی کو مطلق ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ خدا پر بھروسہ اور یقین رکھنا چاہیے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اگر تم واقعی توحیدی ہو اور خدا پر اٹل ایمان رکھتے ہو تو یقیناً مدد آئے گی اور کسی ایسے گوشے سے آئے گی جس کا تم کو وہم و گمان بھی نہ ہو گا۔

میرے مرشد مولانا کریم الدین احمدؒ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ "میں ایک مرتبہ مدت دراز تک برما کے جنگلوں میں بعالم استغراق صحرا نوردی کیا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے سخت بھوک لگی کیوں کہ کئی دن سے کچھ کھایا نہ تھا مگر وہاں کوئی چیز بھی کھانے کو نہ تھی۔ نہ درختوں میں پھل تھے نہ ان کے پتے ہی ایسے تھے کہ چبائے جا سکتے۔ مجبوراً ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر دل میں کہا کہ یا اللہ! بھوک بہت سخت ہے برداشت نہیں۔ ابھی دو چار منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ آسمان پر بہت سی چیلیں اڑتی نظر آئیں' وہ بڑی تیزی و تندی سے آپس میں لڑ رہی تھیں۔

غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک چیل کے پنجے میں کوئی چیز ہے جو دوسری چیلیں اس سے چھیننا چاہتی ہیں۔ میں سمجھا کہ یہ خرگوش کا بچہ ہے جو چیل کہیں سے لے آئی ہے۔ آخر میں جنگ اس قدر تیز ہو گئی کہ چیل کے پنجوں میں جو چیز تھی چھوٹ گئی اور بالکل میرے سامنے آ گری۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک رومال ہے جس میں کچھ بندھا ہوا ہے۔ کھولا تو اس میں سے چار پراٹھے اور چار انڈے کی ٹکیاں نکلیں۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پیٹ کی آگ بجھائی۔ تو برادران حلقہ! جو خدا پر واقعی بھروسہ رکھتا ہے۔ خداوند قدوس اس کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔

دائمی مسرت کا حصول (قوتِ برداشت):

اسی طرح اور بھی بہت سے الجھنیں اور پریشانیاں ہیں جو کسی وقت بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مثلاً بیماریاں، مقدمات، میاں بیوی کی ناچاقی، ہمسائیوں کی بے جا زیادتیاں، دفتروں میں افسروں کی ناراضی، ملازمت جانے یا ترقی رکنے کا خوف، کاروبار میں نقصان۔ الغرض ایک بات ہو تو بیان کیا جائے۔ یہاں تو جس طرف دیکھو خطرات اور پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں اور کیوں نہ ہوں جب کہ پیدا کرنے والے نے خود ہی کہہ دیا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ (البلد: 4) ”ہم نے انسان کو پیدا ہی پریشانیوں کے بیچ میں کیا ہے۔“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حالت یہ ہے تو انسان کس طرح اطمینان وسکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے اور اس کو حقیقی خوشی اور دائمی مسرت کس طرح میسر آ سکتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ پکا اور سچا توحیدی بن کر۔ وہ کس طرح؟...... وہ اس طرح کہ کوئی شخص صرف زبان سے یہ کہہ دینے سے کہ میں صرف ایک خدا کو مانتا ہوں تو حیدی نہیں بنتا بلکہ خدا نے قرآن پاک میں جو کچھ احکام و ہدایات دی ہیں ان پر دل سے یقین اور صداقت سے عمل کرنے سے توحیدی بنتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب تم پر کوئی مصیبت پڑے تو حکم ہے کہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ خدا سے مدد مانگو۔ افسوس یہ کہ آج مسلمان صبر کے صحیح معنی بھی نہیں جانتے۔ صبر کے معنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی مصیبت پڑے تو اس کو دور کرنے کے لیے عمل کچھ نہ کرو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے خاموش گھر میں بیٹھ جاؤ اور انتظار کرتے رہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی نہ کسی دن اس مصیبت کو خود دور کر دے

گا۔ چنانچہ زبان سے ایسے ایسے محاورے بھی نکل جاتے ہیں کہ ''ہم تو صبر کیے بیٹھے ہیں''۔ ''میرا صبر پڑے تیری جان پر''۔ ''مجبوری کا نام صبر ہے''۔ وغیرہ وغیرہ۔ صبر کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں بلکہ صبر کے معنی ہیں ''برداشت کرنا اور خوشی سے برداشت کرنا۔ میں بھی پہلے صبر کے وہی معنی سمجھتا تھا جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ لیکن ایک دن فتوح الشام میں جنگ یرموک کی ایک لڑائی کا ذکر پڑھتے ہوئے یہ الفاظ نظر سے گزرے۔

''جب رات کا اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تو لڑائی بند ہو گئی اور صحابہؓ کبار اپنے اپنے خیموں پر واپس آئے تو ان میں دو صحابہ (جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں) جب اپنے خیمے میں پہنچے تو اپنی زرہ بکتر وغیرہ اتارتے ہوئے ایک صحابیؓ نے دوسرے سے کہا: الحمد للہ کہ آج اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑا صبر عطا کیا۔ صبح کی نماز کے بعد جب لڑائی شروع ہوئی اس وقت سے اب تک دونوں ہاتھوں میں تلوار لے کر برابر لڑتا رہا ہوں نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ نمازیں بھی قضا ہو گئیں۔ لیکن میں نے ذرا تکان محسوس نہیں کی۔ دو ایک مرتبہ کچھ سستی سی غالب ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے نئے سرے سے دل میں وہ طاقت پیدا کی کہ نئے ولولہ اور جوش سے پھر لڑنے لگا اور سینکڑوں کافروں کو جہنم پہنچایا۔''

یہ الفاظ پڑھ کر میرے ذہن میں صبر کے معنی اس طرح کھلے جیسے کہ کوئی چیز آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ اس وقت میں سمجھا کہ صبر کے معنی تو برداشت کرنے کے ہیں اور وہ بھی خوشی سے برداشت کرنے کے ہیں۔ یعنی جب تم کو کوئی مشکل پیش آئے یا کوئی مصیبت آ پڑے تو اس کو دفع کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرو اور وہ بھی اس طرح کہ سستی، تکان یا مایوسی کا خیال تک تمہارے دل میں نہ آنے پائے۔ اب آپ خود غور کریں کہ جب کوئی آدمی اس شان سے کوشش کرے گا تو اول تو وہ یقیناً کامیاب ہو گا اور اگر نہ بھی ہو تو کوشش کے دوران مصیبت کا خیال اس کے دل و دماغ کو ہرگز اس طرح متاثر نہ کرے گا جیسا کہ خاموش بیٹھے رہنے میں کرتا ہے۔

الغرض ایک توحیدی کہیں بھی اور کسی بھی حال میں ہو سوائے خدا کے نہ کسی سے ڈرتا ہے نہ کسی سے مدد چاہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا کے بنائے اور بتائے ہوئے وسائل سے کام لینا ترک کر دیتا ہے بلکہ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرنے کے بعد بھی اگر

ناکامیاب ہو جاتا ہے تب بھی ہمت نہیں ہارتا اور مایوس نہیں ہوتا بلکہ خوش ہی رہتا ہے۔ایسی حالت میں وہ اس آیت کی طرف رجوع کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔لیکن اللہ اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کرتا (اس لیے نہیں دیتا) یہ آیت اس کو بے انتہا سکون اور طاقت قلبی عطا فرماتی ہے۔اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میری کوشش کامیاب ہو جاتی تو انجام کار میرے لیے مفید ہونے کی بجائے انتہائی تکلیف دہ اور ممکن ہے کہ تباہ کن ثابت ہوتا۔

برادران حلقہ! ایسے تین چار واقعات خود مجھ کو اپنی زندگی میں پیش آئے ہیں اور میرا ذاتی تجربہ ہے۔آپ کو میرے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے میں یہاں وہ واقعات محض طوالت کے خوف سے تحریر نہیں کر رہا لیکن عام مجلسوں میں آپ لوگوں کو سناتا رہتا ہوں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم پر جو مصیبت آنے والی ہے وہ ہم نے پہلے ہی سے تمہارے نام کتاب میں لکھ دی ہے۔اس آیت سے بھی تم کو ذہنی اور قلبی تقویت ملنی چاہیے۔تم کو سوچنا چاہیے کہ جب اللہ نے یہ مصیبت ہمارے نام پہلے ہی لکھ دی ہے تو اس پر گھبرانا' رنج کرنا یا مایوس ہو جانا' انتہائی ناشکری' کفران نعمت بلکہ ایک قسم کی بغاوت ہے۔اگر تم آنے والی مصیبتوں کو نعمت سمجھ لو تو تم کو دائمی مسرت جیسی نعمت حاصل ہو جائے جو کہ کروڑوں اور اربوں روپے میں بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔یہاں آپ کے دل میں یقیناً یہ خیال یا سوال پیدا ہو گا کہ بھلا مصیبت کو نعمت اور رحمت کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے قرآن پاک غور سے نہیں پڑھا۔غور سے پڑھا ہوتا تو یہ اعتراض ہر گز دماغ میں پیدا نہ ہوتا۔فرماتے ہیں: عَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ (قرآن کا علم ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اس میں سے نتائج اخذ کرتے ہیں) تو بہت سی آیات ایسی ہیں کہ اگر ان کو بار بار غور سے پڑھا جائے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو نہایت صحیح معنی سمجھ میں آتے ہیں۔

دیکھئے اللہ کے فرمان کے مطابق مصیبت کس طرح نعمتوں کے تکمیل کا باعث ہوتی ہے۔مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا ہے اور تضرع و زاری کے ساتھ یاد آتا ہے۔قلب میں جو غرور اور رعونت یا غصہ پیدا ہوتا ہے وہ عام جسمانی اور قلبی و دماغی کمزوری کی وجہ سے اگر بالکل کمزور نہ ہو بہت کچھ کم ضرور ہو جاتا ہے اور طبیعت شر و فساد سے ہٹ کر نیکی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔زندگی

سے مایوسی کی وجہ سے انسان اپنے پچھلے گناہوں سے سچی اور پکی توبہ کر لیتا ہے۔ یہ تو ہے عوام کے لیے۔ سالکان راہ خدا کا تجربہ ہے کہ جس قدر کسی کو تکلیف ہوتی ہے اسی قدر اس کا قلبی تعلق خدا سے زیادہ ہو جاتا ہے اور قرب اور لقائے باری تعالیٰ کے حصول میں جس قدر مدد اس سے ملتی ہے وہ کسی اور ریاضت و عبادت سے نہیں ملتی۔ اب خود سوچیے کہ لقاء اور قرب خداوندی سے زیادہ بڑی نعمت اور کون سی ہو سکتی ہے اور یہی ہے وہ تکمیل نعمت جس کا ذکر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مصیبتوں اور تکلیفوں سے سب سے بڑی نعمت جو انسان خصوصاً ایک سالک کو ملتی ہے وہ ہے قوت برداشت۔ یہ صفت اتنی اہم ہے کہ اگر انسان میں نہ ہو تو وہ یا تو پاگل ہو جائے گا یا مر جائے گا۔ غور کیجیے کہ ہر انسان کو صبح سو کر اٹھنے سے رات کو سونے تک ایسی بیسیوں باتیں پیش آتی ہیں جو اس کو سخت ناگوار گزرتی ہیں اور اس کے دماغ پر بہت برا اثر کرتی ہیں۔ مثلاً ناشتہ حسب منشاء نہ تھا۔ ایک بچے نے پلیٹ توڑ دی' دوسرے نے اپنے چاقو مار لیا۔ خرچ پر بیوی سے جھڑپ ہو گئی۔ اب دفتر پہنچے تو دیکھا کہ صاحب بہادر کا پارہ کھولاؤ کے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ دن بھر جا و بے جا جھاڑ پڑتی رہی۔ گھر کو لوٹے تو راستے میں ایک دوست سے فضول سی بحث ہو گئی۔ الغرض نوے فیصدی لوگوں کے دن رات ایسی ہی لغویات میں صرف ہوتے ہیں۔ پہلے تو وہ برداشت کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ عادی ہو جاتے ہیں۔ سیاست دانوں کے دن رات بھی جوڑ توڑ اور سیاسی جھگڑوں میں کٹتے ہیں۔ بہت بڑے اولوالعزم لوگ جو زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ ستیز۔ کے اصول پر چل کر اپنا راستہ ہی سارے ملک و معاشرے سے الگ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے تفکرات بھی اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔

مہم جو بہادروں کی ہمت پر غور کیجیے موت سے لڑ کر پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرتے ہیں۔ میدان جنگ میں جب انتہائی گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہو اگر فوجوں کو لڑانے والے افسر اور جنرل برداشت کی قوت سے عاری ہوں یا گھبرا جائیں تو ساری فوج کی تباہی اور شکست فاش یقینی ہے۔ چنگیز خاں کے تین برس تک سخت خارش رہی مگر اس نے تین برس میں ایک مرتبہ بھی نہیں کھجایا۔ یہ ہے قوت برداشت۔ نپولین بارہ گھنٹے گھوڑے پر سوار رہتا نیند آتی تو وہیں سو جاتا۔

مصطفیٰ کمال پاشا جب پہلی جنگ عظیم میں گیلی پولی پر انگریزوں سے لڑ رہا تھا تو اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر ایک پہاڑی کی چوٹی پر بنایا تھا۔ہیڈ کوارٹر کیا تھا صرف ایک خیمہ تھا۔وہیں سے وہ اپنی فوج کولڑاتا تھا۔ایک دن انگریزوں نے اس قدر شدید گولہ باری کی کہ گولے خیمے سے بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر گرنے لگے۔سٹاف کے افسروں نے کہا کہ آپ کا خیمہ اور پیچھے لگا دیں۔اس نے انکار کر دیا۔وہیں سے فوج کو لڑاتا رہا اور آخر کار انگریزوں کو ایسی سخت شکست دی جو برطانیہ کی تاریخ میں سب سے بڑی اور سب سے تباہ کن شکست تھی۔یہ ہے قوت برداشت جس کے بغیر دنیا کے کسی عظیم الشان کام میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

پیغمبروں کی ہمت اور قوت برداشت پر نظر کیجیے۔جاہل عوام کی اصلاح کے لیے کیسی کیسی سخت تکلیفیں اٹھاتے ہیں لیکن ان کے پائے ثبات میں تزلزل نہیں آنے پاتا۔خود اپنے نبی کریم ﷺ کی مکے کی 13 سال کی زندگی کا مطالعہ کیجیے اگر حضور ﷺ دشمنوں کے مقابلے میں اس قدر ٹھنڈے دل و دماغ اور برداشت سے کام نہ لیتے اور بات بات پر مشتعل ہو جاتے دشمنوں سے لڑنے لگتے تو آج اس دنیا میں اسلام کا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔یہی حال صوفیوں کا ہے جو لقائے ربانی اور قرب باری تعالیٰ کا مقصد سامنے رکھ کر سلوک طے کرتے ہیں۔ان کو بھی ہر ہر قدم پر خانگی' معاشرتی اور مالی رکاوٹوں اور حوادثات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔حالانکہ اس سلوک کے لیے ضروری ہے کہ جب تک سالک اللہ کا خیال ذہن میں رکھے کوئی شے ارتکاز خیال میں رکاوٹ ڈالنے والی نہ ہو۔چونکہ یہ ممکن نہیں' اس لیے لامحالہ قوت برداشت کا دامن تھامنا اور اسی کی مشق کرنی ہوتی ہے۔جب تک قوت برداشت بدرجہ کمال حاصل نہ ہو جائے راہ سلوک میں دو قدم آگے بڑھنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور یہ تو صرف اتنی دیر کی بات ہے جب کہ سالک مراقبہ یا دھیان میں ہو۔سب سے مشکل بات تو یہ ہے کہ روزانہ کی زندگی میں جو ناقابل برداشت واقعات اور حادثات پیش آتے ہیں ان کا بھی سالک کے دل پر اتنا اثر نہ ہو جو خدا کو بھلا دے مثلاً سالک کا اکلوتا جوان بیٹا مر جائے۔بڑی عزت اور معقول تنخواہ کی نوکری چھوٹ جائے اور پاس ایک پیسہ نہ ہو اور بیوی بچوں کا خرچ ناگزیر ہو جائے' گھر میں آگ لگے یا چوری ہو جائے کہ ایک چیز بھی باقی نہ بچے۔

جھوٹا الزام لگے اور قید خانے کی ہوا کھانا پڑے۔کوئی سخت اور لمبی بیماری آن پڑے اور علاج کی مقدرت نہ ہو۔الغرض یہ اور ایسی ہی کئی اور مصیبتیں ہیں۔جن سے اللہ تعالیٰ اپنے سالکوں کو نوازتا ہے۔جیسا کہ اس نے خود قرآن کریم میں فرمایا ہے۔اب آپ خود سوچیں کہ ان روح فرسا اور ہوش ربا مصائب و آلام کے ہوتے ہوئے کون مائی کالال ہے جو ان کا اثر دل پر نہ ہونے دے اور برابر آگے بڑھتا چلا جائے۔اثر ضرور ہونا چاہیے کیوں کہ اسلامی تصوف میں نفس کو بالکل ہلاک کر دینا اور خواہشات کو قطعاً مٹا دینا سخت منع ہے۔لیکن یہ اثر اگر دس پانچ منٹ نہیں تو زیادہ سے زیادہ دو چار گھنٹے رہنا چاہیے۔اس کے بعد جب خدا کی طرف دھیان کرے تو سوائے خدا کے کچھ بھی یاد نہ رہے۔اس سے روحانی قوت اتنی بڑھتی ہے۔اتنا سکون قلب حاصل ہوتا ہے کہ جس کو تجربہ ہو صرف وہی جان سکتا ہے۔

میں نے جو حلقہ توحیدیہ کی تعلیم میں تزکیہ اخلاق کے لیے غصہ کو نفی کرنا لازم قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غصہ کی نفی سے قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔پہلے زمانہ کے بزرگ قوت برداشت پیدا کرنے کے لیے اپنے مریدوں کو کئی کئی سال تک سفر کرنے کا حکم دیتے تھے۔سقے اور خاکروب کا کام کرواتے اور بھیک منگواتے تھے۔آج زمانہ بدل چکا ہے۔زندگی کے طریقے' سوچنے کے انداز اور ذہنیت بالکل بدل گئے ہیں۔اگر ایسا کوئی حکم دیا جائے تو شاید ایک آدمی بھی حلقہ میں شامل نہ ہو۔پھر غصہ کی نفی میں یہ فائدہ ہے کہ اس کی مشق گھر ہی میں ہو سکتی ہے۔آپ اپنی بیوی کی غلطیوں حتیٰ کہ بدمزاجی پر مطلق غصہ نہ کریں۔بعض باتوں کو نظر انداز کر جائیں اور بعض پر نہایت میٹھے اور نرم لہجہ میں سمجھا دیں۔بچوں کی شرارتوں اور نوکروں کی خطاؤں پر ہرگز غصہ نہ کریں بلکہ نرمی اور پیار سے سمجھا دیں۔آپ دیکھیں گے کہ ادھر آپ کا غصہ بہت کم ہو جائے گا ادھر بیوی بچوں اور نوکروں کی بھی کسی نہ کسی قدر اصلاح ہو جائے گی۔ہمارے حلقہ میں ایک صاحب ہیں جن کے غصہ سے نہ صرف گھر والے بلکہ ماں باپ اور اہل محلّہ بھی ڈرتے تھے اور ڈر کی وجہ سے کوئی ان کے پاس نہ جاتا تھا۔وہ جب بیعت ہوئے اور میں نے غصہ کی برائیاں ان کو سمجھائیں تو انہوں نے نہ صرف دس پندرہ دن میں غصہ بالکل نفی کر دیا بلکہ اب یہ حال ہے کہ وہ گھر اور محلّہ میں سب سے

زیادہ ہر دل عزیز ہیں۔ وہ خود مجھے کہتے تھے کہ قبلہ صاحب جس آدمی میں غصہ ہو وہ انسان نہیں حیوان اور درندہ ہے۔

تسلیم ورضا اور بھائیوں کے خطوط:

اب آپ کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جانی چاہیے کہ ذکر کا حسب دل خواہ فائدہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ دنیا کے تمام تفکرات و آلام کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاؤ کہ جو کچھ اس کو کرنا ہے وہی ہو گا اور اسی میں ہمارا فائدہ ہے اور آنے والی مصیبتوں کو اگر کوئی ٹال سکتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ٹال سکتا ہے۔ لہٰذا اسی سے دعا کرو اسی کے آگے روؤ اور اسی سے مانگو جو مانگنا ہے ہرگز کسی زندہ یا مردہ بزرگ سے استعانت نہ چاہو۔ اس کا ڈائریکٹ تعلق اپنے ہر بندہ کے ساتھ ہے۔ وہ سمیع ہے، بصیر ہے، مجیب الدعوات ہے۔ اگر اس پر بھی تمہاری دعا قبول نہ ہو تو سمجھ لو کہ جو کچھ تم مانگ رہے ہو، خدا اس کو تمہارے لیے اچھا نہیں سمجھتا۔ لہٰذا اپنی مرضی کو اسی کی مرضی کے سپرد کر دو اور جو کچھ بھی ہو اسی پر خوش رہو۔ کیا مسلمان ہو کر یا تو حیدی بن کر تم نے خدا سے یہ ٹھیکہ کر لیا ہے کہ جب تک وہ تمہاری مرضی کے مطابق کام کرتا رہے اس وقت تک وہ تمہارا خدا اور تم اس کے بندے ہو اور جب کوئی کام وہ تمہاری مرضی کے خلاف کرے تو پھر کس کا خدا اور کس کی بندگی؟ لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللهِ لعنت ہے ایسی بندگی پر۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مصیبتوں کو خوشی سے برداشت کرنا راضی برضائے الٰہی رہنا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے کس قدر ضروری ہے مگر یہاں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ ہمارے حلقہ والوں کے جو خطوط آتے ہیں ان میں اسی فیصد میں ایسی درخواستیں اور مطالبات ہوتے ہیں کہ گویا میں خود خدا ہوں (نعوذ باللہ) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام اختیارات میرے سپرد کر دیئے ہیں۔ چنانچہ ان خطوط میں سے چند ایک کے اقتباسات بطور نمونہ "مشتے از خروارے" یہاں لکھے جاتے ہیں۔

قبلہ صاحب (1) آمدنی بہت قلیل اور اولاد کثیر ہے ترقی کی دعا فرمائیں۔ (2) مجھے صرف تین سو تنخواہ ملتی ہے، 8 بچے ہیں گزارہ نہیں ہوتا۔ (3) قرضہ بہت ہے ہر وقت پریشان رہتا ہوں کوئی عمل یا تعویذ بھیج دیں۔ (4) بیوی بہت بدمزاج ہے، کوئی وظیفہ لکھیں کہ اس کا مزاج ٹھیک ہو

جائے اور مجھ سے لڑنا چھوڑ دے۔(5) خاوند بہت ظالم ہے' میرے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہے اور بچوں کو بھی مارتا رہتا ہے۔(6) میری شادی کو 8 برس ہو گئے ہیں اولاد نہیں ہوئی۔(7) بچے بہت شریر ہیں پڑھنے سے دل چراتے ہیں۔کوئی عمل لکھیں۔(8) میرے صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی ہیں' اولاد نرینہ کے لیے دعا فرمائیں۔(9) پڑوسی بہت تنگ کرتے ہیں' سخت پریشان ہوں دعا کریں کہ وہ درست ہو جائیں یا پڑوس چھوڑ جائیں۔(10) بچے ہمیشہ بیمار رہتے ہیں کوئی عمل لکھیں۔(11) گھر میں ہر وقت جھگڑا رہتا ہے کوئی عمل بتائیں۔(12) میری بھینس 13 سیر دودھ دیتی تھی اب صرف 3 سیر دودھ دیتی ہے کوئی تعویذ بھیج دیں۔(13) بھینس کے تھنوں میں سے دودھ کی بجائے خون آتا ہے تعویذ بھیج دیں۔(14) ایک بکری تھی جس کا دودھ بچے پی لیتے تھے وہ بھی چوری ہوگئی دعا کریں مل جائے۔(15) دشمنوں نے جھوٹا مقدمہ کیا ہوا ہے کامیابی کی دعا فرمائیں۔(16) میں نے پانچ بانڈ خریدے ہیں دعا کریں کہ اول انعام نکل آئے۔"

الغرض ننانوے فی صدی خطوط میں یہی خرافات ہوتی ہیں۔کہاں تک لکھوں کیا میری تعلیم کا یہی اثر ہوا ہے۔کیا یہ لوگ کسی لحاظ سے بھی توحیدی کہلانے کے مستحق ہیں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں اپنے مشن میں ناکام رہا ہوں۔میں اپنی طرف سے تو فیض پہنچانے اور ان کے اخلاق کو سدھارنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں کرتا۔پھر خدا جانے ان لوگوں میں خدا سے وہ تعلق اور وہ روحانی سپرٹ کیوں نہیں پیدا ہوتی جو ہونی چاہیے یا تو یہ لوگ تعلیم پر عمل نہیں کرتے یا پھر نئے آنے والوں تک میری تعلیم میری اسپرٹ کے مطابق پہنچتی ہی نہیں۔برادران حلقہ یہ آپ کا فرض ہے کہ جو لوگ پرانے ہیں نئے آنے والے بھائیوں کو تعلیم سے پوری طرح آگاہ کریں اور اپنی مثال سے ہر ایک میں وہ سپرٹ پیدا کریں جو ایک توحیدی میں ہونی چاہیے۔

پاس انفاس اور دیدار کی خواہش:

اگر دل و دماغ کو دنیوی تفکرات سے پاک اور بے نیاز کر کے پورے دھیان سے نفی اثبات اور خاص کر پاس انفاس کی مشق مدائمت کے ساتھ کی جائے تو ناممکن ہے کہ تین چار ماہ میں مطلوبہ

نتائج پیدا نہ ہوں۔ آج اس خطبہ میں میں آپ کو پاس انفاس کے ذکر کے متعلق ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں۔ اگر اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ذکر کیا جائے تو اور بھی زیادہ فائدہ ہوگا اور برسوں کا کام چند ماہ میں ہو جائے گا۔ یہ نکتہ آج تاریخ تصوف میں پہلی مرتبہ بتایا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کبھی کسی بزرگ نے نہیں بتایا۔ مجھ سے سوال کیا گیا کہ پاس انفاس کے متعلق قرآن پاک میں جو آیت ہے۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ ...... سے وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ اس کے پہلے الفاظ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ الفاظ کے لفظی معنی تو ہیں "اپنے رب کو یاد کرو اپنے نفس میں" لیکن نفس میں تو کوئی شے یاد نہیں کی جاتی۔ باتیں تو دل میں یاد کی جاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے بجائے فِيْ قَلْبِكَ کہنے کے فِيْ نَفْسِكَ کیوں کہا اس میں کیا حکمت ہے۔ میں نے جواب دیا نفس خواہشات کا گھر ہے۔ ہر خواہش بری ہو یا اچھی نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً تمہارے سامنے دو چار گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت پھول کھلا ہوا ہے۔ تمہارے دل میں اس کو توڑ کر پاس رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، تم وہاں تک چل کر گئے اور پھول توڑ کر لے آئے۔ تم نے کبھی سوچا کہ تمہارے دل میں خواہش پیدا ہونے سے پھول توڑ کر واپس آنے تک کیا عمل ہوا۔ حرکت پیدا ہوئی۔ تم گئے، پھول توڑا واپس آئے۔ تمہاری خواہش کی تکمیل ہو گئی۔ اسی طرح ہر خواہش کو پورا کرنے کے لیے حرکت کا ہونا ضروری ہے اور حرکت ہی زندگی کا ثبوت بلکہ عین زندگی ہے۔ اس لیے اگر نفس نہ ہوتا تو خواہش نہ ہوتی۔ خواہش نہ ہوتی تو حرکت نہ ہوتی۔ حرکت نہ ہوتی تو دنیا میں کوئی چہل پہل، رونق اور زندگی کے آثار نہ ہوتے۔ اس لیے غور کیا جائے تو نفس اور خواہش مترادف الفاظ ہیں۔ یہ کلام ربانی کی انتہائی بلاغت ہے کہ یہ سارا قصہ بیان کرنے کے لیے قلب کے بجائے صرف نفس کا لفظ لکھ دیا۔ اس طرح مطلب یہ نکلا کہ <u>جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرو تو تمہارے دل میں اس کے دیدار کی خواہش بھی ہونی ضروری ہے۔ یعنی جب تم اللہ کہو تو ساتھ ہی دل میں یہ بھی خواہش ہو کہ "مجھے اپنی لقاء سے مشرف فرما۔ مجھے نظر آ جا اپنا جمال جہاں آراء دکھا دے۔</u>" تو اے میرے بھائیو اور بیٹو تم اس خواہش اور تڑپ کے ساتھ پاس انفاس کرو۔ تو صرف پانچ منٹ کا ذکر چوبیس گھنٹے کے ذکر سے کہیں افضل ہوگا۔ اور جو کام برسوں

میں ہوتا ہے ان شاءاللہ چند ماہ میں ہو جائے گا۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ دن یا رات میں دس یا پندرہ منٹ ایسے مقرر کر لو جب کوئی تمہارے ذکر میں خلل انداز نہ ہو۔اب دس منٹ برابر اسی طرح یہ ذکر کرو۔ختم ہونے پر نبی کریم b کی روح پاک پر درود بھیجو۔پھر غور کرو کہ ذکر سے پہلے تمہاری کیا کیفیت تھی اور اب کیا ہے۔مجھ ناچیز کے لیے بھی دعا کریں کہ اللہ انجام بخیر کرے۔

قیام تعظیمی:

اس ضمن میں دو باتیں اس وقت اور یاد آ گئیں چونکہ وہ بھی ہمارے توحیدی مسلک سے خاص تعلق رکھتی ہیں۔اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لکھ دوں' پھر خدا جانے موقع ملے یا نہ ملے۔ پہلی بات قیام تعظیمی کی بابت ہے۔اور دوسری دعا بالواسطہ کی۔یہ دو سوال مجھ سے اکثر پوچھے جاتے ہیں۔قیام تعظیمی کی بابت مجھ سے کہا جاتا ہے کہ جب یہ حضور نبی کریم ﷺ کی متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ جائز ہے تو آپ اپنے مریدوں اور دوسرے ملاقاتیوں کو کیوں منع کرتے ہیں۔جواب یہ ہے کہ قیام تعظیمی کو میں ناجائز ہرگز نہیں سمجھتا مگر اپنے لیے اس کو اس زمانہ مردہ پرستی کی حالت کو دیکھتے ہوئے پسند نہیں کرتا۔حضور ﷺ کی ایک حدیث یہ ہے کہ "ایک مرتبہ طویل عرصہ کی علالت کے بعد جب حضور ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو صحابہ کرامؓ سب تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے' اس پر حضور ﷺ نے فرمایا جب میں آیا کروں تو تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو یہ قیصر و کسریٰ کے درباروں کا دستور ہے۔"

اس حدیث کی روشنی میں اگر کوئی شخص اس (قیام تعظیمی) کو پسند نہ کرے تو کوئی حرج نہیں اور میرے ناپسند کرنے کی تو خاص اور بڑی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ پیر صاحب یا مولانا صاحب گھر میں تشریف فرما ہیں اور باہر آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔جب کافی آدمی جمع ہو جاتے ہیں تو حضرت صاحب باہر تشریف لاتے ہیں اور سب تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔میری دلیل یہ ہے کہ نفسیاتی طور پر ناممکن ہے کہ حضرت صاحب کے دل و دماغ میں دوسروں پر اپنی فضیلت کا یقین پیدا نہ ہو اور جب یہی حرکت مدت تک باربار دہرائی جائے تو یہ یقین فضیلت غرور و تکبر میں تبدیل نہ ہو جائے اور یہی بات ایک سالک کے لیے راہ خدا میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔دوسری

وجہ یہ ہے کہ ان آنے والوں کے ساتھ بچے بھی ہوتے ہیں اور بچوں میں سمجھ بالکل نہیں ہوتی۔ وہ تو جیسا دوسروں کو کرتے دیکھتے ہیں بغیر وجہ اور سبب دریافت کیے کرتے رہتے ہیں۔(یہی وجہ ہے کہ ان کی نمازیں بھی رسمی ہوتی ہیں) جوں جوں بڑے ہوتے ہیں یہ عادت بھی راسخ ہوتی جاتی ہے اور آخر کار وہ ان پیروں اور مولویوں کو عام آدمیوں سے افضل سمجھنے لگتے ہیں اور مصیبت اور ضرورت کے وقت خدا سے مانگنے اور خدا کے آگے جھکنے کی بجائے انہی حضرات کے پاس اپنی حاجت روائی کے لیے جاتے ہیں۔یہی چیز شخصیت پرستی ہے جو بالآخر انسان کو خدا سے بالکل بے نیاز کر کے بندوں کا بندہ بنا دیتی ہے اور جب یہ حضرات مر جاتے ہیں تو ان کے معتقدین ان کی قبروں سے اپنی مرادیں اور منتیں مانگتے ہیں یہ بہت بڑا شرک ہے۔اسی سے ہندوؤں میں بت پرستی اور مسلمانوں میں قبر پرستی پیدا ہوئی ہے۔ہندوؤں میں رام چندر مہادیو، کرشن چندر وغیرہ کے بت پجتے ہیں۔اس کی وجہ یہی ہے۔مسلمانوں میں جو اَرْبَــابًــا مِّـنْ دُوْنِ اللهِ ہیں ان کو آپ جانتے ہی ہیں۔کس کس کا نام لوں؟

دعا بالواسطہ:

دوسری بات دعا بالواسطہ ہے۔یعنی اس طرح دعا مانگنا ''اے اللہ تجھے اپنے پیارے نبی حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبت کا واسطہ میری یہ دعا قبول فرما'' جتنے سلسلوں کے شجرے ہیں سب میں اس سلسلے کے بزرگوں کے واسطے سے دعا مانگی گئی ہے۔خود ہمارے شجرہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔تو لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس طرح کسی بزرگ کا واسطے دے کر دعا مانگنا جائز ہے۔تو میرا جواب یہ ہے کہ بالکل اور قطعی جائز ہے۔مگر قرآن پاک یا احادیث میں یہ حکم تو کہیں نہیں ہے کہ بلا واسطے کے خود خدا سے براہ راست دعا مت مانگو۔اور جب تم کو یہ معلوم ہے کہ اللہ کا اپنی مخلوق کے ہر جاندار سے ایک ایسا ڈائریکٹ تعلق ہے جو کسی دوسرے فرد سے نہیں تو پھر تم کو ڈائریکٹ خدا سے دعا مانگنے میں کون سی چیز مانع ہے۔دیکھو دعا کا وقت ایسا وقت ہے جب تم ہوتے ہو اور خدا۔کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔اس وقت تم خدا کو اپنے سامنے حاضر و ناظر جان کر تضرع اور زاری سے اپنی مرادیں اس سے بیان کرتے ہو۔اس وقت اگر تم کو یقین کامل ہے کہ خدا موجود

ہے اور تمہاری سن رہا ہے تو تم کو اس قدر لطف اور کیف آئے گا جو کسی اور طرح ہرگز نہیں آ سکتا اور تمہارا دل چاہے گا کہ ساری عمر اسی طرح دعا میں گزر جائے۔ لیکن اگر تم کسی دوسری ہستی کا واسطہ دے کر اس کو بھی دعا میں شریک کر لو تو اس ہستی کا خیال بھی بوقت دعا تم کو آئے گا اور یقیناً آئے گا۔ یعنی اب تمہارے اور خدا کے بیچ میں ایک ہستی بھی حائل ہو جائے گی اور اب وہ لطف ہرگز ہرگز نہ آئے گا۔ پہلے تم اس شعر کے مصداق تھے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن اب وہ دوسرا شریک ہو گیا۔ لہٰذا پہلا مصرعہ بالکل باطل ہو گیا اور شجروں میں تو تم بیسیوں بزرگوں کا واسطہ دیتے ہو یعنی اب تمہارے اور خدا کے درمیان بیسیوں ہستیاں حائل ہو جاتی ہیں۔ ذرا کسی دن غور کر کے دیکھو کہ شجرہ کا کوئی شعر پڑھتے وقت تمہارے دل میں اس بزرگ کا خیال ہے جس کا واسطہ دے رہے ہو یا خدا کا۔ خدا تو اس وقت اربوں میل دور ہوتا ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے بالواسطہ دعا مانگو یا بلاواسطہ۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

مسمریزم، ہپناٹزم اور یوگ:

خطبہ لکھتے وقت جو جو باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ وہ میں نے سب لکھ دی ہیں۔ لیکن اسی وقت یکا یک ایک اور بات یاد آئی جس کا تعلق اگرچہ ہمارے سلسلہ اور ہماری تعلیم سے ڈائریکٹ نہیں ہے۔ بلکہ عام مسلمانوں سے ہے اور عام مسلمان خصوصاً انگریزی تعلیم یافتہ فیشن کے شوقین اور مذہب سے بے بہرہ کالجوں وغیرہ کے نوجوان اس بات سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور اسلام سے اور زیادہ منحرف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہے مسمریزم یا ہپناٹزم اور ہندو کا یوگ۔ اس لیے میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ ان چیزوں کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں ان کی حقیقت واضح کر دوں اور اپنے تصوف میں روحانی واردات و کرامات میں سے کچھ تھوڑا سا مقابلہ کر کے دکھاؤں کہ جس چیز کو تم چمکتا دمکتا سونا سمجھ رہے ہو وہ صرف ملمع ہے جو اصل سونا ہے وہ خود تمہارے پاس موجود ہے۔ زمانہ کی مسموم فضا اور ماحول نے تم کو اس کی طرف سے غافل کر رکھا ہے۔

مسمریزم اور ہپناٹزم کیا ہے؟ یہ خیال کی طاقت ہے جو قوت ارادی کے ماتحت کام کرتی ہے۔ اس عمل کا کرنے والا عامل اور جس پر عمل کیا جائے اس کو معمول کہتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعہ معمول کی متعدد بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے اور اس کو حکم دے کر مختلف قسم کے کام کرائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے عامل اپنے معمول کی قوت ارادی کو سلب کر لیتا ہے اور اس پر ایک قسم کی غفلت یا نیند طاری کر دیتا ہے۔ جس کو نوم مقناطیسی کہتے ہیں۔ اب معمول کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ وہ مطلق کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے بعد عامل معمول سے کچھ سوال کرتا ہے جس کے جواب بالکل صحیح ملتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک روپیہ مٹھی میں دبا کر پوچھتا ہے کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو معمول جواب دیتا ہے کہ روپیہ ہے اب اگر پوچھا جائے کہ روپیہ کون سے سن عیسوی کا ہے، وہ سن تک بتا دیتا ہے۔ ایسی ہی بہت سی باتیں پوچھی جاتی ہیں۔

میرے بچپن کے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک عامل صاحب نے ایک صاحب سے جو اس کے پاس ہی مجمع میں کھڑے تھے اس کا نام پوچھا تو انہوں نے عبدالرحمٰن بتایا۔ اب عامل نے معمول سے دریافت کیا ان صاحب کا نام کیا ہے؟ تو معمول نے جواب دیا ''عبدالرحمٰن''۔ اس وقت میری سمجھ میں ایک بات آئی اور میں نے عامل سے کہا۔ بھلا اس سے میرا نام پوچھیں۔ تو عامل نے کہا آپ اپنا مجھے نام بتائیں۔ میں نے غلط نام بتا دیا کہ میرا نام کریم بخش ہے۔ حالانکہ میرا نام عبدالحکیم ہے۔ عامل نے میرا بازو پکڑ کر معمول سے پوچھا۔ ان کا نام کیا ہے؟ معمول نے فوراً جواب دیا کریم بخش۔ اس سے میرا شبہ پختہ ہو گیا اور میں نے مٹھی میں ایک چونی دبا کر عامل سے کہا: اس سے پوچھو میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ عامل نے کہا مجھے دکھایئے۔ میں نے کہا تم کو نہیں دکھاؤں گا۔ عامل نے کہا کہ پھر تو وہ بھی نہیں بتا سکے گا۔ اس پر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ انتقال خیال کے کرشمے ہیں۔ عامل اپنے ذہن سے اپنے خیال کو منتقل کر کے معمول کے ذہن میں ڈال دیتا ہے۔ اس سے وہ صحیح جواب دے سکتا ہے ورنہ نہیں۔ یہ سب باتیں محض شعبدہ بازی کہی جا سکتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔ لیکن مسمریزم اور ہپناٹزم کے ذریعے بہت سے مفید کام بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسی مجرم پر نوم مقناطیسی طاری کر کے اس سے اس کے جرم کا پورا

واقعہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ یا امراض کا علاج کیا جاتا ہے جو واقعی ایک مفید اور کام کی بات ہے۔ آج کل یورپ میں یہ طریقہ علاج بہت مقبولیت حاصل کر رہا ہے وہ اس کو روحانی علاج کہتے ہیں۔ اور اس میں چونکہ کوئی مادی وسائل اور ذرائع نظر نہیں آتے اس لیے بجا طور پر اس کو روحانی علاج بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ طریقہ علاج ویانا کے ایک صوفی طبیب میسمر نامی نے اٹھارویں صدی میں ایجاد کیا تھا۔ اسی کے نام پر یہ فن مسمریزم کہلایا اور ایک دو صدی بعد ہپناٹزم مشہور ہو گیا۔ میسمر نے جب یہ طریقہ علاج شروع کیا اور لوگوں کو فائدہ ہوا تو دنیا حیران ہو گئی۔ اور اتنے مریض آنے لگے کہ ڈاکٹر خالی بیٹھے مکھیاں مارنے لگے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ کیوں کہ بغیر کسی دوا کے صرف نظر سے دیکھنے اور ہاتھ پھیرنے سے مرض کو آرام کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حکومت نے حکم دیا کہ وہ آسٹریا سے نکل جائے۔ وہ بے چارا اب فرانس چلا گیا۔ یہاں بھی جب بہت لوگ آنے لگے تو یہی مشہور ہو گیا کہ یہ جادوگر ہے۔ فرانس کی حکومت نے سائنس دانوں کا ایک بورڈ مقرر کیا کہ اس کے طریقہ علاج کی تحقیق کریں کہ اصلیت کیا ہے؟

میسمر کا دعویٰ تھا کہ مریض کو شفا اس کی اپنی قوت ارادی سے ہوتی ہے جو مریضوں کی قوت ارادی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن سائنس دانوں کے بورڈ نے فیصلہ کیا کہ میسمر غلط کہتا ہے۔ مریضوں پر کوئی بیرونی طاقت اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ یہ مریضوں کو شفا کا یقین دلا کر ان کی قوت ارادی کو اتنا طاقت ور کر دیتا ہے کہ خود مریضوں کے اپنے یقین کی طاقت سے مرض جاتا رہتا ہے۔ اس پر میسمر اتنا دل برداشتہ ہوا کہ وہ اٹلی کے ایک گاؤں میں جا کر مقیم ہو گیا اور وہیں گمنامی کی حالت میں مر گیا۔

یہاں پر دو باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ ایک میسمر کی بابت بہت کچھ تحقیق کی گئی اور بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن کسی کتاب میں یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی یہ کسی نے نہیں لکھا کہ میسمر نے یہ طاقت کہاں سے حاصل کی۔ اس کی بابت میں نے اب سے کوئی ساٹھ سال پہلے قاہرہ کے ایک عربی رسالہ کے ترجمہ میں پڑھا تھا کہ اس زمانہ میں ویانا میں ایک مسلمان بزرگ ولی اللہ

رہتے تھے جن کا نام محمد علی تھا۔ وہ وہاں تبلیغ کا کام کرتے تھے اور جو لوگ مسلمان ہو جاتے تھے اُن کو مرید کر کے سلوک طے کراتے تھے۔ میسمر بھی مسلمان ہو کر ان کا مرید ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی اس نے توجہ لینا اور توجہ دینا ہی سیکھا تھا کہ مرشد کا انتقال ہو گیا۔ اب آگے اس کو کوئی راستہ بتانے والا نہ تھا۔ لہٰذا اس نے صرف توجہ دینے کی مشق شروع کی اور یہاں تک کمال بہم پہنچایا کہ اپنی قوت ارادی سے دوسروں کا علاج کر کے امراض دور کر دیتا تھا۔ یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی ہمارے سلسلوں خصوصاً نقشبندیہ سلسلہ میں سلب مرض کا طریقہ محض توجہ کے ذریعہ عرصہ دراز سے چلا آتا ہے۔ میں نے خود شروع شروع میں بہت سے لوگوں کا علاج اس طرح کیا ہے اب اصلاح کا کام چونکہ زیادہ ضروری ہے۔ اور بہت وقت چاہتا ہے۔ لہٰذا توجہ سے علاج کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر کسی نے حسن نظامی کی کتابیں خصوصاً رسالہ المنادی کی پرانی جلدوں میں سے کچھ پڑھی ہیں تو جانتا ہوگا کہ حسن نظامی بھی سلب مرض کا صوفیانہ طریقہ سے علاج کیا کرتے تھے۔ میں نے اوپر میسمر کی بابت جو واقعہ بیان کیا ہے خدا جانے کہاں تک سچ ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ انسائیکلو پیڈیا وغیرہ اور دوسری کتابوں میں اس کو صوفی فزیشن کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ مسلمان ہو گیا تھا تو کوئی یورپین رائٹر یہ سچی بات جو عیسائیت کے خلاف جاتی ہے کیوں لکھنے لگا تھا۔ دوسری بات جو میں بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرانس کے سائنس دانوں نے جو فیصلہ کیا تھا کہ مریض پر باہر سے کوئی طاقت اثر نہیں کرتی بلکہ مریض خود اپنے یقین اور قوت ارادی سے شفایاب ہوتا ہے بالکل غلط ہے۔ ہمارے حلقہ کا ہر فرد جانتا ہے کہ توجہ کی قوت توجہ دینے والے کے قلب سے آتی ہے اور یہاں تک اثر کر سکتی ہے کہ توجہ لینے والا سو جائے۔ مجذوب ہو جائے۔ یا مر جائے۔

ہمارے حلقہ کے ایک آدمی نے ایک کچی دیوار پر توجہ دی اور دیوار کا خاصہ بڑا حصہ ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔ کیا یہ طاقت دیوار کے اندر سے پیدا ہوئی تھی؟

اب میں ہندوؤں کے یوگ کے متعلق دو چار باتیں بیان کر کے خطبہ کو ختم کرتا ہوں۔ اور آپ سے امید رکھتا ہوں کہ پیچھے قوت برداشت، تسلیم و رضا اور ذکر کے متعلق جو کچھ میں نے بتایا ہے اس پر عمل کر کے فائدہ اٹھائیں۔ صرف پڑھ کر تعریف کر دینے سے کچھ نہیں بنتا۔

آج کل یوگ کی بڑی دھوم ہے۔ خاص کر امریکہ میں ہزاروں آدمی یوگ کے کرتب دیکھ کر ہندو ہو گئے ہیں۔ سنا ہے کہ یہاں لاہور میں بھی امریکن ہائی اسکول میں یوگ سکھانے کے لیے ایک کلاس کھول دی گئی ہے۔ ہمارے سر پھرے ہپیوں کے مقلد نوجوانوں سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سر منڈا کر یوگی بننے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان کو اپنے گھر کا تو کچھ پتہ نہیں دوسروں کی ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں۔ پچھلے سال کے خطبہ میں میں نے یوگ سے متعلق دو خاص واقعات لکھے تھے کہ یوگی جس کمرے میں تماشا دکھا رہا تھا اس میں بہت سے دروازے تھے یوگی سنٹر میں کھڑا تھا کہ ہر دروازے پر ہو بہو اس کی شکل کا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا پھر ان میں سے ہر ایک آدمی آہستہ آہستہ یوگی کی طرف بڑھا اور اس کے جسم میں گھس کر غائب ہو گیا۔ دوسری بات یہ بتائی تھی کہ جب حضرت نظام الدین اولیا کی باؤلی کھودی جا رہی تھی تو کافی نیچے جا کر ایک سمادھی نکلی جس میں ایک یوگی آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اسے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ کوئی پانچ سو برس سے وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت محبوب الٰہی نے جب اس سے پوچھا کہ اس عرصہ میں تو نے کیا دیکھا اور کیا سیکھا؟ تو وہ کہنے لگا کہ کچھ بھی نہیں میں تو سو رہا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر تو وہ سارا وقت برباد گیا۔ ایسی مشقوں سے کیا فائدہ۔ اس کے علاوہ یوگی اور بھی بہت سی عجیب باتیں دکھا سکتے ہیں۔ مثلاً ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا، بھاری بھاری مادی اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینا وغیرہ۔ یہ واقعی عجائبات اور بڑی روحانی طاقت کے کرشمے ہیں لیکن اگر افادیت کی نظر سے دیکھا جائے تو ان کو سوائے تماشے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کشف سے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص پر فلاں دن یہ مصیبت آنے والی ہے یا اس کی موت واقع ہونی ہے تو اس سے سوائے قبل از وقت پریشانی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ بات تو جب تھی کہ اس مصیبت یا موت کو ٹال دیا جائے تو ظاہر ہے کہ قرآن کی روشنی میں تو یہ کوئی کر نہیں سکتا۔

مُردے کا زندہ کرنا:

مسمریزم، ہپناٹزم اور یوگ کی جو کرامتیں بیان کی گئی ہیں وہ اسلامی تصوف میں بھی موجود ہیں اور دوسروں سے کہیں زیادہ افضل و اعلیٰ اور سہل الحصول ہیں۔ مثلاً ایک ہپناٹسٹ اپنے معمول کو

سامنے بٹھا کر ہی اس کا علاج کر سکتا ہے۔لیکن اسلامی تصوف میں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے بھی ایک صوفی کسی مریض کا علاج صرف خیال کی قوت سے کرتا ہےاور اس کے دماغ میں جو کچھ خیالات ہیں ان کو یکسر بدل کر اس کی اصلاح کر سکتا ہے۔یورپ کو ٹیلی پیتھی پر ناز ہے۔مگر ایک مسلم صوفی اپنے ایک مرید کو یہاں سے آواز سے پکار کر کوئی حکم دیتا ہےاور وہ مرید سینکڑوں میل دور آواز سنتا اور حکم بجالاتا ہے بشرطیکہ اس مرید کے قلب میں Receiption یعنی وصول کرنے کی طاقت پیدا ہو چکی ہو۔کیا کسی ہپناٹسٹ اور یوگی نے آج تک کوئی مردہ زندہ کیا۔مسلم بزرگوں کے تذکرے پڑھو۔بہت سے ایسے واقعات ملیں گے۔آج بھی کبھی کبھی کوئی اللہ والا مردے کو زندہ کر دیتا ہے۔اگر چہ یہ شاذ ہی ہوتا ہے مگر ہوتا تو ہے۔بات اصل میں یہ ہے کہ مسلم صوفی ایسی باتوں کا اشتہار نہیں ہونے دیتے چھپا کر رکھتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ ان کی منزل مقصود خدا اور ان کا مقصد ذات بحت کا مشاہدہ ہے وہ کرامات وغیرہ کے چکر میں پھنس جائیں تو منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

مجھے ایک نہایت ہی ثقہ بزرگ نے' جن کی بابت ایک فرد واحد بھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں' یہ واقعہ سنایا کہ ایک اللہ والے نے ان کی لڑکی کو جسے مرے ہوئے دو تین سال ہو چکے تھے۔قبر سے زندہ نکال کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ اسے گھر لے جاؤ ماں بہن سے ملاؤ اور اگر یہ رہنا چاہے تو مستقل طور پر رکھ لو۔چنانچہ وہ اس کو گھر لے گئے سب سے ملایا۔مگر وہ رہنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئی اور کہا کہ یہ بہت گندہ گھر ہےاور گندی جگہ ہے میں یہاں نہیں رہوں گی۔چنانچہ اسے قبرستان لے جا کر قبر میں واپس بھیج دیا گیا۔یہ پاکستان بننے کے کوئی سات یا آٹھ برس کے بعد کا واقعہ ہے۔

الغرض روحانی طاقت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔مگر سب سے عظیم کام جو اس طاقت سے لیا جا سکتا ہے۔وہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے اور ایک بدکردار انسان کی اصلاح ہے کہ ایک شرابی' زانی' چور' ڈاکو اور غنڈے کے سب عیب چھڑا کر اس کو پکا مومن اور مسلمان اور ایک اچھا شہری بنا دیا جائے۔

الحمدللہ! خطبہ ختم ہوا۔ اب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر سچا اور پکا مومن بنا کر ان کو دنیا میں اپنی خلافت کا اہل بنائے۔ کفار اور اغیار کے نرغے سے نکالے اور ہر قسم کی ترقی عطا فرمائے۔ ہم کو قرآن پڑھنے ۳‘ اس کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمارے حلقہ والوں کو پورے ذوق وشوق اور جوش وخروش سے حلقہ کی تعلیم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اسلام کی سربلندی کے لیے اپنے سر کٹانے‘ اپنا مال و دولت لٹانے اور اپنے اہل وعیال تک کو قربان کر دینے کا سچا جذبہ عطا فرمائے۔ آمین

خادم الخدام

عبدالحکیم انصاری توحیدی

ملتان، 5 اپریل 1975ء

"مسلمانو! یاد رکھو کہ تمہاری انفرادی اور قومی تباہی کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ تم نے قرآن کے خلاف عقیدے گھڑ لیے ہیں اور ان پر قائم ہو کر قرآن اور اللہ کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ آج تم قرآن اور اللہ کی طرف لوٹ آو، کل تم کو وہی عزت پھر حاصل ہو جائے گی جو قرونِ اولیٰ میں تھی۔"

(اقتباس از تعمیر ملّت)
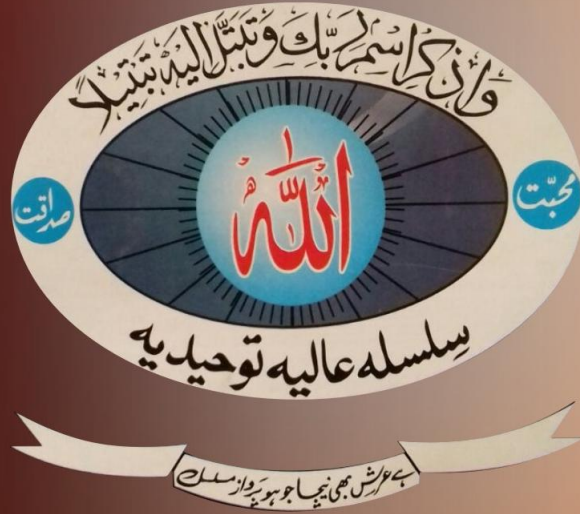
سلسلہ عالیہ توحیدیہ مرکز تعمیر ملت، وحید کالونی کوٹ شاہاں، گوجرانوالہ
Www.tauheediyah.com